إن الله وملائكته يصلون على النبي يا أيها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليما

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حصہ اول - ۱

مجلد دوم - از ۹ھ تا ۱۱ھ جس میں اقامت امن، تاسیس خلافت، اشاعت اسلام انتظامات مذہبی، تکمیل شریعت، حجۃ الوداع، وفات، شمائل واخلاق وعادات کی تفصیل اور ازواج واولاد کا مختصر تذکرہ ہے

تالیف

حجۃ الملۃ والدین شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
المتوفی ۲۸ ذیحجہ ۱۳۳۲ھ ہجری

مع اضافہ تکملہ

از
سید سلیمان ندوی

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف شہر اعظم گڈھ میں چھپی

بقلم اشتیاق حسن مارہروی
اور دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی
۱۳۳۲ھ
۱۹۱۴
مطبع اعجاز رقم لکھنوی

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حصۂ اول

مجلد دوم از ۹ھ تا ۱۱ھ جس میں اقامتِ امن، تاسیس خلافت، اشاعت اسلام، استقامت مذہبی، تکمیل شریعت، حجۃ الوداع، وفات، شمائل و اخلاق و عادات کی تفصیل اور ازواج و اولاد کا مختصر تذکرہ ہے

تالیف

حجۃ الملۃ والدین شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

المتوفی ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ ہجری

مع اضافہ و تکملہ

از

سید سلیمان ندوی

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف شہر اعظم گڈھ میں چھپی

اور دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی

۱۳۳–ھ
۱۹۲–ء

بقلم اسحاق حسن

تلمذ اعجاز رقم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ سیرۃ نبوی مجلد دوم

سیرۃ نبوی مجلد اول ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) کے اواسط میں شائع ہوئی تھی، اب مجلد دوم ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کے اواسط میں شائع ہوتی ہے شائقین کا تقاضا ہے کہ جلد سے جلد اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں، لیکن شاید اُن مشکلات کا اُن کو علم نہیں جو عالمگیر جنگ نے زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کردی ہیں، گو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ **جنگ** کا عملاً خاتمہ ہوگیا، لیکن با ایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ **صلح** کا آغاز نہیں ہوا، اور اس خاتمۂ جنگ سے زندگی کے مشکلات میں ایک ذرہ کمی نہیں ہوئی، جلد اول کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد یہ طے کرلیا گیا تھا کہ دوسری جلد خود مطبع **معارف** میں چھپے گی لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس مشین نہ تھی، بڑی تلاش و جستجو سے مشین ہاتھ آئی، تو کاغذ کا قحط نظر آیا جلد اول میں جس اصناف کے کاغذ لگ چکے تھے، اُن کا ملنا دشوار ہوگیا، دیسی کاغذ کے ۲ ریم بھی یک وقت نہ مل سکے، یہ دقت کسی طرح ختم ہوئی تو لوح (ٹائٹل پیج) کے کاغذ کی مشکل پڑی، لکھنؤ سے لیکر کلکتہ اور بمبئی تک کے کارخانے چھان مارے گئے مگر خاطر خواہ کاغذ دستیاب نہ ہوا، آخر جو بھی مل سکا اور جسطرح بھی بنا یہ جلد اختتام کو پہنچی، والحمد للہ علی ذلک۔

پہلی جلد نبوت کے پر آشوب عہد **غزوات** پر مشتمل تھی، اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے، نبوت کی بست و سہ ۲۳ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس ۲۰ سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی، اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے، اور اس کے بعد اخلاق و شمائل شریفہ اور ازواج مطہرات و اولاد کرام کا تذکرہ ہے

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام قلمی سرمایہ میرے ہاتھ آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی، جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی

تھی، آخر کار مدت کے حیص بیص کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اس کو لکھنا ہی چاہیے، چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مولانا کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی، جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک صحیفہ میں لکھی تھی، اُس کا عنوان "یادداشت اخیر" تھا، اُس یادداشت کو پڑھ کر میری مسرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا مصنف مرحوم نے بھی اسی آخری یادداشت میں انکا اضافہ ضروری قرار دیا تھا، اور گویا وہ ایک وصیت نامہ تھا، جس کو ورثۂ غیب نے اُن کے دست وقلم سے میری تسلی کے لیے پہلے ہی لکھوا دیا تھا

حلِّ این عقدہ ہم از روے نگار آخر شد

اخلاق کے باب کو مصنف مرحوم نے تکمیل کو نہیں پہنچایا تھا بہت سے عنوانات سادہ تھے بہت سے عنوانات کو شروع کر کے آیندہ اضافہ کے لیے ناتمام بصورتِ بیاض چھوڑ دیا تھا، جامع نے اس کو لکھکر بطور تکملہ کتاب میں شامل کر دیا بہت سے ضروری حواشی بھی جا بجا بڑھائے گئے ہیں جا بجا جیسا کہ جلد اول کے دیباچہ میں ذکر کر دیا گیا ہے اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں، تاکہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مختلط ہونے پائیں

جامع

سید سلیمان ندوی

فہرست مضامین سیرۃ النبی حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام کی امن کی زندگی

سنہ ۹ھ، ۱۰ھ و ۱۱ھ

قیام امن، اشاعتِ اسلام، تاسیس خلافت، اور تکمیل شریعت

قیام امن

گذشتہ ابواب[1] کے پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ اس وقت تک گو فطری صلاحیت و استعداد کے رُو سے عرب کا ذرّہ ذرّہ ستارہ تھا لیکن وہ کسی ایک نظام شمسی کے تابع نہ تھا، تمام جزیرۂ عرب، ایک واحد ملک، اور ایک متحد قوم تھا، تاہم نہ تو کبھی تاریخ نے اس کے ملکی و قومی اتحاد کا نشان دیا، اور نہ سیاسی حیثیت سے کسی زمانہ میں تمام عرب ایک پرچم کے نیچے جمع ہوا، جس طرح گھر گھر کا الگ الگ خدا تھا، اُسی طرح قبیلہ قبیلہ کے جدا رئیس تھے، جنوبی عرب میں حمیری اَذواء، اور اَقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، شمالی عرب میں، بکر تغلب، شیبان، ازد، قضاعہ کندہ، لخم، جذام، بنو حنیفہ، طے، اسد، ہوازن، غطفان، اوس، خزرج، ثقیف، اور قریش وغیرہ کی الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو دن رات باہمی خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھیں، بکر و تغلب کی چہل سالہ جنگ کا ابھی خاتمہ ہوا تھا، کندہ اور حضر موت کے قبائل کٹ کٹ کر فنا ہو چکے تھے، اوس، و خزرج لڑ لڑ کر اپنے ایک ایک سردار کو کھو چکے تھے خاص حرم، اور اشہرِ حرم میں بنو قیس اور قریش کے درمیان حربِ فجار کا سلسلہ جاری تھا، اور اس طرح تمام ملک

[1] دیکھو ابواب اضافہ، از صفحہ ۱ تا صفحہ ۸

معرکۂ کارزار سا ہوا تھا،

پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار جرائم پیشہ قبائل آباد تھے، تمام ملک قتل، غارتگری، سفاکی، خونریزی کے خطرات میں گھرا تھا، تمام قبائل غیر مختتم سلسلہ جنگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، انتقام، ثار، اور خون بہا کی پیاس سیکڑوں اور ہزاروں اشخاص کے قتل کے بعد بھی نہیں بجھتی تھی، ملک کا ذریعہ معاش غارتگری کے بعد فقط تجارت تھی لیکن تجارت کے قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک گذرنا محال تھا، حیرۃ کے عرب بادشاہ اگرچہ شمالی عربستان میں کافی اثر اور اقتدار رکھتے تھے، تاہم ان کا تجارتی سامان بھی عکاظ کے بازاروں میں آسانی نہیں پہنچ سکتا تھا، شہور حج عملاً عرب کے مقدس مہینے تھے، بایں ہمہ لڑائیوں کے جواز کے لیے وہ کبھی بڑھا اور کبھی گھٹا دیئے جاتے تھے

ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے۔

وذلك لانہم كانوا يكرہون ان يتوالى	یہ اس لیے کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تین مہینے متصل
عليہم ثلاثة اشہر لا تمكنہم الاغارة فيہا	ان پر غارت گری کے بغیر گذر جائیں، کیونکہ غارت گری ہی
لان معاشہم كان من الاغارة (صفحہ ۱، ج ۱)	ان کا ذریعہ معاش تھا،

بہت سے جرائم پیشہ قبائل کے ذریعہ معاش کے لیے یہی موسم، موسمِ بہار تھا، مکہ کے آس پاس اسلم وغفار وغیرہ قبائل آباد تھے، جو حاجیوں کا اسباب چرانے میں بدنام تھے[1]، طے نہایت ممتاز اور نامور قبیلہ تھا، لیکن وہ دان طے بھی اپنی شہرت میں اُسے کم نہ تھے[2]، سلیک ابن السلکہ اور تابط شرا، عرب کے مشہور شعرا تھے، لیکن اُنکی شاعری کا تمامتر سرمایہ صرف اپنی چوری اور حیلہ گری کے پُرفخر کارنامے تھے،

ملک میں اضطراب اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ عبد القیس جو بحرین کا ایک طاقتور قبیلہ تھا، ۵ھ تک مضری قبائل کے ڈر سے اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں سفر نہیں کرسکتا تھا[3]، فتح مکہ کے بعد بھی جب ملک میں سکون شروع ہوچکا تھا، مدینہ سے مکہ تک سفر خطرناک تھا، اور اب بھی لوگ ڈاکے ڈالتے رہتے تھے[4]، ہجرت کے پانچ چھ برس کے بعد تک بھی شام کے تجارتی قافلے دن دہاڑے

(۱ صحیح بخاری ذکر اسلم وغفار ۲ صحیح بخاری باب علامات النبوۃ، ۳ صحیح بخاری کتاب الایمان ۴ ابوداؤد، کتاب الادب، باب الحذر)

لوٹ لیے جاتے تھے[1]، یہاں تک کہ کبھی کبھی خود دارالاسلام کے چراگاہوں میں بھی چھاپے مارے جاتے تھے[2]، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) جب لوگوں کو ملک کے اس و امان کی بشارت دیتے تھے کہ ایک زمانہ آئے گا جب صنعاء سے ایک خاتون محمل نشیں تنہا سفر کریگی، اور خدا کے سوا کسی کا اُس کو خوف نہ ہوگا[3]، تو لوگوں کو تعجب آتا تھا، ۹ھ میں ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرا مال ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، آپ نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب مکہ کو قافلے بے نگہبان کے جایا کرے گا[4]، اتنے بڑے ملک میں صرف حرم کی سرزمین ایسی تھی جہاں لوگوں کو اطمینان میسر آسکتا تھا، خدا نے قرآن مجید میں اہل مکہ پر اپنا سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِّن — اُن کو چاہیے کہ اس گھر کے اُس مالک کو پوجیں جس نے

جُوعٍ وَّآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (ایلاف) — اُنکو بھوک میں کھانا دیا، اور بدامنی کو دور کرکے اُنکو امن بخشا"

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ — کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہمنے ایک امن والا حرم اُنکے لیے بنایا، اُسکے

مِنْ حَوْلِهِمْ (عنکبوت) — باہر بدامنی کا یہ عالم ہے کہ اُسکے چاروں طرف سے آدمی اُچک لیے جاتے ہیں،

خود اسلام کا کیا حال تھا؟ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) عام الحزن کے بعد تین برس تک متصل تمام قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے رہے کہ مجھے اپنے امان میں لیکر صرف اتنا موقع دِلا دو کہ خدا کی آواز لوگوں تک پہنچا سکوں لیکن کوئی حامی نہیں بھرتا تھا، عام مسلمان عرب کی فضا میں سانس تک نہیں لے سکتے تھے، تلاش امن کے لیے افریقہ وحبش کے ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے، جو عرب میں رہ گئے تھے وہ ہدفِ مظالم گوناگوں تھے، قرآن مجید مسلمانوں کی اسی حالت کا ذکر ان آیتوں میں کرتا ہے،

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ — یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے اور کمزور تھے، ڈرتے تھے

تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ (انفال) — کہ لوگ تم کو اُچک نہ لیں،

اسی ملکی شورش اور بدامنی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں کوئی تحریک بھی بغیر خود حفاظتی وحی تدابیر کے کامیاب نہیں

---

[1] طبقات ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۶۳ و ۶۴ و ۶۵، [2] دیکھو غزوۂ سویق و غزوۂ غابہ، [3] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ، [4] بخاری صفحہ ۱۹

ہوسکتی تھی، سرورِعالم کا اصلی فرض اسلام کی دعوت تھی اور اُسکے لیے تیغ وخنجر اور فوج ولشکر کی حاجت نہ تھی لیکن ایک طرف تو دشمن حملہ پر حملہ کرتے چلے آتے تھے، اور دوسری طرف ہر جگہ دعاۃِ اسلام کی جانیں معرضِ خطر میں رہتی تھیں، تجارت کے قافلے جن پر اصل میں ملک کی معاش کا دار مدار تھا، غیر مامون تھے، چنانچہ اس قسم کی تفصیلی واقعات غزوات نبوی کے اسباب والواع میں گذر چکے ہیں،

سرونی خطرات

بہرحال یہ تو ملک کی اندرونی حالت تھی، بیرونی خطرات بھی کچھ کم نہ تھے، ملک کے تمام سرسبز وزرخیز صوبے روم وفارس دو عظیم الشان طاقتوں کے پنجہ میں تھے، تقریباً ساٹھ برس سے ایرانی، یمن، عمان، اور بحرین کے مالک بن بیٹھے تھے، اور اُنکے زیرِ اقتدار ایرانے نام عرب رؤسا حکمران تھے، حدودِ عراق میں **آل منذر** کی حکومت کو مٹا کر ایرانیوں نے اندرونِ ملک میں بھی پیش قدمی شروع کردی تھی، **حجاز** میں اسلام کی جو تحریک پھیل رہی تھی، اُس کو بھی وہ اپنے ہی حدود میں سمجھتے تھے، چنانچہ ۷ھ میں شاہ ایران نے یمن کے ایرانی گورنر کو فرمان بھیجا تھا کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعی نبوت بنا ہے، گرفتار کرکے میرے پاس بھیجدو،"

رومیوں نے حدودِ شام پر قبضہ کرلیا تھا، **آل غسّان** اور چھوٹے چھوٹے عرب رؤسا جنھوں نے مدت سے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا، اُنکی ماتحتی قبول کرلی تھی، ۸ھ کے بعد رومی ان عیسائی رؤسائے عرب کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی طیاریاں کررہے تھے، جسکا ظہور واقعۂ تبوک اور موتہ وغیرہ کی صورت میں ہوا

یہودیوں کی قوت

رومیوں نے دوسری صدی عیسوی میں یہودیوں سے تمام فلسطین کی برائے نام حکومت بھی چھین لی تھی، اور وہ مجبوراً حدودِ شام سے قلب حجاز تک پیچھے ہٹ آئے تھے، اور اپنے لیے مدینہ سے شام تک متصل قلعے تعمیر کرلیے تھے، یہ مقامات اُنکے جنگی استحکامات بھی تھے اور تجارتی گودام بھی، قریظہ، نضیر، قینقاع[۱]، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ اُنکی بڑی بڑی آبادیاں تھیں، قرآن مجید نے حسب ذیل آیات میں یہودیوں کے انھیں قلعوں کی طرف

---

[۱] معجم البلدان یاقوت میں ان مقامات کے حالات پڑھو، [۲] کتب مغازی وسیر میں ان کے حالات دیکھو، بخاری میں ابواب قتل کعب بن اشرف وابی رافع بن حقیق،

اشارہ کیا ہے،

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ (حشر)

وہ قلعہ بند آبادیوں یا دُھس کے پیچھے چھپے بغیر یوں مل کر مقابلہ نہیں کر سکتے،

وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ (احزاب)

خدا نے ان یہودیوں کو جنھوں نے ان کی مدد کی تھی اُنکے قلعوں سے اُتارا،

زمانۂ قدیم میں مالی کاروبار کی وسعت نے اسپین اور دیگر ممالک یورپ میں اُن کو جس طرح ملک کی پالیٹکس کا خطرناک عنصر بنا دیا تھا، بعینہٖ یہی حال اُنکا عرب میں بھی تھا، اِن چند قلعوں کے برتے پر وہ اسلام کی قوت کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو متعدد لڑائیاں صرف انکی شرارت سے لڑنی پڑیں، بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو یہ فخریہ کہتے تھے "بیچارہ مکہ کے قریش لڑنا کیا جانیں، مسلمانوں کو ہمارے قلعوں سے مقابلہ پڑے تو معلوم ہو"،

غرض عرب کا ملک اس قدر متعدد اور مختلف اندرونی و بیرونی خطرات میں مبتلا تھا کہ اس کی اصلاح و تدبیر کے لیے عام انسانی دست و بازو بیکار تھے، خدا کا غیر مرئی ہاتھ محمدؐ رسول اللہ کی آستین میں پوشیدہ تھا، وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ہجرت کے بعد آٹھ برس کی متواتر کوششوں اور پیہم اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محال نے امکان بلکہ واقعہ کی صورت اختیار کر لی، عرب کی سیاسی ضعف کا تمام تر راز نااتفاقی اور باہمی جنگ و جدال میں مضمر تھا، اور اس نااتفاقی اور خانہ جنگی کا سبب صرف یہ تھا کہ تمام عرب مختلف خاندانوں اور نسلوں میں منقسم تھا، تمام ملک کے اجتماع اور اتحاد کے لیے ان میں کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا، محمدؐ رسول اللہ صلعم نے تمام عرب کی شیرازہ بندی کیلیے اسلام کا رشتہ قائم کیا إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (حجرات) اور دفعتہ اس روحانی رشتہ نے خون، قرابت، اور نسل کے تار و پود اُدھیڑ دیئے اور صرف ایک کلمۂ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَمُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ کی برقی رو اب تمام عرب کی اتحادی روح کو حرکت دے رہی ہے،

خدائے پاک نے قرآن مجید میں اس اجتماع اور اتحاد کے وجود کو اپنی مخصوص نعمت فرمایا،

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ

خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے خدا نے

بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران) — تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پھر اسکے لطف و محبت سے تم بھائی بھائی بن گئے

خدا نے خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مخاطب کر کے فرمایا کہ محمد! یہ تیرا کام نہ تھا، اس میں خود خدا وند مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔"

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ — وہ خدا ہی ہے جس نے محمد! اپنی نصرت اور مسلمانوں کے

بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَلَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا — ذریعہ سے تمکو قوت بخشی، اور اُسی نے مسلمانوں کے دل

مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ — باہم جوڑ دیے اور اگر تو تمام دنیا کے خزانے بھی لٹا دیتا تو بھی انکے دلوں کو

اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ — نہ جوڑ سکتا، لیکن خدا نے انکے دل باہم جوڑ دیے وہ زبردست اور حکمت والا ہے،

ہجرت کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو مواخاۃ اور برادری قائم کرائی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی اور اسکی آخری کڑی وہ خطبہ تھا جو فتح مکہ کے موقع پر دیا گیا،

قرآن مجید نے اپنے متواتر ارشادات میں فتنہ اور فساد فی الارض کو مکروہ ترین فعل انسانی قرار دیا، اور اس فعل کے مرتکب کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں، چوری کے لیے قطع ید کی سزا متعین کی، رہزنی کے لیے قتل، پھانسی، قطع ید، اور جلاوطنی کی تعزیریں جاری کیں، سورۂ مائدہ میں خونریزی اور قتل و سفاکی کے انسداد کیلیے قصاص کا قانون نازل ہوا عملاً ملک میں قیام امن کے لیے آنحضرت صلعم نے متعدد بار فوجیں بھیجیں، رہزن قبائل پر چھاپے مارے[1]، حجاز میں جن قبائل کا پیشہ چوری تھا، وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے[2]، فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے فیصلہ کے لیے قوانین وضع ہوئے، اور جا بجا عمال کا تقرر ہوا۔

لیکن یہ سب جو کچھ ہوا، وہ انسانوں کی ظاہری فطرت کی پابندی تھی، ورنہ ایک پیغمبر کا فرض، ایک مقنن، اور ایک عام مدبر کے فرائض سے بدرجہا بلند ہے، اسلام کے قانون تعزیرات نے جو کچھ کام کیا، قرآن کا روحانی اثر اور خاتم الانبیاء صلعم کا فیض تلقین اس سے پہلے فرد قرار داد جرم کی دفعات کو بالکل مٹا دیتا تھا۔ قانون خوف تعزیر صرف بازاروں میں اور انسان کے عام مجمعوں میں جرائم سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن دعوت اسلام کے فیض اثر نے

---

[1] دیکھو غزوات نبوی بر دو بارہ لطر [2] صحیح بخاری، ذکر غفار و اسلم۔

دلو نکو بالکل خدا کے سامنے کر دیا جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا تھا، اور مقفل دروازوں کی کھڑکیوں سے بھی جھانکتا تھا، دفعتہً اب تمام ملک میں امن وامان تھا، اور عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت صلعم کی پیشینگوئی کے مطابق صنعاء سے حجاز تک عورتیں تنہا سفر کرتے تھے اور خشیۃ الٰہی کے سوا کوئی اور خوف راستہ میں نہ تھا۔[1] ایک یوروپین مورخ جس کے قلم نے پیغمبر اسلام کی مدح کے لیے بہت کم جنبش کی ہے، (مارگولیوس) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے

"محمدؐ کی وفات کے وقت اُنکا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا آپ ایک سلطنت کی جسکا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور اُن میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔[2]"

بیرونی خطرات کے انسداد کے لیے خدا نے عجیب وغریب سامان پیدا کر دیے، قریش اور منافقین مدینہ کے اشتعال سے یہودیوں نے اسلام کو پامال کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود چُور چُور تھے، سنہ ۳ھ سے لیکر سنہ ہجری تک متواتر لڑائیاں پیش آئیں، اور آخر فتح خیبر پر اُن کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہوگیا، رومیوں نے اور حدود شام کے عیسائی عربوں نے اسلام کے استیصال کا بیڑا اُٹھایا، عیسائی روساے عرب میں سب سے زیادہ طاقتور اور پُر زور غسانی تھے، جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح کام کرتے تھے، بہراء، وائل، بکر، لخم، جذام، اور عاملہ وغیرہ عرب قبائل اُن کے ماتحت تھے، اُنکے علاوہ دومۃ الجندل، ایلہ، جرباء، اذرح، تبالہ، اور جرش وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے عیسائی اور یہودی رئیس تھے، عیسائیوں کے حملہ کی ابتدا جسطرح ہوئی وہ اُوپر گذر چکا ہے، حارث بن عمیر جو شاہ بصریٰ کے دربار میں دعوت اسلام کا خط لیکر گئے تھے اُنکو عیسائیوں نے راستہ میں قتل کر دیا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے تین ہزار مسلمانوں کا ایک دستہ تادیب وانتقام کے لیے روانہ فرمایا، عیسائی ایک لاکھ کا

[1] صحیح بخاری، [2] لائف آف محمد مارگولیوس صفحہ ۴۷۱،

ٹڈی دل لیکر میدان میں آئے اور خبر تھی کہ رُومی بھی اُسیقدر فوج لیے ہوئے موقع سے قریب مؤاب میں پڑے ہیں، تاہم مٹھی بھر مسلمان، آدمیوں کے اس جنگل سے نہ ڈرے اور کچھ عزیز جانیں کھو کر فوج کو میدان جنگ سے ہٹا لائے، اس جنگ کا نام غزوۂ **موتہ** ہے،

اسکے بعد سنہ ۹ھ میں غزوۂ تبوک پیش آیا، دم بدم خبریں آتی رہتی تھیں کہ رومی حملہ آوری کے لیے عیسائی عربوں کی ایک فوج گراں ترتیب دے رہے ہیں اور ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی فوج کو تقسیم کرچکے ہیں، یہ بھی خبر تھی کہ عیسائی فوج کی آراستگی میں مصروف ہیں، اور گھوڑوں کی نعلبندی کرا رہے ہیں، اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تیس ہزار صحابہ کے ساتھ پیشقدمی فرمائی اور بیس دن تک دشمنوں کی آمد کا انتظار کرتے رہے، لیکن کوئی مقابل نہ آیا، تاہم اس پیشقدمی کا یہ فائدہ ہوا کہ غسانیوں کے علاوہ تمام روسا رومیوں کو چھوڑ کر اسلام کی حمایت قبول کرلی[1]، سنہ ۱۱ھ میں زمانہ مرض الموت میں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُسامہ بن زید کے زیر افسری رُومیوں کے مقابلہ کیلیے پھر فوجیں روانہ فرمائیں، لیکن اِس مہم کا اختتام عہد صدیقی میں ہوا

ایرانیوں کی حکومت زندگی کے آخری دور کو پہنچ چکی تھی، سنہ ھ میں دُعاۃ اسلام پہنچنے کے ساتھ ہی بمقابلہ وجنگ، یمن، عمان، اور بحرین میں اُن کی قبائے حکومت کا تار تار الگ ہوگیا۔

غرض نو دس برس کی متواتر اور پیہم کوششوں اور مافوق طاقت بشری تائیدات کے سلسلے سے تمام ملک میں امن وامان قائم ہوگیا، قریش اور یہود کی سازشوں کا طلسم ٹوٹ گیا، قبائل کی خانہ جنگیاں مٹ گئیں اور تمام رہزن اور ڈاکو جتھے رام ہوگئے، بیرونی خطرات کا انسداد ہوگیا، اب موقع مِلا کہ صلح و آشتی کے ساتھ فرمان الٰہی، اصل مقصود کی طرف توجہ کیجائے،)

[1] اوپر کے تمام واقعات کی تفصیل اور حوالے غزوۂ موتہ اور تبوک کے ذکر میں گذر چکے ہیں

تبلیغ واشاعتِ اسلام

سرورِ کائنات کا اصلی کام تمام عالم میں دعوتِ اسلام کا اعلان کرنا تھا اور نہ صرف اعلان بلکہ ہر قسم کے جائز اور صحیح وسائل سے تمام عالم کو حلقۂ اسلام میں لانا تھا، اس کے لیے تیغ وسحر اور فوج وعسکر کی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف اسقدر کافی تھا کہ دعوتِ حق کی صدا، اطرافِ عالم میں پہنچ جانے پائے، لیکن مکہ میں تیرہ برس تک اعدائے اسلام اسی کے سدِّ راہ رہے، حج کے موقع پر عرب کے تمام قبائل دور دور از مقامات سے آتے تھے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) ایک ایک کے پاس جاتے اور صرف یہ درخواست کرتے کہ قریش مجھکو پیامِ حق پہنچانے سے روکتے ہیں، تم اس کا موقع دلادو اور خود دو، لیکن قریش کے اثر سے ہزاروں لاکھوں میں سے ایک بھی اسکی حامی نہیں بھرتا تھا،

تاہم آفتابِ حق کی کرنیں، ان کثیف بادلوں میں سے بھی چھن چھن کر سطحِ قلوب پر گرتی تھیں اور اکناف و حوالی کو روشن کرتی جاتی تھیں، اسلام کو صرف اشتہار اور اعلان کی ضرورت تھی، اور یہ کام خود اعدائے اسلام نے انجام دیا، جب حج کا زمانہ آتا تو روسائے قریش عام گذرگاہوں پر چوکی لگاتے، باہر کے لوگ اُن سے ملنے آتے، اور چونکہ بعثتِ نبوی کا چرچا پھیل چکا تھا، لوگ اسکی حقیقت دریافت کرتے، اور نہ کرتے تو قریش خود حفظ ماتقدم کے لیے اُن سے کہتے کہ "ہمارے شہر میں ایک بدعقیدہ پیدا ہوا ہے جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، یہاں تک کہ لات وعزیٰ تک کو بُرا کہتا ہے"،

بدعقیدہ کو عربی میں "صابی" کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یا اس وجہ سے کہ اسلام کے بعض فرائض، مثلاً نماز کی صورت، صابئین کے اعمال سے مِلتے جلتے ہیں، قریش نے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو صابی کا لقب دیا تھا، اور بالآخر اس لقب سے تمام عرب میں آپ کا نام مشہور ہوگیا، صحیح بخاری کتاب المغازی میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ "میں جب چھوٹا تھا تو مکہ کے آنے جانے والوں سے سنا کرتا تھا کہ مکہ میں ایک صابی پیدا ہوا ہے"[1]

(۱) کتاب المغازی ص ۶۱۵)

ملک میں جب آپ کا نام مشہور ہوا، تو اگرچہ جمہور عام پر مخالف اثر پڑا، اور انہیں سے کسی شخص نے آپ کی طرف رخ

نہیں کیا، لیکن اتنا بڑا وسیع ملک ان لوگوں سے خالی نہیں ہو سکتا تھا، جنکو یہ شوق پیدا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ عرب میں ایسے لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہو گئی تھی جو بُت پرستی سے متنفر ہو چُکے تھے، اور حق کے متجسّس تھے، بعض لوگ اس حد سے ترقی کر کے حنفی بن گئے تھے، جنکا تذکرہ آغاز کتاب میں گذر چکا ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں متعدد ایسے صحابہ کا تذکرہ کیا ہے جو یمن وغیرہ دُور دراز مقامات سے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تحقیق حال کے لیے مکہ میں آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور مخفی طور سے اسلام لاکر واپس گئے، حضرت ابو موسےٰ[1] اشعری یمنی (اور طفیل بن عمرو دوسی یمنی) کے خاندان میں جو اسلام پھیلا، اُسکی ابتدا قیام مکہ ہی کے زمانہ میں ہوئی تھی،

(طفیل بن عمرو دوسی عرب کا مشہور شاعر تھا، اور چونکہ عرب میں شعر کا اثر بہت تھا، یعنی وہ قبیلہ کے قبیلہ کو جدھر چاہتے تھے جھونک دیتے تھے، اسلیے قریش نے اسکی بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں نہ پہنچنے پائے، لیکن ایک دفعہ جب اُسے اتفاقیہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو قرآن مجید پڑھتے سُنا تو وہ فوراً مسلمان ہو گیا[2]، اور اُس کے اثر سے اُسی زمانہ میں قبیلۂ دوس میں بھی اسلام پھیلنے لگا[3]، تاہم عام قبیلہ نے طفیل کی دعوت قبول نہ کی، وہ رنجیدہ ہو کر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ! دوس نے نافرمانی کی ان پر بد دعا کیجیے، آپنے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی کہ "خدایا دوس کو ہدایت دے، اور اُن کو بھیج" اس کے بعد سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا[4]،

عمرو بن عبسہ سلمی بھی انہیں بزرگوں میں ہیں، جنھوں نے لوگوں کی زبانی یہ سنکر کہ مکہ میں ایک شخص پیدا ہوا ہے، جو بہت سی باتیں بتاتا ہے، مشتاقانہ مکہ آئے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) اُسوقت قریش کے مظالم کی بنا پر چھپے رہتے تھے، عمرو بن عبسہ کسی طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پہنچگئے، اور عرض کی کہ "آپ کون ہیں" آپنے فرمایا "میں پیغمبر ہوں" اُنھوں نے کہا "پیغمبر کسکو کہتے ہیں؟" آپنے فرمایا "خدا نے مجھے بھیجا ہے" اُنھوں نے پھر

[1] اصابہ باقصۂ ابوذر، [2] زرقانی، (۳) صحیح مسلم کتاب الایمان سے یہ مفہوم ہوتا ہے، [4] صحیح بخاری، باب قصۂ دوس،

پوچھا "کیا پیغام دیکر بھیجا ہے" ارشاد فرمایا، مجھے خدا نے یہ پیغام دیکر بھیجا ہے کہ قرابت کا حق ادا کیا جائے، بت توڑے جائیں، خدا کو ایک مانا جائے اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے" عمرو نے پوچھا اس مذہب کے کتنے پیرو ہیں؟ آپ نے فرمایا "ایک آزاد (ابوبکرؓ) اور ایک غلام (بلالؓ) عمرو نے کہا میں بھی آپ کی پیروی کرتا ہوں، ارشاد ہوا کہ ابھی تو یہ ممکن نہیں، تم دیکھتے ہو کہ میں کس حال میں ہوں، اور لوگوں کا کیا حال ہے، میری کامیابی کی جب حال سنو تو میرے پاس آنا" چنانچہ عمرو واپس گئے، اور ہجرت کے بعد جب لوگوں کی زبانی آپ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو حاضر خدمت ہوئے[۱]

ضماد بن ثعلبہ، قبیلۂ ازدشنوہ کے رئیس اور آپ کے زمانۂ جاہلیت کے دوست تھے، وہ مکہ آئے تو سنا کہ محمدؐ کو جنون ہوگیا ہے، وہ جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے، وہ آپ کے پاس آئے کہ لاؤ میں تمہارا علاج کردوں، آپ نے فرمایا الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ، ومن یضلل فلا ھادی لہ، واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ، ان فقروں نے ضماد پر غیر معمولی اثر کیا، عرض کی دوبارہ ارشاد فرمایئے، آپ نے پھر اعادہ فرمایا، ضماد نے پھر تیسری بار پڑھوایا، اب وہ بالکل مسحور تھے، بولے کہ میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر، اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں، لیکن ایسا کلام میں نے نہیں سنا، یہ تو دریا کی تہ تک میں بھی اتر کر جائیگا، لایئے ہاتھ لایئے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں" آپ نے اُن سے بیعت لی، پھر فرمایا، اپنے پورے قبیلہ کی طرف سے بھی بیعت کرلو، چنانچہ اُنھوں نے پورے قبیلہ کی طرف سے بیعت کرلی، اور وہ اُن کی دعوت سے مسلمان ہوگئے، ایک دفعہ ایک لڑائی میں مسلمان سپاہیوں کا اُدھر سے گذر ہوا، تو افسر نے پوچھا کسی نے اِس قبیلہ کی کوئی چیز لی ہے، ایک سپاہی نے کہا، ایک لوٹا میرے پاس ہے، اُسے حکم دیا کہ واپس کردو[۲]

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ اس موقع پر خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے،

غفار کا قبیلہ جو قریش کے شامی تجارت کے راستہ میں آباد تھا، جب وہاں یہ خبر جا پھیلا تو حضرت ابوذرؓ جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے، اور حق کی تلاش میں تھے، اُنھوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ، اور دیکھو کہ یہ شخص

---

(۱) صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا، (۲) صحیح مسلم، باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ،

جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اسکی تعلیم اور تلقین کیا ہے، انیس مکہ میں آئے اور واپس جاکر بیان کیا کہ وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اور جو کلام پیش کرتا ہے، وہ شاعری سے الگ ہے" حضرت ابوذرؓ کو اس مختصر جواب سے تسکین نہیں ہوئی، خود گئے، زادِ سفر کے لیے مشک پانی، اور کچھ کھانے کو لے لیا، مکہ میں آئے تو ڈر کے مارے کسی سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام پوچھ نہیں سکتے تھے، حرم میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوگئی، اُنھوں نے گھر پر لاکر مہمان رکھا، لیکن تین دن تک اُن سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی، بالآخر خود حضرت علیؓ نے پوچھا کہ "یہاں آنے کی کیا غرض ہے؟" انھوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا لیکن پھر قول و قرار لے لیا کہ کسی پر یہ راز ظاہر ہونے پائے، حضرت علیؓ اُنکو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لائے، اور آپ نے اسلام کی تلقین کی، اور فرمایا کہ اس وقت گھر واپس جاؤ، پھر میں جو کچھ کہلا بھیجوں گا اُسکی تعمیل کرنا، لیکن اُن کو اسلام کا جوش تھا، عرض کی کہ میں تو اسلام کا اعلان کرکے رہوں گا" غرض حرم میں آئے اور زور سے پکارے کہ "اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ" اس آواز کا سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور انکو مارنا شروع کیا، حضرت عباسؓ نے آکر بچایا، اور لوگوں سے کہا، تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمھاری تجارت کا راستہ غفار کی آبادی سے ہوکر گذرتا ہے، اور یہ اسی قبیلہ کے آدمی ہیں" اُس وقت لوگوں نے چھوڑ دیا، لیکن دوسرے دن حضرت ابوذر نے حرم میں جاکر پھر اسی طریقہ سے اسلام کا اعلان کیا، اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو کل ہوچکا تھا، آج بھی اتفاق سے حضرت عباسؓ آگئے، اور انھوں نے جان بچائی[1]

حضرت ابوذر مکہ سے جب واپس گئے اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہوگیا، بقیہ آدمیوں نے کہا کہ ہم اُس وقت اسلام کا اظہار کریں گے جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں آجائیں، چنانچہ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو باقی آبادی بھی مسلمان ہوگئی،[2] غفار سے قریب اسلم کا قبیلہ آباد تھا، اور دونوں قبیلوں میں قدیم تعلقات تھے، غفار کے اثر سے اُنھوں نے بھی اسلام قبول کرلیا،[3] (حالانکہ یہ دونوں قبیلے اسلام سے پہلے چوری[4] میں بدنام تھے، اور اُن کو معلوم تھا کہ اسلام اِس فعل شنیع کا دشمن ہے)

---

[1] یہ روایت تمامہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے، صحیح مسلم میں یہ واقعہ دوسری طرح منقول ہے، اس میں بہت سی باتیں اس سے زائد اور مختلف ہیں، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے، [2] (صحیح مسلم اسلام ابی ذر) [3] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار، [4] بحوالہ نسائی)

اوس وخزرج کا اسلام

(موسم حج میں عرب کے اکثر قبائل کا اجتماع ہوجاتا تھا، آپ اس موقع پر ایک ایک قبیلہ کے قیامگاہ پر جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے، چنانچہ مدینہ کے قبائل **اوس** وخزرج کی ایک معتدبہ جماعت نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا،

عام مدینہ میں اشاعت اسلام

مدینہ منورہ میں جب آپ تشریف لائے تو آس پاس کے قبائل میں سے جیسا کہ اوپر گذرا غفار و اسلم نے اسلام قبول کرلیا، کچھ ہی دنوں کے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا جس میں قریش کو شکست ہوئی، اور بہتر اشخاص مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوگئے، ان قیدیوں کی رہائی کے لیے قریش نے مدینہ میں آمد ورفت شروع کی، اس تقریب سے لوگوں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس اثر سے متعدد اشخاص مسلمان ہوگئے

بدر کے بعد بعض قریشیوں کا اسلام

(ان میں) بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اتفاقیہ اُنکے کانوں میں قرآن مجید کی آواز پڑگئی، اور باوجود سخت عداوت کے اُن کا دل پتھر سے موم بن گیا، جبیر بن مطعم بدر میں گرفتار ہوکر آئے تھے، اور قیدیوں کے ساتھ اسیر تھے، ایک دن آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) یہ آیتیں پڑھ رہے تھے،

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ،

کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہوگئے، یا ان لوگوں نے خود اپنے آپکو پیدا کیا، یا اِن لوگوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا بلکہ بات یہ ہے کہ انکو یقین نہیں ہے،

جبیر بن مطعم نے یہ آیتیں سن لیں تو اُنکا بیان ہے کہ مجھکو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کرگیا، صحیح بخاری سورۂ طور میں یہ واقعہ مذکور ہے، [1]

(مکہ میں روم وفارس کی جنگ کے متعلق آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے جو پیشینگوئی فرمائی تھی وہ ٹھیک فتح بدر کے موقع پر پوری اُتری اور قرآن مجید کی پیشینگوئی کے مطابق سات برس کے بعد رومیوں نے فارس پر فتح کلّی پائی، اس عظیم الشان معجزہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک خلقِ کثیر نے اسلام کی صداقت کا اقرار کیا،)

غرض اس طرح آپ ہی آپ لیکن نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ اسلام پھیلتا جاتا تھا، ۶ھ میں قریش

(۱ جامع ترمذی تفسیر سورۂ روم،)

کنانہ، غطفان، اسد اور دیگر قبائل نے متحد ہوکر مدینہ پر حملہ کیا، اور شکست کھائی، اِس معرکہ کا نام احزاب ہے، جس کی تفصیل اُوپر گذر چکی ہے، اس شکست نے قریش کا عالمگیر اثر کسی قدر کم کیا، اور وہ قبائل جو قبول اسلام کے لیے آمادہ تھے، لیکن قریش کے ڈر سے انکو اظہار اسلام کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اُنھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں

قبیلۂ مزینہ کا اسلام

وفود بھیجنے شروع کئے، سب سے پہلی سفارت جو آئی وہ قبیلہ مزینہ کی تھی، جس میں چار سو آدمی شریک تھے، انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اگر ارشاد ہو تو ہجرت کرکے مدینہ میں آجائیں، لیکن آپ نے فرمایا "تم جہاں رہو مہاجر ہو"[1]

قبیلۂ اشجع کا اسلام

اسی زمانہ میں قبیلۂ اشجع کے سفراء جنکی تعداد سو تھی، مدینہ میں آئے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا کہ ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ صلح کا معاہدہ ہو جائے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبول فرمایا، اسوقت تک یہ لوگ کافر رہے، لیکن جب صلح ہو چکی تو اُنھوں نے خود بخود اسلام قبول کر لیا[2]،

جہینہ بھی انھیں قبائل کے آس پاس آباد تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اسلام کی دعوت دی، اور وہ فوراً ایک ہزار کی جمعیت لیکر مدینہ آئے اور مسلمان ہوگئے اور اسکے بعد وہ اکثر غزوات میں مُسلمانوں کے شریک حال رہے[3]،

غفار، اسلم، مزینہ، اشجع، اور جہینہ کی یہی اطاعت اور مسابقت اسلام تھی، جسکی بناپر آپ نے اُنکے حق میں دعائے خیر فرمائی[4]،

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں جیسا کہ ہم حدیبیہ کے ذکر میں لکھ آئے ہیں، کُفّار اور مسلمان نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جُلتے، اور اسلیے سینکڑوں کو خلوت و جلوت میں مسلمانوں کی تلقینات کے سننے کا موقع ملا، اِسکا یہ نتیجہ ہوا کہ اس سے پہلے باوجود غزوات اور محاربات کے جسقدر لوگ اسلام لائے تھے صرف دو برس میں یہ تعداد اس سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی، چنانچہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) صلح حدیبیہ کے سال ادائے حج کے

---

[1] جزو طبقات ابن سعد متعلق وفود در ترجمہ فارسی مطبوعہ مفید عام آگرہ [2] جزو طبقات ابن سعد ترجمہ فارسی، [3] اصابہ تذکرہ سبیر بن عرفطہ،
[4] صحیح بخاری جلد اوّل ذکر غفار، واسلم، وجہینہ، [5] طبری میں امام زہری کا قول ہے،
فلما کانت الھدنۃ و وضعت الحرب اوزارھا وامن الناس — جب صلح ہوگئی اور جنگ موقوف ہوئی، ایک دوسرے سے لوگ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸)

ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلے تو صرف دو ہزار شخص ساتھ تھے، اب دو برس کے بعد فتح مکہ کو چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکر جرار ساتھ تھا،

صلح حدیبیہ کا اثر اگرچہ تمام عرب پر محیط نہ تھا، کیونکہ اس معاہدہ میں صرف قریش اور کنانہ شریک تھے، اس لیے جو لوگ براہ راست قریش کے زیر اثر یا اُن کے حلیف اور ہم عہد نہ تھے، وہ اب بھی مدینہ پر حملہ کی طیاریاں کرتے رہتے تھے اور اُن کے دفاع کے لیے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو کچھ کچھ فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، تاہم جن موقعوں پر امن کا گمان ہوتا تھا وہاں داعیان اسلام بھیجے جانے لگے، کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں، لیکن چونکہ حفاظت خود اختیاری کی غرض سے ان داعیوں کے ساتھ تھوڑی بہت جمعیت بھی ہوتی تھی اس لیے ارباب سیر ان تبلیغی جماعتوں کو بھی سرایا سے تعبیر کرتے ہیں،

تمام عرب تولیت کعبہ کی وجہ سے قریش کو مذہبی رہبر سمجھتا تھا، اس لیے وہ انتظار کر رہے تھے کہ قریش کا کیا انجام ہوتا ہے، عمرو بن سلمہ ایک صحابی تھے جو مدینے سے دور ایک گذرگاہ عام پر رہتے تھے، اُن کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں منقول ہیں[۱]،

کانت العرب تلوم باسلامهم الفتح
فیقولون اترکوه وقومه فانه ان ظهر
علیهم فهو نبی صادق فلما کانت وقعة
اهل الفتح بادر کل قوم باسلامهم،

عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ محمد
صلی اللہ علیہ وسلم کو انکی قوم (قریش) پر چھوڑ دو اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُن پر
غالب آگئے تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر
قبیلے نے اسلام کی طرف سبقت کی،

اس ہشام نے زیادہ صاف لکھا ہے،

کلهم یعصهم بعضا فالتقوا وتفاوضوا فی الحدیث والمنازعة
فلم یکلم احد بالاسلام یعقل شیئا الا دخل فیه فلقد دخل فی
تلک السنتین فی الاسلام مثل ما کان فی الاسلام واکثر (صفحہ ۱۵۱)

سب ہوئے باہم ملے جلے باتیں چیتیں ہوئیں، تو کوئی عقلمند انسان جس نے
اسلام کے متعلق گفتگو کی اور اسے قبول نہ کر لیا ہو، چنانچہ جتنے لوگ ابتدا سے اس وقت تک مسلمان
ہوئے تھے صرف ان دو برسوں میں اتنے برابر بلکہ اس سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے“)

[۱] صحیح بخاری، فتح مکہ،

وانما[1] كانت العرب تربص بالاسلام امر هذا
الحي من قريش وامر رسول الله صلى الله عليه
وسلم وذلك ان قريشا كانوا امام الناس
وهاديهم واهل البيت والحرم وصريح ولد
اسمعيل بن ابراهيم عليهما السلام وقادة العرب
لا ينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت
لحرب رسول الله صلى الله عليه وسلم وخلافه
فلما افتتحت مكة ودانت له قريش ودوخها
الاسلام عرفت العرب انه لا طاقة لهم بحرب
رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا عداوته
فدخلوا في دين الله كما قال الله عز وجل الخ،

اور عرب اسلام کے باب میں صرف قریش کا انتظار کر رہے
تھے اور وہ یوں کہ قریش تمام ملک کے سردار اور پیشوا، اور کعبہ و حرم
کے مولی، اور حضرت اسمٰعیل کی خاص اولاد، اور عرب کے
قائد تھے، اور صرف قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
مخالفت کے لیے جنگ برپا کی تھی، جب مکہ فتح ہو گیا
اور قریش نے سپر ڈال دی اور اسلام نے مکہ کو چھا لیا تو
عرب کو یقین ہو گیا کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کی جنگ اور عداوت کی طاقت نہیں ہے، تو
وہ خدا کے دین میں داخل ہو گئے، جیسا کہ اللہ
عز وجل نے قرآن میں کہا ہے، (یعنی
اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ)

غرض اسلام کی سچائی اور سادگی، اور عرب کی تیز فہمی اور ذہانت کے لحاظ سے اسلام کے پھیلنے میں جو دیر لگی وہ زیادہ تر قومی اور خاندانی مخالفت کی وجہ سے تھی، اب جبکہ باطل کا سنگ راہ ہٹ گیا تو حق کے آگے بڑھنے میں دیر نہ تھی،

فتح مکہ کے بعد اب دعوت اسلام کے لیے یہ خطرہ نہیں رہا کہ اُس کے دُعاۃ جہاں جائیں بیدریغ قتل کر دیئے جائیں، اِس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام اطراف عرب میں دُعاۃ بھیجدیئے کہ لوگوں کو اسلام کے فضائل و محاسن بتا کر اُن کو اسلام کی ترغیب دلائیں،

دُعاۃ حسب ذیل طریقہ سے مقرر کئے گئے،

[1] سیرت ابن ہشام ذکر واقعات سنہ ۹ھ و وفود ۱۲

(۱) حفاظت خود اختیاری کی غرض سے کسی قدر فوج ساتھ کردیجاتی تھی کہ انکو کوئی شخص ضرر نہ پہنچانے پائے، اور وہ آزادی سے تبلیغ اسلام کرسکیں، حضرت خالدؓ کو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے یمن بھیجا تو فوج بھی ساتھ کردی، لیکن تاکید تھی کہ نہ حضرتیں نہ آئیں، چنانچہ پورے چھ مہینہ تک اُنکی دعوت اسلام پر کسی نے توجہ نہیں کی اور وہ کچھ نہ کرسکے، حضرت خالدؓ سپہ سالار اور فاتح تھے، واعظ اور صاحب ارشاد نہ تھے، اِس بناپر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اب حضرت علیؓ کو بھیجا، اُنھوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعتہً ملک کا ملک مُسلمان تھا،

یہی وہ دُعاۃ ہیں جنکو علامہ طبری نے اِن لفظوں سے تعبیر کیا ہے،

فلہ کان رسُول اللہ صلعم بعث فیما حول مکۃ السرایا تدعوا الی اللہ عزوجل ولم یامرھم بقتال۔	آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں کچھ ٹکڑیاں بھیجی تھیں کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں لیکن اُنکو لڑائی کا حکم نہیں دیا تھا،

حضرت خالدؓ کو قبیلۂ بنی جذیمہ کے پاس بھی اسیطرح دعوت اسلام کیلئے بھیجا تھا، لیکن جب انھوں نے کشت وخون کیا اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو خبر ہوئی تو آپ کھڑے ہوگئے اور قبلہ رُخ دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا، خدایا! میں خالدؓ کے فعل سے بری ہوں، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا، اُنھوں نے ایک ایک مقتول کا خون بہا ادا کیا، یہانتک کہ کُتوں کا بھی،

(اشاعت اسلام کی غرض سے جو مُسلّح جماعت اطراف ملک میں بھیجی جاتی تھی اس میں کبھی کبھی آپ ایک ایک فرد کا امتحان لیتے تھے، ان میں جو صاحب سب سے زیادہ حافظ قرآن ہوتے تھے اُن کو اس کا امیر مقرر فرماتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک بار اِسی قسم کی فوج روانہ کرنا چاہی تو ایک ایک شخص سے قرآن

(لہ اِس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعت اسلام کے لیے بھیجی گئی تھی، صرف یہ الفاظ ہیں،

بعث بعثا وھم ذووعدد	یعنی آپ نے ایک بہت بڑی جماعت بھیجی،

تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعت اسلام تھا، کیونکہ اگر لڑائی مقصود ہوتی تو حفظ قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ آپ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کرسنتے)،

پڑھوا کر سنا، ان لوگوں میں ایک کمسن نوجوان تھے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) اُنکے پاس آئے اور پوچھا تمھیں کیا یاد ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ مجھکو سورۂ بقرہ اور فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا تو تمھیں ان سب کے امیر ہو، (ترغیب و ترہیب جلد اصفحہ ۲۵۹، بروایت ترمذی)

(۲) جو ممالک زیر اثر آتے تھے اور وہاں زکوٰۃ اور جزیہ کے وصول کرنے کے لئے عمال بھیجے جاتے تھے، وہ اکثر اس درجہ کے لوگ ہوتے تھے جن کا تقدس، زہد، اور پاکیزگی مسلم ہوتی تھی، اس کے ساتھ عالم اور واعظ بھی ہوتے تھے، اور اس لئے وہ تحصیل مال کے ساتھ تبلیغ اسلام کی خدمت بھی انجام دیسکتے تھے، ان میں سے بعضوں کے نام حسب ذیل ہیں،

نام	مقام	کیفیت
مہاجر بن ابی اُمیہ	صنعاء یمن	حضرت ام سلمہ (زوجۂ نبوی) کے بھائی تھے،
زیاد بن لبید	حضرموت	یہ ان صحابہ میں ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے،
خالد بن سعید	صنعاء یمن	سابقین اولین اور مہاجرین حبش میں ہیں، سب سے پہلے انہی نے کاغذات پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا،
عدی بن حاتم	قبیلۂ طے (یمن)	مشہور صحابی ہیں، حاتم طائی انہی کا باپ تھا،
علاء بن حضرمی	بحرین	
حضرت ابو موسیٰ اشعری	زبید و عدن	اُنکی دعوت اسلام سے قریبًا تمام لوگ مسلمان ہوگئے، مشہور صاحب علم صحابی ہیں،
حضرت معاذ بن جبل	جند	
جریر بن عبداللہ بجلی	ذوالکلاع حمیری	جریر مشہور صحابی ہیں، ذوالکلاع حمیری یمن کے سلاطین کے خاندان سے تھے، ایک موقع پر لاکھ آدمیوں نے انکو سجدہ کیا تھا، جریر کی دعوت پر یہ اسلام لائے تو اتنی خوشی میں چار ہزار غلام آزاد کئے،

(۳) بعض لوگ مخصوص اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے، تفحص سے اس قسم کے دعاۃ کے نام حسب ذیل ملے ہیں،

نام	مقام دعوت	نام	مقام دعوت
علیؓ بن ابی طالب	قبیلۂ ہمدان وحدلیہ ومدحج،	مہاجر بن ابی امیہ	بطرف حارث بن عبد کلال شہزادۂ یمن،
مغیرہ بن شعبہ	نجران،		
خالد بن ولید	اطراف مکہ،	محیصہ بن مسعود	فدک
عمرو بن العاص	عمان،		
وبر بن یحنس	ابنائے فارس،		

(۴) رؤسائے قبائل بارگاہ نبوت میں آکر مسلمان ہوجاتے تھے اور کچھ روز یہاں قیام کر کے اپنے اپنے قبائل میں دعوت اسلام کی غرض سے واپس جاتے تھے، ان اشخاص کے نام یہ ہیں،

نام	مقام	کیفیت
طفیل بن عمرو دوسی	قبیلۂ دوس	
عروہ بن مسعود	ثقیف	
عامر بن شہر	ہمدان	
ضمام بن ثعلبہ	بنو سعد	
منقذ بن حبان	بحرین	
ثمامہ بن اثال	اطراف نجد	

ان مبلغین اور دعاۃ کے اثر سے اسلام ہر جگہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، فتح مکہ کے بعد جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے

۱؎ اصابہ باذکر اسلام ابنائے یمن،

دعاۃ اطراف ملک میں بھیج دیے گئے تھے اور لوگ جوق جوق مسلمان ہوتے جاتے تھے، قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی موقع کیطرف اشارہ کرتی ہیں،

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ — جب خدا کی فتح و نصرت آئی اور تم نے دیکھا کہ لوگ فوج

یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا، — در فوج خدا کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں،

فتح مکہ کے تین مہینے بعد ذوالحجہ ۹ھ کے موسم حج میں اعلان براءۃ ہوا، اس واقعہ کے بعد بلا استثناء حجاز نے عام طور سے اسلام قبول کر لیا[1]،

حجاز سے باہر نبوت کے اکیس برس میں صرف قریش اور یہود کی مزاحمت سے اسلام آگے نہ بڑھ سکا اور جا بجا مسلمان ادھر ادھر نظر آتے تھے، لیکن ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس میں ۹ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان، اور دوسری طرف عراق و شام کی حدود تک وسیع ہو گیا، یہ عرب کے وہ صوبے ہیں جہاں اسلام سے پہلے عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں، اور اس وقت بھی وہ روم و فارس دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، تاہم اسلام بغیر تلوار کی رفاقت کے صلح اور امن کے سایہ میں اپنی آواز بلند کرتا چلا گیا، اور ہر گوشہ سے لبیک کی صدائیں خود بخود آنے لگیں،

[یمن] (ملک عرب کے تمام صوبوں میں یمن سب سے زیادہ زرخیز اور سیر حاصل ہے، اور نہایت قدیم زمانہ سے تمدن و تجارت کا مرکز رہے، سبا اور حمیر کی عظیم الشان حکومتیں یہیں قائم ہوئی تھیں، ولادت نبوی سے تقریباً پچاس برس پہلے ۵۲۵ء میں حبشی عیسائیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا، ولادت نبوی کے چند سال بعد اہلِ ایران یہاں کے مالک ہو گئے تھے، انکی طرف سے یہاں ایک گورنر رہتا تھا، جو یمن پر حکومت کرتا تھا،

یمن میں اسلام کی تحریک کے لئے متعدد عوائق موجود تھے مثلاً اختلاف حیثیت کہ یمنی، قحطانی تھے داعی اسلام اسماعیلی، اہل یمن کو اپنے قدیم جاہ و جلال اور تمدن و حکومت پر ناز تھا، اور تمام عرب بجا طور سے انکی پیشروی کو

---

[1] طبری واقعات ۹ھ،

تسلیم کرتا تھا اور تمام عرب میں وہی حکومت کے مستحق سمجھے جاتے تھے، ملک میں جہاں کوئی باقاعدہ حکومت تھی وہ نسلاً اسی خاندان سے شمار ہوتی تھی، چنانچہ جب یمن سے قبیلہ کندہ کا وفد آیا ہے، جو یمن کا ایک شاہی خاندان تھا تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو ایک عرب فرمانروا سمجھکر رئیس وفد نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا آپ اور ہم ہم خاندان نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہم نضر بن کنانہ کے خاندان سے ہیں، نہ اپنی ماں پر تہمت رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کر سکتے ہیں[1]"

یمن میں اشاعت اسلام کا سب سے بڑا عائق یہ ہوسکتا تھا کہ وہ پولیٹکل حیثیت سے ایرانیوں کے ماتحت تھا، اور باشندے مذہباً علے العموم یہودی یا عیسائی تھے، لیکن قبول حق کے لئے کوئی چیز ان میں سے مانع نہ آئی،

یمن میں اسلام کی دعوت ہجرت سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی، یمن میں دوس ایک ممتاز قبیلہ تھا، اس قبیلہ کا رئیس طفیل بن عمرو اتفاق سے مکہ آیا اور مسلمان ہوگیا، اسی زمانہ میں کندہ کا قبیلہ حج کے لیے مکہ آیا تھا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کیا[2] ۷ھ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) خیبر میں تشریف فرما تھے، دوس کا قبیلہ مسلمان ہوکر دار الاسلام میں منتقل ہوگیا، یمن کا ایک اور مشہور قبیلہ اشعر تھا، وہ بھی مہاجرین حبشہ کی معیت میں اسی زمانہ میں بلا تحریک خود بخود اسلام لایا، اور آستانۂ نبوت پر حاضر ہوا، ابوہریرہ دوسی، اور ابوموسیٰ اشعری، انہیں قبائل کے ساتھ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے)

یمن میں **ہمدان** سب سے بڑا کثیر التعداد اور صاحب اثر خاندان تھا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے (۸ھ کے آخر میں) انکو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت خالد کو بھیجا، خالد چھ مہینے تک انکو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن ان لوگوں نے قبول نہیں کیا، بالآخر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خالد کو بلالیا، اور حضرت علیؓ کو بھیجا، حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو جمع کرکے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نامۂ مبارک پڑھکر سنایا، اور ساتھ ہی سارے کا سارا قبیلہ مسلمان تھا، حضرت علیؓ نے جب اس واقعہ کی اطلاع بارگاہِ رسالت میں دی تو آنحضرت (صلے اللہ

---

[1] ابن حنبل، حدیث اشعث بن قیس زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۳۲ مصر، [2] ابن ہشام ذکر عرض الاسلام علی القبائل۔

علیہ وسلم) نے سجدہ کیا اور سر اٹھا کر دو دفعہ فرمایا، السلام علی ہمدان[1]۔

(بعض روایتوں میں ہے کہ ہمدان نے جب اسلام کا غلغلہ سنا تو عامر بن شہر کو آنحضرت صلعم کی خدمت میں بھیجا کہ یہ مذہب اگر تم کو پسند آئے تو ہم سب اس کے قبول کے لئے تیار ہیں، اور اگر ناپسندیدہ ٹھہرے تب بھی ہم تمہارے ساتھ ہیں، عامر بن شہر جب دربار رسالت سے واپس آیا تو اس کا دل نور اسلام سے معمور تھا، اور ساتھ ہی سارا قبیلہ بھی مسلمان تھا، ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے ہوں اور دونوں کی کوشش سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہو۔

یمن میں حضرت علیؓ سے لوگ مانوس ہو گئے تھے، ربیع الاول ۱۰ھ میں تین سو سواروں کی حفاظت میں آنحضرت صلعم نے پھر ان کو یمن کے قبیلۂ مذحج میں تبلیغ اسلام کے لیے مامور فرمایا اور ساتھ ہی یہ تاکید فرما دی کہ جب تک وہ حملہ آور نہ ہوں پیش دستی نہ کرنا، حضرت علیؓ جب مذحج کی سرزمین میں پہنچے تو مالگذاری وصول کرنے کے لیے ادھر ادھر لوگوں کو متعین کیا، اسی اثناء میں قبیلۂ مذحج کی ایک جمعیت نظر آئی، حضرت علیؓ نے اسکے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی لیکن ادھر سے اس احسان کا جواب تیر اور پتھر کی زبان سے ملا، یہ دیکھکر حضرت علی نے بھی اپنے ساتھیوں کی صف آرائی کی، مذحج اپنے بیس آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا کہ انکا مقصود صرف مدافعت تھا، اسکے بعد رؤسائے قبیلہ جو حاضر ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا، اور دوسروں کی طرف سے نیابۃً اسلام کا اعلان[2] کیا،)

یمن میں فارس کے جو رؤساء قیام پذیر ہو گئے تھے انکو ابناء کہتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ۱۰ھ میں وبر بن یحنس کو انکے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا، وہ نعمان بن بزرج (بزرگ) کے گھر اس کے بیٹوں کے مہمان ہوئے، اور فیروز دیلمی، مرکبود، وہب بن منبہ کے پاس دعوت اسلام کے خطوط بھیجے، سب نے اسلام قبول کیا،

---

[1] زرقانی نے بسند صحیح از بیہقی، (اصل واقعہ بخاری جز غزوات میں موجود ہے لیکن ہمدان کی اس میں تخصیص نہیں اور نہ انکے اسلام کا اس میں ذکر ہے) اس واقعہ کے متعلق اور بھی روایتیں ہیں لیکن وہ صحیح نہیں، چنانچہ خود مواہب لدنیہ نے تسلیم کیا ہے، ان روایتوں کا یہ مفہوم ہے کہ ہمدان کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے ڈر سے اسلام قبول کر لیا، لیکن یہ راویوں کا حسن ظن ہے واقعہ نہیں (ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ہمدان کو حکم دیا کہ وہ ثقیف سے ہمیشہ لڑا کریں اور ان پر غارت گری کیا کریں، لیکن حافظ ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے ہمدان یمن کا قبیلہ تھا اور ثقیف مکہ کے پاس طائف میں ہے، یہ حکم تو دو ہمسایہ قبیلوں کو دیا جا سکتا تھا، [2] حضرت علی کی مہم یمن کا واقعہ تمام حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل ابن سعد جز مغازی سے ماخوذ ہے)

صحابہ میں سب سے پہلے جس نے قرآن مجید حفظ کیا وہ مرکود کے صاحبزادے عطاؔ، اور وہب بن منبہ[۱] تھے،

(عامِ یمن[۲] میں تبلیغ اسلام کیلئے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری کو مامور فرمایا، دونوں صاحب یمن کے ایک ایک ضلع میں بھیجے گئے، چلتے وقت آپ نے ان لوگوں کو جو باتیں تعلیم فرمائیں وہ درحقیقت اسلامی تبلیغ کے اصول ہیں، آپ نے فرمایا سہولت سے کام کرنا، سخت گیری نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سُنانا، نفرت نہ دلانا، دونوں ملکر کام کرنا، تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے سے کوئی مذہب رکھتے ہیں، جب اُنکے ہاں پہنچنا تو پہلے اُن کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا، جب وہ اُسکو تسلیم کرلیں تو کہنا کہ خدا نے تم پر روز و شب میں پانچ وقت کی نماز بھی فرض کی ہے، جب یہ بھی مان لیں تو اُنکو سمجھانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے، تم میں جو امیر ہوں اُنسے لیکر جو غریب ہیں اُن کو دیدی جائیگی، دیکھو جب وہ زکوٰۃ دینا منظور کرلیں تو چُن کر اچھی اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا، کہ اُس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں"،

حضرت ابو موسیٰ نے پوچھا یا نبی اللہ ہمارے مُلک یمن میں جو اور شہد کی شراب بنتی ہے کیا یہ بھی حرام ہے؟ آپ نے فرمایا، ہر شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے[۳])

نجران (یمن کے پاس ہی نجران کا ضلع ہے، نجران عرب میں عیسائیت کا خاص مرکز تھا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مغیرہ بن شعبہ کو جو صلح حدیبیہ ۶ھ سے پہلے اسلام لا چکے تھے دعوتِ اسلام کے لیے نجران بھیجا، عیسائیوں نے قرآن پر اعتراضات شروع کئے، یہ جواب نہ دے سکے اور واپس چلے آئے[۴]، اُسکے بعد آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دعوت اسلام کا انکو خط بھیجا جس میں تحریر تھا کہ اگر اسلام قبول نہ ہو تو اسلام کی سیاسی اطاعت قبول کرو، اور جزیہ دو[۵]، اہل نجران نے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت کو دریافت حال کے لیے مدینہ بھیجا اس وفد کا تفصیلی بیان آگے آئے گا،

نصاریٰ کے علاوہ نجران میں مشرکین کی بھی کچھ آبادی تھی، ان میں ایک قبیلہ بنو حارث بن ربیعہ تھا،

---

[۱] طبری، صفحہ ۱۷۲۳، [۲] اضافہ تاکھریں، [۳] یہ پورا واقعہ صحیح بخاری جز غزوات میں مذکور ہے، ہم نے بخاری کی مختلف روایتوں کو یکجا کرلیا ہے، [۴] ترمذی تفسیر سورۂ مریم، [۵] زرقانی بحوالہ بیہقی،)

ہمدان نام ایک بت کو پوجتا تھا، اور اسی لیے عبد المدان کے نام سے مشہور تھا ربیع الآخر سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خالد بن ولید کو وہاں دعوت اسلام کے لیے بھیجا، حضرت خالد وہاں پہنچے تو تین دن میں سارا قبیلہ مسلمان ہوگیا، حضرت خالد نے یہاں تھوڑے دن قیام کیا اور قرآن اور احکام اسلام کی تعلیم دی[۱]،

اہل یمن کے لیے دعاے خیر

اہل یمن کا بغیر کسی ترغیب و ترہیب کے خلوص دل سے قبولِ اسلام کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو خاص رحمت الٰہی کا مستوجب نہ ہو، جب اشعریوں کی آمد کی خبر ہوئی تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ کل اہلِ یمن آتے ہیں، جو رقیق القلب اور نرم دل ہیں[۲]" جب ہمدان مسلمان ہوا تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا، اور اُن کو عائے سلامتی کی دُعا دی[۳]" حمیر اور تمیم کا وفد آیا تو آپ نے پہلے تمیم کی طرف خطاب کیا "تمیم! بشارت قبول کرو" تو تمیم نے کہا یا رسول اللہ! ہم نے بشارت تو قبول کرلی کچھ عطا بھی فرمائیے، آپ نے منھ پھیر لیا کہ بشارت سے بڑھکر کیا چیز ہوسکتی تھی، پھر اہلِ یمن کی طرف رخ کرکے فرمایا، اے اہلِ یمن! تمیم نے بشارت قبول نہ کی، تم قبول کرلو، اہل یمن بے اختیار بول اُٹھے، اے خدا کے رسول ہم نے قبول کیا[۴]، پھر آپ نے عام طور سے فرمایا "ایمان یمن کا ایمان ہے، اور دانائی یمن کی دانائی ہے، "

مبلغین یمن یعنی حضرت علیؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰؓ، حجۃ الوداع کے موقع پر یمن سے واپس آئے اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ حج ادا کیا، ان مبلغین کے ساتھ یمن کے بہت سے نومسلم بھی حج و زیارت کو آئے،)

بحرین میں اسلام

| بحرین سنہ | بحرین ایران کی حدود حکومت میں داخل تھا، عرب کے قبائل وادیوں میں آباد تھے، جن میں مشہور اور بااثر خاندان، عبد القیس، بکر بن وائل، اور تمیم تھے، ان میں سے عبد القیس کے قبیلہ میں سے منقذ بن حبان تجارت کے لیے نکلے، راہ میں مدینہ پڑتا تھا، وہاں ٹھہرے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو معلوم ہوا تو اُنکے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی، انھوں نے اسلام قبول کیا، اور سورۂ فاتحہ اور اقرأ سیکھی، آنحضرت

(۱) زرقانی جلد ۳ صفحہ ۱۱۶، (۲) بخاری وفد الاشعریین واہل الیمن، (۳) زرقانی بحوالہ بیہقی، (۴) بخاری کتاب بدء الخلق وقدوم الاشعریین)

نے اُن کو ایک فرمان عنایت کیا، وہ سفر سے واپس گئے تو چند روز تک کسی سے اسکا اظہار نہیں کیا، لیکن اُنکی بیوی نے انکو نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے باپ منذر بن عائذ سے شکایت کی، اُنھوں نے منقذ سے دریافت کیا، بحث و مباحثہ کے بعد منذر بھی مسلمان ہو گئے، اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نامۂ مبارک لوگوں کو سنایا، سبنے اسلام قبول کر لیا[1]،

صحیح بخاری (کتاب الجمعہ) میں روایت ہی کہ مسجد نبوی کے بعد سبسے پہلا جمعہ جس مسجد میں ادا کیا گیا وہ بحرین کی مسجد تھی، جو جواثی میں واقع ہے، اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحرین میں ابتدائی زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی،

اسلام قبول کرنیکے بعد ان لوگوں نے چودہ[۱۴] شخصوں کی ایک سفارت آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بھیجی، جسکے افسر منذر بن الحرث تھے، ان کا قافلہ کاشانۂ نبوت کے قریب آیا تو یہ لوگ اِس قدر بے تاب ہوئے کہ سواریوں سے کود پڑے، اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ چومے، لیکن منذر کو پاسِ ادب ملحوظ تھا، اُنھوں نے قیامگاہ پر جاکر کپڑے بدلے، پھر خدمت میں حاضر ہو کر دست بوسی کی[2]،

سنہ ۸ھ میں آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے علا حضرمی کو تبلیغ اسلام کے لیے بحرین بھیجا، اُس زمانہ میں یہاں ایران کی طرف سے منذر بن ساوی گورنر تھا، اُسنے اسلام قبول کیا اور اُس کے ساتھ تمام عرب اور کچھ عجم جو یہاں مقیم تھے، مسلمان ہو گئے[3]،

بحرین کے علاقہ میں "ہجر" ایک مقام ہی، یہاں ایران کی طرف سے سیبخت حاکم تھا، آنحضرت (صلی اللہ

---

(۱) زرقانی، بحوالۂ کرمانی، قبیلۂ عبد القیس کی ایک سفارت کا ذکر صحیح بخاری میں ہی، اور وہ اس زمانہ کے بعد کی ہی، بخاری کی روایت سے بھی اِس قدر ثابت ہوتا ہے کہ عبد القیس اس سفارت سے پہلے ایمان لا چکے تھے، اصابہ میں اس سلسلہ میں سے جو روایت ہے وہ گو زرقانی کی روایت سے مختلف ہے اور رئیس سفارت کے نام میں اختلاف ہے تاہم اس قدر روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی سفارت چھٹی ہجری سے پہلے کی ہے،

(۲) زرقانی بروایت بیہقی، (۳) بلاذری، فتوح البلدان،

علیہ وسلم) نے اُسکے نام بھی خط بھیجا تھا، اور اُس نے بھی اسلام قبول کیا[۱]،

عمان میں اسلام

عمان ۸ھ اس شہر پر قبیلہ ازد کا قبضہ تھا، اور عبید و جعفر یہاں کے رئیس تھے، ۸ھ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابو زید انصاری کو جو حافظ قرآن تھے اور عمرو بن العاص کو دعوت اسلام کا خط دیکر بھیجا، دونوں رئیسوں نے اسلام قبول کیا اور وہاں کے تمام عرب اُن کی ترغیب سے اسلام لائے[۲]،

حدود شام میں اسلام

عرب شام ۹ھ شام کے اطراف میں جو عرب آباد تھے، اُن میں متعدد ریاستیں تھیں، ان میں سے معان اور اُس کے اضلاع فروۃ بن عمرو کے زیر حکومت تھے، لیکن خود فروۃ رومی سلطنت کی طرف سے گویا گورنر تھے، اُنھوں نے اسلام سے واقفیت پیدا کی تو مسلمان ہو گئے اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں اظہار اسلام کے ساتھ ایک خچر ہدیہ کے طور پر بھیجا، (عیسائی) رومیوں کو اُن کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو اُن کو گرفتار کر کے سُولی دیدی، اُسوقت یہ شعر اُن کی زبان پر تھا[۳]،

بلغ سراۃ المسلمین بانی (مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو
سلم لربی اعظمی ومقامی کہ میرا جسم اور میری عزت سب اپنے پروردگار کے نام پر ہے)

(شام اور عرب کے درمیان، عذرہ، بلی، جذام وغیرہ قبائل آباد تھے، قبیلہ بلی میں حضرت عمرو بن العاص کا ننہال تھا، اس لیے ایک جماعت کے ساتھ اُن اطراف میں بھیجے گئے، جب وہ جذام کے تالاب پر پہونچے تو انکو حملہ کا خوف ہوا در بار نبوت میں اطلاع کی، وہاں سے حضرت ابو عبیدہ کی ماتحتی میں بعض حفاظت کچھ فوج بھیجدی گئی اسی کو اہل سیر کی اصطلاح میں غزوۂ ذات السلاسل کہتے ہیں۔)

---

[۱] فتوح البلدان، ذکر بحرین، [۲] فتوح البلدان، ذکر فتح عمان، [۳] ابن ہشام، اسلام فروۃ، ذکر وفود،

وفودِ عرب

(جن لوگوں نے مبلغین اسلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد خود بارگاہ نبوت میں جاکر اپنے اسلام کا اعلان کرنا چاہا، ارباب سیر "وفود" کے عنوان سے ان کا ذکر کرتے ہیں، اس قسم کے وفود کی تعداد بہت زیادہ ہے، ابن اسحاق نے صرف پندرہ وفود کا حال لکھا ہے، ابن سعد میں ساٹھ وفود کا تذکرہ ہے، دمیاطی مغلطائی زین الدین عراقی بھی یہی تعداد بیان کرتے ہیں، لیکن مصنف سیرت شامی نے زیادہ استقصا کیا ہے، اور ایکسو چار وفود کے حالات بہم پہنچائے ہیں، اگرچہ ان میں کہیں کہیں ضعیف روایتوں سے استناد کیا گیا ہے، اور اکثر وفود کے نام مبہم ہیں، تاہم یہ مسلّم ہے کہ اصل تعداد ابن اسحاق کی روایت سے کہیں زیادہ ہے، حافظ ابن قیم اور قسطلانی نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کی تفصیل کی ہے)

اصل یہ ہے کہ تمام عرب مکہ کے فیصلۂ اخیر کا انتظار کر رہا تھا، مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دار الاسلام میں جاکر کوئی فیصلہ کرے، اہل عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں سر کبھی نہیں کر سکتے لیکن خیبر وغیرہ کی نظیروں سے یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام لائے بغیر وہ محروم نہیں ہیں، بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کرکے اگلی سابق حالت قائم رہ سکتی ہے،

فتح مکّہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہو گئیں اور بجز چند کے باقی جس قدر سفارتیں آئیں انھوں نے بارگاہِ نبوت میں پہنچ کر جو کچھ دیکھا کہ واپس آئے تو ایمان کی دولت سے مالامال آئے،

عرب کے سب سے طاقتور قبیلے جن کا اثر دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا، بنو تمیم، بنو سعد، بنو حنیفہ، بنو اسد، کندہ، سلاطین حمیر، ہمدان، ازد، اور طے، تھے، ان تمام قبائل کی سفارتیں دربار نبوت میں آئیں، ان میں سے بعض ملکی حیثیت رکھتی تھیں یعنی جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ بہ حیثیت فاتح کے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ معاہدہ کر لیں لیکن اکثر اس غرض سے آئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہو کر اُسکے حلقہ میں آجائیں،

یہ وفود زیادہ تر فتح مکہ کے بعد ۸ھ و ۹ھ اور ۱۰ھ میں آئے، لیکن تسلسل بیان کے لئے اس سے پہلے کے چند وفود کا ذکر کرنا بھی موزوں ہوگا،

مزینہ یہ ایک بڑا قبیلہ تھا جو مضر تک پہنچکر قریش کے خاندان سے ملتا ہے، نعمان بن مقرن مشہور صحابی جو فتح مکہ مین قبیلہ مزینہ کے علمبردار تھے، اسی قبیلہ سے تھے، اصفہان انہی نے فتح کیا تھا، ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو شخص قبیلہ کے سفیر بنکر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کیخدمت میں آئے اور اسلام لائے[1]، عراقی نے سیرت منظوم مین لکھا ہے،

اوّل وفد وفد المدینہ — سب سے پہلا وفد جو مدینہ آیا وہ

سنہ خمس وفد وامزینہ — مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ھ میں آیا،

بنو تمیم بنو تمیم کے وفود بڑی شوکت وشان سے آئے، قبیلہ کے تمام بڑے بڑے روسا، مثلاً اقرع بن حابس زبرقان، عمرو بن الاہتم، نعیم بن یزید، سب اس سفارت میں شامل تھے، عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کے حدود تک حملہ آور ہوا کرتا تھا وہ بھی ساتھ تھا،

یہ لوگ اگرچہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے، تاہم عربی فخر وغرور کا نشہ ابھی باقی تھا، دربار نبوت یعنی مسجد نبوی میں پہنچے تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) گھرمین تشریف رکھتے تھے، آستانہ اقدس پر جاکر پکارے کہ محمدا (صلے اللہ علیہ وسلم) باہر آؤ، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) باہر تشریف لائے تو بولے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لئے آئے ہیں کہ تم سے مفاخرہ کریں، آپ نے اجازت دی، عطارد بن حاجب جو مشہور خطیب تھا، اور جسنے نوشیروان کے دربار سے حسن تقریر کے صلہ میں کمخواب کا خلعت حاصل کیا تھا، اٹھا اور اپنی قوم کے مفاخر پر ایک پُرزور تقریر کی جسکا خلاصہ یہ تھا،

خدا کا شکر ہے جس کے الطاف کی بدولت ہم صاحب تاج وتخت، خزانہ ہائے گراں بہا

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ،

کے مالک، اور مشرق میں تمام قوموں سے معزز تر ہیں، ہماری برابری آج کون کرسکتا ہے

ہماری ہمسری کا جسکو دعویٰ ہو وہ یہ خصائص و اوصاف گنائے جو ہمنے گنائے ہیں، "

عطارد خطبہ دیکر بیٹھ گیا، تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ثابت بن قیس کو جواب دینے کا اشارہ کیا،
اُنھوں نے جو تقریر کی اُس کا ماحصل یہ تھا،

" اُس خدا کی تعریف جسنے زمین اور آسمان بنائے، اُسنے ہمکو بادشاہت دی، اور اپنے
بندوں میں سے بہترین شخص کو انتخاب کیا، جو سب سے زیادہ شریف النسب، سب
سے زیادہ راست گفتار سب سے زیادہ شریف الاخلاق تھا، وہ تمام
عالم کا انتخاب تھا، اسلیے خدا نے اس پر کتاب نازل کی، اُسنے لوگوں کو اسلام کی دعوت
دی، تو سب سے پہلے مہاجرین، اور اُنکے بعد ہم (انصار) نے دعوتِ اسلام پر لبیک کہا،
ہم لوگ انصار الٰہی، اور وزرائے رسالت ہیں، "

تقریریں ہوچکیں تو اشعار کی باری آئی، سفارت کی طرف سے تمیم کے مشہور شاعر زبرقان بن بدر نے قصیدہ پڑھا،

نحن الکرام فلا حیٌّ یعادلنا — ہم شریف قوم ہیں، کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہوسکتا،

منّا الملوک وفینا تنصب البیع — ہم میں تخت نشین بادشاہ ہیں ہم کلیساؤں کے بانی ہیں،

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مدینہ میں آکر خطبہ دیا تو اسکی خوبی تقریر نے تمام حاضرین کو حیرت زدہ بنادیا
اسوقت آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "ان من البیان لسحرا" یعنی بعض بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے،
اصابہ فی احوال الصحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے زبرقان ہی کی تقریر پر یہ الفاظ ارشاد
فرمائے تھے، غرض جب زبرقان تقریر کرچکے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دربار رسالت کے شاعر یعنی حسّان
بن ثابت کیطرف دیکھا، اُنھوں نے برجستہ کہا،

ان الذوائب من فہر واخوتہم — شرفائے قبیلہ فہر و برادران فہر نے لوگوں کو

فی سمو اسمۃ للناس سمعوا — وہ راستہ بتا دیا ہے جسکی وہ پیروی کرتے ہیں،

ارکان سفارت میں اقرع بن حابس عرب کا مشہور حکم تھا یعنی قومی مقدمات کا مرافعہ اُسکے پاس جاتا تھا اور اُس کے فیصلوں پر لوگ گردن جھکا دیتے تھے، وہ اسلام لانے سے پہلے مجوسی تھا، اُسکو یہ دعویٰ تھا کہ جب سفارت کے ساتھ دربار رسالت میں آیا تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) سے کہا[۱]،

ان حمدی لزین وان — میں جس کی تعریف کردوں وہ چمک جاتا ہے

ذمی لشین، — اور جسکو بُرا کہدوں اسکو داغ لگ جاتا ہے،

نظم ونثر کی معرکہ آرائی ہوچکی تو سفارت نے اعتراف کیا کہ دربار رسالت کے خطیب اور شاعر دونوں ہمارے شاعر اور خطیب سے افضل ہیں، پھر سب نے اسلام قبول کیا،

بوسعد — بوسعد نے ضمام بن ثعلبۃ کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ جسطرح آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں آئے، اور جس طریقہ سے سفارت ادا کی، اُس سے عرب کی اصلی سادگی اور آزادروی کا اندازہ ہوسکتا ہے، صحیح بخاری میں متعدد موقعوں پر اس کا ذکر ہے، کتاب العلم کی روایت حسب ذیل ہے،

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہملوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے، ایک شخص ناقہ پر سوار آیا، اور صحن مسجد میں آکر ناقہ سے اُترا، پھر حاضرین سے پوچھا "محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کس کا نام ہے؟ لوگوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ گورے رنگ کے جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں" پاس آکر کہا اے عبدالمطلب کے بیٹے" آپنے فرمایا کہ "میں جواب دیچکا" بولا کہ میں تمسے کچھ باتیں پوچھوں گا، لیکن سختی سے پوچھوں گا، اِس پر ناراض نہونا،" ارشاد ہوا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو" بولا کہ اپنے خدا کی قسم کھاکر کہو، کیا تمکو خدا نے تمام دنیا کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے" آپ نے فرمایا "ہاں" پھر قسم دلاکر پوچھا کہ کیا تمکو خدا نے پنجوقتہ نماز کا حکم دیا ہے؟" اِسی طرح زکوۃ، روزہ، حج کی نسبت پوچھا اور آپ برابر "ہاں" فرماتے جاتے تھے، جب سب احکام سُن لیے تو کہا کہ "میرا نام ضمام بن ثعلبۃ ہے،

[۱] اصابہ تذکرہ اقرع بن حابس،

اور مجھکو میری قوم نے بھیجا ہے، میں جاتا ہوں، اور جو تم نے بتایا ہے میں اس سے ایک ذرہ نہ زیادہ کروں گا، نہ کم"
وہ جا چکا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ سچ کہتا ہے تو اسے فلاح پائی[1]"

ضمام نے واپس جا کر اپنی قوم سے کہا کہ لات و عزیٰ کوئی چیز نہیں" لوگوں نے کہا، کیا کہتے ہو تمکو جنون یا جذام ہو جائے" انھوں نے کہا، خدا کی قسم وہ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، میں تو خدا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاتا ہوں" انکی مختصر تقریر کا یہ اثر تھا کہ شام نہیں ہونے پائی تھی کہ قبیلہ کا قبیلہ زن و مرد بچے سب مسلمان[2] تھے،

اشعریین ۵ھ | یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ اشعریین کا تھا، ابو موسیٰ اشعری اسی قبیلہ سے ہیں، ان لوگوں نے جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کی خبر سنی تو ترپن[3] شخصوں نے مدینہ کی ہجرت کا قصد کیا، اسی قافلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری بھی تھے، یہ لوگ جہاز میں سوار ہو کر چلے، لیکن ہوائے مخالف نے جہاز کو حبش میں پہنچا دیا، وہاں حضرت جعفر طیار موجود تھے، وہ اپنے ساتھ لیکر عرب کو روانہ ہوئے، اس زمانہ میں خیبر فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یہیں تشریف فرما تھے، چنانچہ یہیں لوگوں نے شرف باریابی حاصل کیا،

یہ صحیح مسلم (فضائل اشعریین) کی روایت ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ سے فرمایا کہ تمھارے ہاں یمن کے لوگ آتے ہیں جو نہایت رقیق القلب اور نرم دل ہیں،

مسند احمد بن حنبل میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب اشاعرہ کا وفد آیا تو یہ لوگ جوش مسرت سے یہ رجز پڑھتے تھے،

غداً نلقی الاحبّة	(کل ہم دوستوں سے ملیں گے یعنی
محمدًا وحزبه	محمدؐ اور پیروان محمدؐ سے)

(بارگاہِ نبوت میں پہنچے، تو عرض کی۔ یا رسول اللہ ہم اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنے مذہب کے کچھ احکام سیکھیں،

[1] یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں منقول ہے، [2] ابن ہشام،

اور ابتدائے کائنات کے کچھ حالات پوچھیں، آپ نے فرمایا "پہلے خدا تھا اور کچھ نہ تھا، اور اُس کا تخت پانی پر تھا"[1]

دوس ۵ھ دوس عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، حضرت ابوہریرہؓ اسی قبیلہ سے ہیں، اس قبیلہ کے مشہور شاعر اور رئیس طفیل بن عمرو تھے، وہ ہجرت سے پہلے مکہ گئے، قریش نے اُن کو منع کیا تھا کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس نہ جائیں، لیکن اتفاقاً ایک دفعہ یہ حرم میں گئے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھ رہے تھے، قرآن مجید سنکر متاثر ہوئے، اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ آپ مجھکو اسلام کی حقیقت سمجھائیں، آپ نے اسلام کی تبلیغ کی، اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، وہ نہایت خلوص سے اسلام لائے، وطن جاکر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، لیکن اُنکے قبیلہ میں زنا کا بہت رواج تھا، لوگ سمجھے کہ اسلام کے بعد اس آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اس لئے لوگوں نے تامل کیا، طفیل نے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کیخدمت میں آکر یہ حقیقت بیان کی، آپ نے دعا فرمائی کہ خدایا! دوس کو ہدایت دے، پھر طفیل سے ارشاد فرمایا کہ جاکر نرمی اور ملاطفت سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو، غرض (دعائے نبوی کی برکت اور طفیل کی ترغیب اور ہدایت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، اور اسی خاندان جس میں حضرت ابوہریرہ بھی تھے، ہجرت کرکے مدینہ میں چلے آئے[2]،

بنوحرث بن کعب ۹ھ یہ نجران کا ایک نہایت معزز خاندان تھا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے حضرت خالدؓ کو انکے پاس دعوت اسلام کے لئے بھیجا، یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ اسلام لائے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان لوگوں کو مدینہ میں بُلا بھیجا، چنانچہ قیس بن الحصین و یزید بن عبدالمدان وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں حاضر ہوئے، چونکہ اکثر معرکوں میں قبائل عرب پر غالب رہے تھے، آپ نے ان سے پوچھا کہ تمھارے غلبہ کے کیا اسباب تھے، بولے کہ ہم ہمیشہ متفق ہوکر لڑتے تھے، اور کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے، آپ نے قیس کو انکا رئیس مقرر کیا[3]،

قبیلۂ طے ۹ھ یمن میں طے نہایت نامور قبیلہ تھا، اِس قبیلہ کے روساء زید الخیل و عدی بن حاتم طائی تھے،

(۱) صحیح بخاری باب بدء الخلق، (۲) اصابہ و زاد المعاد (۳) ایضاً

اور اُنکے حدود حکومت الگ تھے

زید، زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر، خطیب، خوش جمال فیاض اور بہادر تھے ۹ھ میں یہ چند معزز اشخاص کے ساتھ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپنے اُن کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے مع اپنے ساتھیوں کے نہایت صدق دل سے اسلام قبول کیا، شہسواری کی وجہ سے یہ زید الخیل کے لقب سے مشہور تھے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس لقب کو زید الخیر سے بدل دیا[۱]،

عدی بن حاتم ۹ھ | عدی، مشہور حاتم طائی کے بیٹے اور قبیلۂ طے کے (سردار اور مذہبا عیسائی تھے) سلاطین عرب کی طرح انکو بھی آمدنی کا چوتھا حصّہ ملتا تھا، جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں، یہ بھاگ کر شام چلے گئے، انکی بہن گرفتار ہوکر مدینہ مین آئین، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے انکو بڑی عزت وحرمت سے رخصت کیا، وہ اپنے بھائی کے پاس گئیں اور کہا کہ جسقدر جلد ہوسکے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں اُن کے پاس جانا مفید ہے، غرض عدی مدینہ آئے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مسجد مین تھے، عدی نے مسجد میں جاکر سلام کیا، آپنے جواب سلام کے بعد نام پوچھا، پھر انکو لیکر گھر کی طرف چلے، اسی اثناء میں ایک بڑھیا آگئی، اُسنے آپ کو روک لیا، اور دیر تک آپسے کسی کام کے متعلق باتیں کرتی رہی، عدی خود رئیس تھے، شام میں رومیوں کا دربار دیکھا تھا، انکو حیرت ہوئی کہ شہنشاہ عرب ایک بڑھیا کے ساتھ اس مساوات سے پیش آتا ہے، اُسی وقت انکو خیال ہوا کہ یہ شخص بادشاہ نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے، چمڑے کا ایک گدا تھا، اُسکو عدی کی طرف بڑھایا، یہ اصرار کے بعد اُس پر بیٹھے، پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیوں عدی تم اپنی قوم سے مرباع لیتے تھے، لیکن یہ تو تمھارے مذہب (نصرانیت) میں جائز نہیں[۲]، پھر فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ بولے کہ نہیں، پھر پوچھا کہ خدا سے کوئی بڑا ہے؟ بولے کہ نہیں، آپنے فرمایا کہ یہودیوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے، اور عیسائی گمراہ ہوگئے ہین[۳]،

---

[۱] اصابہ وزاد المعاد [۲] ابن ہشام اسلام عدی بن حاتم [۳] مسند امام احمد حدیث عدی و ترمذی تفسیر فاتحہ،

غرض عدی نے اسلام قبول کیا، اور اسقدر ثابت قدم رہے کہ ردۃ کے زمانہ میں بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑا، باپ کی سخاوت کا اثر ان میں بھی تھا، ایک دفعہ ایک شخص نے اِن سے سو روپیے طلب کئے بولے کہ تم حاتم کے بیٹے سے اس قدر حقیر رقم مانگتے ہو، بخدا ہرگز نہ دونگا،[1]

وفد ثقیف (یاد ہوگا کہ) جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) طایف کا محاصرہ چھوڑکر روانہ ہونے لگے تو صحابہ نے عرض کی تھی کہ آپ اسکے حق میں بددعا فرمائیں، آپ نے جن لفظوں میں دعا فرمائی تھی یہ تھی،

اَللّٰھمّ اھد ثقیفا وائت بھم — اے خدا ثقیف کو ہدایت دے اور انکو میرے پاس بھیج،

(یہ دعا کرشمۂ ربانی کا ایک اعجاز تھی، وہ قبیلہ جو تلوار سے زیر نہ ہوا، صداقت کے جلال نے آستانۂ اسلام پر اسکی گردن جھکا دی،)

طائف دو رئیسوں کے قبضہ میں تھا، جنمیں ایک عروۃ بن مسعود تھے، جنکی نسبت کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ کلام الٰہی اترتا تو ان پر اُترتا، عروۃ اگرچہ اسوقت تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن مادہ قابل رکھتے تھے، حدیبیہ کی صلح بھی انہی کی سفارت سے انجام پائی تھی، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) جب طائف سے واپس چلے تو خدا نے انکو اسلام کی توفیق دی، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) مدینہ نہیں پہنچنے پائے تھے کہ وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لاکر واپس گئے، واپس جاکر انھوں نے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اسلام کی ترغیب دی، لوگوں نے انکو بہت بُرا بھلا کہا، صبح کو جب اپنے بالاخانہ پر اذان دی تو ہر طرف سے تیروں کا مینھ برسا، یہانتک کہ وہ شہید ہوگئے، مرتے وقت وصیت کی کہ محاصرۂ طائف میں جو مسلمان شہید ہوچکے ہیں اُنہی کے پہلو میں دفن کئے جائیں،

(عروہ کا خون رائگاں نہیں جاسکتا تھا، صخر بن عیلہ رئیس احمس یہ سنکر کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) طائف کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں، کچھ سوار لیکر چل کھڑا ہوا تھا، اتفاق سے اُس وقت پہنچا جب آپ طایف چھوڑکر

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عدی

مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہل طائف آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت قبول نہ کرلیں گے، مین قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑون گا، آخر اہلِ طائف نے اطاعت قبول کرلی، صخر نے خدمتِ نبوی میں اطلاع کی، تو آپ نے مسجد نبوی مین تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لیے دس بار دعا فرمائی، [1]

چند روز کے بعد اہل طائف نے باہم مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لاچکا، اب ہم اکیلے کیا کرسکتے ہین، غرض یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کرکے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بھیجے جائین،

اُنکی سفارت نے مدینہ کا رُخ کیا تو مسلمانوں کو اس قدر مسرت ہوئی کہ سب سے پہلے مغیرہ بن شعبہ دوڑے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جاکر خبر کریں، راہ میں حضرت ابوبکرؓ مل گئے انکو معلوم ہوا تو مغیرہ کو قسم دلائی کہ یہ خوشخبری مجھکو پہنچانے دو،

مغیرہ نے اِن لوگون کو تعلیم دی کہ دربار رسالت مین جانا تو اس طریقہ سے سلام عرض کرنا، لیکن یہ لوگ اُسی قدیم دستور کے موافق آداب بجالائے،

عبد یالیل، طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اُس کو (حالانکہ اب تک وہ کافر تھا) مسجد نبوی میں اُتارا (کہ مسلمانون کی محویت و استغراق کو دیکھ کر متاثر ہو) [2] یہ لوگ صحن مسجد مین خیمے نصب کراکر ٹھہرائے گئے، نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے، گو خود شریک نہین ہوتے تھے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا معمول تھا کہ خطبوں میں اپنا نام نہیں لیتے تھے، ان لوگون نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمسے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے سُنا تو فرمایا کہ "مین سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ مین فرستادۂ الٰہی ہون"

جماعت سفراء مین عثمان بن ابی العاص سب سے کم عمر تھے، سفراء دربار نبوی میں آتے تو انکو بچہ سمجھکر قیامگاہ میں چھوڑ آتے، عثمان گو کمسن تھے، لیکن سب سے زیادہ تیز فہم اور مائل تحقیق تھے، انکا معمول تھا کہ جب سفراء دن کو

---

[1] ابو داؤد باب اقطاع الارضین، [2] ابو داؤد، باب ماجاء فی خبر الطائف،

قیلولہ کرتے تو یہ جیکے سے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید اور مسائل اسلام سیکھتے یہانتک کہ اکثر ضروری مسائل سیکھ لیئے،

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) ہمیشہ ان لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے (نماز عشا کے بعد انکے پاس تشریف لیجاتے اور کھڑے کھڑے اُن سے باتیں کرتے، زیادہ تر مکہ میں قریش کے ہاتھ سے جو اذیتیں اٹھائی تھیں اُنکو بیان فرماتے مدینہ میں آکر جو لڑائیاں پیش آئیں، اُنکا بھی تذکرہ فرماتے[1]) بالآخر اُن لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن تین شرطیں پیش کیں،

۱- زنا ہمارے لیے جائز رکھی جائے، کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرّد رہتے ہیں، اور اسلیئے اُن کو اس سے چارہ نہیں

۲- ہماری قوم کا تمام کاروبار اور ذریعۂ معاش سود ہے، اسلیئے سودخواری جائز رکھی جائے،

۳- شراب سے نہ روکا جائے، ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے۔

لیکن یہ تینوں درخواستیں نامنظور ہوئیں، بالآخر ان لوگوں نے کہا اچھا ہم یہ شرطیں واپس لیتے ہیں لیکن ہمارے معبود (طائف کا سب سے بڑا بت، جسکا نام لات تھا) کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ آپنے فرمایا کہ وہ توڑ دیا جائیگا، یہ سنکر اُن کو سخت حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص اُنکے خدائے اعظم کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے بولے کہ اگر ہمارے معبود کو معلوم ہو جائے کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ تمام شہر کو تباہ کر دیگا، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا بولے کہ تم لوگ کسقدر جاہل ہو، بت صرف ایک پتھر ہے، ان لوگوں نے کہا، عمر! ہم تمہارے پاس نہیں آئے، یہ کہکر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی کہ ہم بت کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، آپ جو چاہیں کریں، لیکن ہمکو اس حرارت سے معاف رکھا جائے، آپنے یہ درخواست منظور کی[2]،

اِن لوگوں نے نماز، زکوۃ، اور جہاد سے مستثنےٰ ہونے کی بھی درخواست کی، نماز سے معافی تو کسی حالت

[1] (ابوداؤد، باب تحزیب القرآن) [2] زاد المعاد، بحوالہ مغازی موسےٰ بن عقبہ

مین ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے، اور جہاد فرض کفایہ ہے، ہر شخص پر واجب نہیں، اور واجب بھی ہو تو اُسکے خاص مواقع ہیں، روز کا کام نہیں، اس بنا پر اُسوقت ان دونوں باتوں پر انکو مجبور نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو رفتہ رفتہ خود ان میں صلاحیت آجائیگی، حضرت جابر سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہتے سنا کہ جب یہ ایمان لاچکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے، اور جہاد بھی کرینگے[1] (چنانچہ دو ہی برس کے بعد حجۃ الوداع کا موقع آیا تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جسنے اسلام نہ قبول کرلیا ہو[2]۔)

سفارت جب واپس چلی تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ابوسفیان اور مغیرۃ بن شعبۃ کو بھیجا کہ شرط کے موافق طائف کے صنم اعظم (لات) کو جاکر توڑ آئیں، مغیرۃ نے طائف پہنچکر بتکدہ کو ڈھانا چاہا تو مستورات روتی ہوئی ننگے سر گھرون سے نکل آئیں جو یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں[3]۔

الا ابکین دفّاع (لوگوں پر رو، کہ پست ہمتوں

اسلمہا الرضّاع نے اپنے بتوں کو دشمنوں کے

لم یحسنوا المصاع سپرد کردیا، اور معرکہ آرائی نہ کرسکے

(عربوں مین کثیر الازدواجی کی عام عادت تھی، قبیلۂ ثقیف کے ایک نامور سردار غیلان بن سلمہ کی دس بیویان تھیں، جب وہ مسلمان ہوا احکام اسلام کے مطابق چار کے سوا تمام بیویون سے اُس کو مفارقت کرنی پڑی[4]،)

وفد نجران ۹ھ

نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع کا نام ہے، جہان عیسائی عرب آباد تھے، یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا، جسکو وہ کعبہ کہتے تھے، اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے، اُس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے، جنکا لقب سیّد اور عاقب تھا، عرب مین عیسائیون کا کوئی مذہبی

[1] ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ، باب ماجاء فی خبر الطائف [2] (اصابہ ترجمہ حسن بن حیہ ثقفی) [3] تاریخ طبری [4] (جامع ترمذی و ابوداؤد کتاب النکاح)

مگر اس کا ہمسر نہ تھا، اعشیٰ اسی کی شان میں کہتا ہے،

وکعبۃ نجران حتم علیک | حتی تناخی بابوابھا

نزور یزید و عبد المسیح | وقیسا ھم خیر اربابھا

یہ کعبہ، تین سو کھالوں سے گنبد کی شکل میں بنایا گیا تھا، جو شخص اُسکے حدود میں آجاتا تھا وہ مامون ہوجاتا تھا، اس کعبہ کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی[۱]،

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اِن کو دعوت اسلام کا خط لکھا تو اُس کعبہ کے محافظ، اور ائمۂ مذہب ساٹھ آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آئے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے انکو مسجد مین اُتارا، تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آیا تو ان لوگوں نے نماز پڑھنی چاہی، صحابہؓ نے روکا لیکن آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ پڑھنے دو، چنانچہ اِن لوگون نے مشرق کی طرف مُنھ کرکے نماز ادا کی، ابوحارثہ جو لارڈ بشپ تھا نہایت محترم اور فاضل شخص تھا قیصر روم نے اُسکو یہ منصب عطا کیا تھا اور اُسکے لیے گرجے اور معبد بنوائے تھے[۲]

ان لوگون نے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) سے مختلف مذہبی مسائل پوچھے اور آپ نے وحی کی رُو سے اِن کا جواب دیا۔

ان کے زمانۂ قیام میں سورۂ آل عمران کی ابتدا کی اسّی آیتین اُترین، ان آیتون مین اُنکے سوالات کا جواب تھا، جس آیت میں دعوتِ اسلام کی تشریح تھی وہ یہ ہے،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	کہدے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کو مان لیں جو ہم
أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ	تم دونوں میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا	اور کسیکو خدا کا شریک نہ بنائیں، اور ہم میں کوئی کسیکو خدا کے سوا رب قرار دے
اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ، (آل عمران)	پھر اگر یہ لوگ نہ مانیں تو کہدو کہ تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں،

[۱] یہ تمام تفصیل معجم البلدان میں ہے، ہلا معرہ فتح الباری سے ماخوذ ہے، جہاں وفد نجران کا ذکر ہے [۲] زاد المعاد ابن قیم،

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے جب انکو اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا، ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ جب تک تم صلیب پوجتے ہو، عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو، کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو؟ جب یہ لوگ اِس پر راضی نہ ہوئے تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے وحی کے مطابق اِن سے کہا کہ اچھا مباہلہ کر لو یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل و عیال لیکر آئیں اور دعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو، اُس پر خدا کی لعنت ہو،

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ ۝ (آل عمران)

تو جو شخص تجھسے علم آئے پیچھے جھگڑا کرتا ہے، اُس سے کہدے کہ آؤ اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو بُلائیں پھر مباہلہ کریں اور خدا سے دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو،

لیکن جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) حضرت فاطمہ زہرا، اور امام حسن و حسین علیہما السلام کو لیکر مباہلہ کے لیے نکلے، تو خود اُنکی جماعت میں سے ایک شخص نے رائے دی کہ مباہلہ نہیں کرنا چاہیے، اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے تو ہم لوگ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے، غرض اِن لوگوں نے کچھ سالانہ خراج قبول کر کے صُلح کر لی،

بنو اسد، ۹ھ یہ وہ قبیلہ ہے جو لڑائیوں میں قریش کا دست و بازو تھا، طلیحہ بن خویلد جس نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اسی قبیلہ سے تھا، ۹ھ میں یہ لوگ بھی اسلام لائے، اور بشارت بھیجی لیکن ابتک اُن کے دماغ میں فخر کا نشہ باقی تھا، سفرا دربار رسالت میں آئے تو احسان کے لہجہ میں کہا کہ آپ نے ہمارے پاس کوئی مہم نہیں بھیجی بلکہ ہمنے خود اسلام قبول کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدٰىكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۝ (سورۂ حجرات)

یہ لوگ تیرا احسان رکھتے ہیں کہ ہم اسلام لائے، کہدو کہ مجھپر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ خدا تیرا احسان رکھتا ہے کہ تمکو ایمان لانے کی ہدایت کی، اگر تم سچے ہو۔

بنو فزارہ ۹ھ یہ نہایت سرکش اور زور آور قبیلہ تھا، عیینہ بن حصن اسی قبیلہ سے تھے، اس قبیلہ نے

رمضان سنہ ۹ھ میں جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) تبوک سے واپس تشریف لائے، اپنا وفد بھیجا، اور اسلام قبول کیا[۱]،

کندہ سنہ ۱۰ھ یہ حضرموت (یمن) کے اضلاع میں سے ایک شہر تھا، یہاں کندی خاندان کی سلطنت تھی، اس زمانہ میں اس خاندان کے حاکم اشعث بن قیس تھے، یہ سنہ ۱۰ھ میں اسی سواروں کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے، حبرہ کی چادریں جنکے سنجاف حریر کے تھے کاندھوں پر ڈالے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے، یہ پہلے اسلام قبول کرچکے تھے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے انکو دیکھکر فرمایا "کیا تم اسلام نہیں لاچکے"؟ بولے "ہاں" آپ نے فرمایا کہ "پھر یہ حریر کیسا"؟ ان لوگوں نے فوراً چادریں پھاڑ کر زمین پر ڈالدیں[۲]،

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنی بہن (ام فروۃ) سے انکی شادی کردی تھی، نکاح ہوچکا تو فوراً اٹھکر اونٹوں کے بازار میں پہنچے اور جو اونٹ سامنے آیا، تلوار سے اُسکی کوچیں اڑادیں، تھوڑی دیر میں بیسوں اونٹ زمین پر پڑے تھے، لوگوں کو حیرت ہوئی اُنھوں نے کہا، میں اپنی دارالریاست میں ہوتا تو اور ہی سروسامان ہوتا، یہ کہکر اونٹوں کے دام دیدیئے اور لوگوں سے کہا یہ آپ کی دعوت ہے[۳]،

یہ جنگ قادسیہ ویرموک میں شریک تھے، اور صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے،

عبدالقیس یہ قبیلہ جیسا کہ اوپر گذرچکا، بحرین کا باشندہ تھا، یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا، سب سے پہلے اس قبیلہ کے تیرہ آدمی سنہ ۵ھ میں یا اُس سے آگے پیچھے زمانہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ عرض کی، یارسول اللہ! ہم خاندان ربیعہ سے ہیں، فرمایا "مرحبا لاخزایا ولا ندامی" پھر ان لوگوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہمارا ملک بہت دور ہے (بحرین) اور بیچ میں کفار مضر کی آبادیاں ہیں، ہم اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں نہیں آسکتے، چند ایسی باتیں تلقین فرمائیے، جن پر ہمیشہ عمل کریں، اور اپنے اہل وطن کو بھی انکی تعلیم دیں، ارشاد ہوا کہ میں تمکو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں، خدا کو ایک جانو، نماز پڑھو، روزہ رکھو، اور خمس دو، اور چار

---

۱ زرقانی ۲ ابن ہشام وفد کندہ ۳ اصابہ،

چیزوں سے منع کرتا ہوں، دُبّا، حنتم، نقیر، مزفّت،

دُبّا، حنتم، نقیر، مزفّت، یہ عرب میں چار قسم کے برتن ہوتے تھے جنہیں رکھکر شراب بنائی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف یہ جاری تھی کہ جس قبیلہ میں جو مخصوص عیوب ہوتے تھے اُن کے پند و موعظت میں انہیں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ حضور نے ان ظروف کا کیوں مخصوص طور سے ذکر فرمایا، چنانچہ انہوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ نقیر کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟ ارشاد فرمایا، ہاں کھجور کی موٹی لکڑی کو اندر سے کھود کے تم اس میں پانی ڈالتے ہو، جب اُبال کم ہوجاتا ہے تو اُسکو پی کر اپنے بھائیوں پر تلوار چلاتے ہو، اتفاق یہ کہ وفد میں ایک صاحب ایسے تھے جن پر یہی واقعہ گذرا تھا، انکی پیشانی پر تلوار کا داغ بھی تھا، اور اُسکو وہ شرم سے چھپائے[1] تھے،

بعض روایتوں میں ہے کہ عبد القیس نے خود پوچھا[2] تھا کہ یا رسول اللہ ہمکو کیا پینا چاہیے؟ اسکے جواب میں آپ نے ان چاروں چیزوں کا ذکر فرمایا[3]،

> بنو عامر بن صعصعہ ۹ھ

(بنو[4] عامر کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ قیس عیلان کی شاخ تھا، بنو عامر میں اُسوقت تین رئیس تھے، عامر بن طفیل، اربد بن قیس، اور جبّار بن سلمیٰ، عامر اور اربد صرف حصول جاہ کے خواہاں تھے، یہ عامر وہی شخص تھا جو اس سے پہلے متعدد قتلوں کا باعث ہوچکا تھا، اور اس وقت بھی شر کی نیت سے آیا تھا، جبّار اور قبیلہ کے عام لوگ البتہ خلوص قلب سے صداقت کے طالب تھے،

عامر مدینہ پہنچکر خاندان سلول کی ایک خاتون کا مہمان ہوا، جبّار اور مشہور صحابی کعب بن مالک میں پہلے کے مراسم تھے، اسلیے وہ تیرہ آدمیوں کے ساتھ انہیں کے گھر مہمان اُترے اور اسی تقریب سے کعب انکو لیکر حضرت

---

[1] صحیح بخاری وصحیح مسلم باب الایمان [2] صحیح مسلم باب الایمان، [3] بخاری مسلم اور دیگر کتب صحاح میں عبد القیس کے اسی وفد کا ذکر ہے، ابن مندہ و دولابی وغیرہ نے اس قبیلہ کے ایک اور وفد کا ذکر کیا ہے جسمیں ۴۰ آدمی شریک تھے، اس بنا پر علامہ قسطلانی نے اسی قبیلہ کے دو وفد قرار دیے ہیں، پہلا تقریباً ۵ھ میں اور دوسرا ۹ھ میں، حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی میں بعینہٖ یہی تحقیق کی ہے لیکن کتاب الایمان کی شرح میں دونوں روایتوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، [4] اصابہ ۱۲

اقدس مین حاضر ہوئے، سو عامر نے سلسلۂ کلام میں آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) سے خطاب کر کے کہا "انت سیدنا" حضور ہمارے آقا ہیں، آپ نے فرمایا "السید اللہ" آقا خدا ہے، اُنھوں نے پھر عرض کی، حضور ہم مین سے افضل اور سب سے بڑھکر فیاض ہیں، ارشاد ہوا، بات بولو تو اس کا لحاظ رہے کہ شیطان تم کو بہکا نہ لیجائے، یعنی یہ تکلف اور تملق بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے[1]،

عامر بن طفیل نے کہا، محمد تین باتین ہیں، اہل بادیہ پر تم حکومت کرو، اور شہر میرے قبضہ مین ہوں، اگر یہ نہین تو اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بناجاؤ، اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو میں غطفان کو لیکر چڑھ آؤنگا، عامر نے اربد کو یہ سمجھا دیا تھا کہ میں اِدھر محمد کو باتوں مین لگاؤں گا اُدھر تم ان کا کام تمام کردینا، اب عامر نے جو دیکھا تو اربد مین جنبش تک نہ تھی؛ سوت کے غیر مرئی جاہ وجلال نے اُسکی آنکھیں خیرہ کردی تھیں، دونوں اُٹھکر چلے آئے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "خدایا اُنکے شر سے بچانا" عامر کو طاعون ہوگیا، عرب میں صاحب فراش ہونا شرم کی بات تھی؛ عامر نے کہا مجھے گھوڑے پر بٹھا دو، گھوڑے پر بٹھا دیا گیا، اور اسی پر اُس نے دم توڑا،

حسان اور عام اشخاص ایمان کی دولت سے مالا مال ہوکر دارالاسلام سے واپس آئے[2]،

حمیر وغیرہ کی سفارت حمیر میں مستقل سلطنت نہیں رہی تھی، سلاطین حمیر کی اولاد نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلی تھیں اور یہ اپنے نام بادشاہ کہلاتے تھے، عربی میں اُنکا لقب قیل تھا، یہ لوگ خود نہیں آئے، لیکن قاصد بھیجے کہ ہمنے اسلام قبول کرلیا ہے،

اسی زمانہ مین بہراء، سوکا، وغیرہ کی سفارتیں بھی آئیں،

---

(۱) مشکوۃ باب المفاخرت، بحوالہ ابوداؤد (۲) عام واقعات ابن اسحاق وزرقانی سے ماخوذ ہیں، عامر کی تقریر اور اُسکی موت کا واقعہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔)

تاسیسِ حکومتِ الٰہی

استخلاف فی الارض

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ

(تیرہ و تار راتوں کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے، گھنگھور گھٹائیں جب چھٹ جاتی ہیں تو خورشید تاباں ضیا گستری کرتا ہے، دنیا گنہگاریوں اور ظلم و ستم کی تاریکیوں سے گھری ہوئی تھی کہ دفعتہ صبح سعادت نے ظہور کیا، اور حق و صداقت کا آفتاب پرتو افگن ہوا، عرب جس طرح ایک خدا کو پوجنے لگا تھا، اب وہ صرف ایک ہی حکومت کے ماتحت تھا،

خدائے پاک نے وعدہ فرمایا تھا،

وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور)

خدا نے تم میں سے ایمان داروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا ہے کہ انکو زمین میں اسی طرح خلافت عطا کریگا جس طرح کہ گذشتہ امتوں کو اُسنے ایسی خلافت عطا کی تھی، اور اُنکے اس مذہب کو جسکو اُسنے انکے لیے پسند کیا ہے یقینا قوت دیگا، اور اُنکی بے امنی کو امن سے بدل دیگا کہ مجھکو پوجیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں،

حکومت الٰہی و استخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں، لیکن جب دعوت الٰہی سیاست مُلکی کی دیواروں سے آکر ٹکراتی ہے یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی و انتشار حال کے کانٹوں میں الجھ جاتا ہے تو پیغمبر ابراہیم[1] اور موسیٰ[2] کے قالب میں آگے بڑھتا ہے، اور قوم و مُلک کو نمارده و فراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے،

[1] اصحاح ۱۵ حضرت ابراہیم اپنے قبیلہ کے شیخ تھے، چارسو غلاموں کی فوج ساتھ رہتی تھی، شام و اطراف بابل کے کئی بادشاہوں سے انکو لڑنا پڑا، اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ انکی اولاد کو ارض مقدس کی حکومت عطا کریگا، (توراۃ، سفر تکوین)

پیغمبروں میں عیسیٰ اور یحییٰ بھی گذرے ہیں جنکو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا، اور موسیٰ اور داؤد و سلیمان بھی، جو قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک تھے، لیکن محمد رسول اللہ عیسےٰ و یحییٰ بھی تھے، اور موسیٰ و داؤد بھی، عرب کے خزانے دست تصرف میں تھے لیکن کاشانہ نبوت میں نہ کوئی نرم بستر تھا، نہ غذائے لطیف، نہ جسم مبارک پر خلعت شاہانہ تھا، نہ جیب و آستین میں درہم و دینار، عین اسوقت جب اُس پر کسریٰ و قیصر کا دھوکا ہوتا تھا، وہ گلیم پوش، بکہ کا یتیم، اور آسمان کا معصوم فرشتہ نظر آتا تھا

اسلام کی حکومت کی غرض وغایت جسکو خدا نے خود اپنے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے، یہ تھی،

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ط وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ط إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ، الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ،

(سورہ حج)

مسلمان جن سے (بلاسبب) جنگ کیجاتی ہے، اب اُن کو بھی جنگ کی اجازت دیگئی کہ وہ مظلوم ہیں، اور خدا انکی مدد پر قادر ہے، وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، سوا اسکے ان کا کوئی اور قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے، اگر دنیا میں ایک قوم کو دوسری قوم سے بچایا نہ جائے تو بہت سی خانقاہیں، کلیسے، عبادتگاہیں مسجدیں جنمیں اکثر خدا کا نام لیا جاتا ہے، برباد کردی جائیں، جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اُسکی مدد کرتا ہے، خدا طاقتور اور غالب ہے، (مسلمان) وہ ہیں جنکو اگر خدا زمین میں قوت عطا کرے تو عبادت الٰہی کریں، مستحقین کی مالی اعانت کریں (زکوٰۃ) لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں انجام کار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے

ان آیتوں میں مالاجمال یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غزوات کی ابتدا کیوں، اور کیونکر ہوئی؟ اسلام کی حکومت

کے کیا اغراض ومقاصد تھے، اور استخلاف فی الارض کے کیا فرائض ہیں؟ اور دنیا کی عام حکومتوں سے وہ کس امور میں ممتاز ہے؟ ان مباحث کا اصولی اور مفصل بیان کتاب کے دوسرے حصّوں میں آئیگا، یہاں عرب کے نظم ونسق کے متعلق عام اور جزئی باتیں بیان کرنی مسطور ہیں۔

صفحات بالا سے معلوم ہوچکا ہے کہ اب تمام عرب میں امن وامان قائم ہے، سیاسی مشکلات کا خاتمہ ہوچکا ہے، ملک کے ہر گوشہ میں دُعاۃ اسلام پھیلے ہوئے ہیں، قبائل دور دراز صوبوں سے بارگاہِ نبوت کا رُخ کررہے ہیں، فتح مکہ اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن تھا، جو رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے، اسی کے بعد آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے قبائل میں محصّلین زکوٰۃ کا تقرر فرمایا، لیکن اصل خلافتِ الٰہی کے تمام اجزا، اواخر ۱۰ھ میں زمانۂ حجۃ الوداع کے قریب تکمیل پائے،

یورپ کی نا آشنا نگاہ میں اگرچہ آپکی زندگی کا یہ دور جدید اپنی تاباں زندگی کا ایک طرب انگیز مظہر تھا، لیکن آشنایانِ حقیقت کو شہنشاہ عرب پھٹے پُرانے کپڑوں میں، مدینہ کی گلیوں کے اندر غلاموں اور مسکینوں کے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ تاج وتخت سے بے نیاز، قصر وایواں سے مستغنی، حاجب ودرباں سے بے پروا، مال وزر سے خالی، خدم وحشم کے بغیر دلوں پر حکومت کر رہا تھا، نہ اُسکی حکومت میں پولیس تھی، نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد ارباب مناصب، نہ وزرائے مشورہ، نہ امرائے سیاست، نہ الگ الگ حکام وقضاۃ، وہ ایک ہی ذات تھی جو ہر فرض وخدمت کی خود ذمہ دار تھی، لیکن بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال کا بھی زیادہ مستحق نہیں سمجھتا تھا[1]، اُسکے عدل وانصاف کے آگے فاطمہ جگر گوشۂ نبوت اور عام مجرم برابر تھے[2]،

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا اصل مقصد دعوتِ مذہب، اصلاح اخلاق، اور تزکیۂ نفوس تھا، اِسکے علاوہ اور تمام فرائض محض ضمنی تھے، اس بنا پر انتظامات ملکی آپ نے اُسی حد تک قائم کیے، جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوت توحید کے لیئے عوائق پیش آتے تھے، تاہم یہ کام بھی کچھ کم اہم نہ تھا،

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب صلوٰۃ القاعد [2] صحیح بخاری کتاب الحدود،

انتظام ملکی عمر شریف اسوقت ساٹھ برس کی تھی، اس عمر مین اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے، ولاۃ، اور عمال کا تقرر، موذنین اور ائمہ کا تعین، محصلین زکوۃ وجزیہ کی نامزدگی، غیر قومون سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کیلئے تعین وظائف، اجرائے فرامین، نومسلمون کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتا، جرائم کے لئے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات، عہدہ دارون کی خبرگیری اور احتساب۔ دُور کے صوبون مین متعدد صحابہ گورنر اور والی بناکر بھیجے گئے تھے لیکن خود مدینہ اور اطراف مدینہ کے فرائض آپ خود انجام دیتے تھے،

خلافت الٰہی کے اِن فرائض واعمال نے آپ کے دل ودماغ پر جو بار عظیم ڈالا، اُس نے آپکے نظام جسمانی کو چور چور کردیا، عام روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھکر پڑھا کرتے تھے جو ضعف جسمانی کا اقتضا تھا، لیکن یہ ضعف جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا، اس کا جواب حضرت عائشہ کی زبان سے سننا چاہیئے، جن سے بڑھکر آپکے اعمال زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہوسکتا،

عن عبد الله بن شقيق قال سألت	عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے
عائشة أكان يصلّى قاعدا قالت حين	پوچھا کہ کیا آنحضرت صلعم بیٹھکر نماز پڑھتے تھے، انہوں نے کہا
حطمه الناس[1]،	ہاں لیکن اُسوقت جب لوگوں نے آپکو چور چور کردیا تھا،

امیر العسکری چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا کے امیر الجیش اگرچہ اکابر صحابہ ہوتے تھے، لیکن جو بڑے بڑے معرکے پیش آتے تھے، اُنکی قیادت خود آپ بنفس نفیس فرماتے تھے، چنانچہ بدر، اُحد، خیبر، فتح مکہ، تبوک، میں خود آپہی امیر العسکر تھے، اس کا مقصد صرف فوج کا لڑانا اور آخری فتح وظفر حاصل کرنا نہ تھا بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا، چنانچہ آپنے مجاہدین اسلام کی جس جزئی سے جزئی بے اعتدالیوں پر گرفت فرمائی ہے وہ احادیث مین بہ تصریح مذکور ہین، اور اسلام کا قانون جنگ اسی دار وگیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے،

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ،

افتا | آپ کے عہد مبارک میں اگرچہ متعدد صحابہ بھی بطور خود فتویٰ دیتے تھے، لیکن زیادہ تر آپ ہی اس فرض کو بھی ادا کرتے تھے، فتویٰ دینے کے لئے آپ نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا تھا، بلکہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، غرض جس وقت لوگ آپ سے احکام اسلام کے متعلق سوالات کرتے تھے آپ اُنکا جواب دیتے تھے چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں، ان فتاوے کو اس قسم کے متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا ہے، خلافت کا یہی فرض تھا، جسکو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں نہایت ترقی دی اور اس کا ایک مُستقل صیغہ قائم کر دیا،

فصل قضایا | اگرچہ آپ کے عہد مبارک میں عہدۂ قضاءت قائم ہو چکا تھا، اور حضرت علیؓ، اور حضرت معاذ بن جبل کو آپ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرما کے بھیجا تھا تاہم مدینہ اور اُسکے حوالی و مضافات کے تمام مقدمات کا آپ خود فیصلہ کرتے تھے، اس کے لیے کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی، امام بخاری نے ایک خاص باب باندھا ہے جسکا عنوان یہ ہے،

باب ماذکر ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم لم یکن لہ بواب یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر دربان نہ تھا،

اس بنا پر گھر کے اندر بھی آپ اطمینان وسکون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے، عورتوں کے معاملات عموماً زنانخانہ ہی میں پیش ہوتے تھے، احادیث کی کتابوں میں آپ کے فیصلوں کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر اُنکا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے، عموماً احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی کے مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری کے مقدمات مذکور ہیں،

توقیعات و فرامین | یہ اس قدر اہم کام تھا کہ عہد مبارک میں اگرچہ اور صیغوں کا کوئی مستقل دفتر نہیں قائم ہوا تھا تاہم توقیعات اور فرامین کے لئے اسکی ابتدائی شکل قائم ہو چکی تھی، چنانچہ اس خدمت پر حضرت زید بن ثابت، اور آخر میں معاویہ بھی مامور ہوئے، اسکے علاوہ اور دوسرے صحابہؓ بھی وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام دیتے تھے، آپ نے سلاطین و ملوک کو دعوت اسلام کے جو خطوط روانہ فرمائے، غیر قوموں کے ساتھ جو معاہدے کئے، مسلمان قبائل کو جو احکام بھیجے، عمال و محصّلین کو جو تحریری فرامین عنایت کئے، وہ کاغذ پر جو مرتب کرایا، بعض صحابہؓ کو جو

حدیثین لکھوائین، وہ سب اسی سلسلہ میں داخل ہیں، زرقانی وغیرہ نے آپکے احکام و فرامین تحریری کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے،

مہمانداری | منصب نبوت کے بعد آپ کی ذاتی حیثیت تقریباً فنا ہوگئی تھی، اسلئے آپکی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے اُنکا تعلق بھی خلافت الٰہی یا نبوت ہی کے ساتھ ہوتا تھا، اور آپ اسی حیثیت سے اُنکی مہمانداری فرماتے تھے، مہمانوں کی زیادہ تر تعداد قبول اسلام کے لئے آتی تھی، جن کی مہمانداری کے لئے آپ نے ابتداءِ نبوت ہی سے خاص طور پر حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) کو مامور فرما دیا تھا، چنانچہ جب کوئی تنگدست مسلمان آپکی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ اُسکو برہنہ تن دیکھتے تو حضرت بلالؓ کو حکم دیتے اور وہ قرض لیکر اُسکے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتے، جب آپکے پاس کہیں سے کچھ مال آتا تو اُسکے ذریعہ سے وہ قرض ادا کیا جاتا، یہانتک کہ اگر کوئی شخص آپ کو ذاتی طور پر ہدیہ دیتا تو وہ بھی اسی صیغہ میں صرف کیا جاتا[1]، کبھی کبھی اس غرض کے لئے آپ تمام صحابہؓ کو صدقہ وخیرات کی ترغیب دیتے اور جو رقم وصول ہوتی وہ ان مفلوک الحال مہاجرین کی اعانت میں صرف ہوتی، چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک برہنہ تن جماعت آپکی خدمت میں حاضر ہوئی، ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار حمائل تھی، آپ ان کی پریشان حالی کو دیکھا تو چہرے کا رنگ بدل گیا، فوراً حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، نماز سے فارغ ہونیکے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی، اسکا یہ اثر ہوا کہ ایک انصاری اُٹھے اور ایک توڑا اس قدر وزنی تھا کہ اُسے بمشکل اُٹھا سکتا تھا لاکر آپکے آگے ڈال دیا، اِس سے تمام لوگون میں اور بھی جوش پیدا ہوا، تھوڑی دیر میں اِن بے سروسامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا[2]،

فتح مکہ کے بعد تمام اطراف ملک سے بکثرت ملکی و مذہبی وفود آنے لگے، آپ بنفس نفیس اُن کی خاطر مدارات کرتے تھے، اور اُنکے لئے حسب حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے، قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا، آپ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھین،

[1] ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین، [2] مسند امام احمد حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۵۸،

ان میں ایک یہ بھی تھا،

اجیزوا الوفود بنحو ما کنت اجیزہم[1]   جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا تم بھی اسی طرح دیا کرنا،

وفود کے حالات آگے آتے ہیں،

عیادت مرضیٰ | مریضوں کی عیادت، اور انکی تجہیز و تکفین میں شریک ہونا اگرچہ ایک مذہبی فرض تھا اور مذہبی حیثیت سے اس کی ابتدا بھی ہوئی، چنانچہ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو یہ عام دستور ہو گیا کہ دم نزع میت کے اعزہ آپ کو اطلاع دیتے، آپ اُنکے پاس آکر اُنکے لئے دعائے مغفرت کرتے،[2] لیکن بعض حیثیتوں سے اسکا تعلق خلافت کے ساتھ بھی ہوگیا تھا، کیونکہ بعض صحابہ اس حالت میں اپنی جائداد کو وقف یا صدقہ کرنا چاہتے تھے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس موقع پر اُن کا صحیح طریقہ بتاتے تھے، جن لوگوں پر قرض آتا تھا آپ اُنکے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے، اسلئے اُنکے ورثہ یا دوسرے صحابہ کو مجبوراً یہ قرض ادا کرنا پڑتا تھا، اور اس طرح بعض معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہو جاتا تھا چنانچہ احادیث میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں،

احتساب | تمدن اسلام کے دور ترقی میں محکمہ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق وعادات، بیع و شرا، اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا، لیکن آنحضرت صلعم کے عہد مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا بلکہ خود ہی آپ اس فرض کو ادا فرماتے تھے، ہر شخص کے جزئیات اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق آپ وقتاً فوقتاً دار و گیر فرماتے رہتے تھے، تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے، عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابل اصلاح تھی، اور مدینہ میں آنے کے ساتھ ہی آپ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا، لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغۂ احتساب سے تعلق رکھتا تھا، چنانچہ آپ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے، اور تمام لوگوں سے ان پر عمل کراتے تھے، اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے اُنکو سزائیں دلاتے تھے، صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے،

لقد رأیت الناس فی عہد النبی   حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلعم کے

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب، [2] مسند جلد ۳ صفحہ ۶۶،

صلی اللہ علیہ وسلم ساعون حراما — عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے اُنکو اس بات

یعنی الطعام یضربون ان یبیعوہ فی مکانہم — پر سزا دیجاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے

حتی یووہ الی رحالہم، — اُسکو خود اُسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اُسکو خریدا تھا،

کبھی کبھی تحقیق حال کے لیے آپ خود بازار تشریف لیجاتے، ایک بار آپ بازار میں گذرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا،

اس کے اندر ہات ڈالا تو نمی محسوس ہوئی، دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اُسنے جواب دیا کہ بارش سے

بھیگ گیا ہے، ارشاد ہوا کہ پھر اسکو اوپر کیوں نہیں کرلیا تاکہ ہر شخص کو نظر آئے، جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم

مین سے نہیں ہیں[۱]

فرائض احتساب مین آپ کا سب سے بڑا فرض عمال کا محاسبہ تھا، یعنی جب عمال زکوۃ اور صدقہ وصول کرکے

آتے تھے تو آپ اس غرض سے انکا جائزہ لیتے تھے کہ اُنھوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو اختیار نہیں کیا ہے، چنانچہ ایکبار

آپنے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیئے مامور فرمایا، وہ اپنی خدمت انجام دیکر واپس آئے اور آپنے

اُن کا جائزہ لیا تو انھوں نے کہا یہ مال مسلمانون کا ہے، اور یہ مجھکو ہدیۃً ملا ہے، آپ نے فرمایا کہ "گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ ہدیہ

کیوں نہین ملا" اِسکے بعد آپ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اسکی سخت ممانعت فرمائی،[۲]

اصلاحِ بین الناس | اسلام تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً، اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے کیلیے آیا تھا، اس بنا پر آنحضرت

(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو اپنا ایک ضروری فرض قرار دیا تھا، اور جب آپکو اس قسم کے منازعات کی خبر ہوتی

تھی تو آپ اصلاح کو تمام مذہبی فرائض پر مقدم رکھتے تھے، چنانچہ ایکبار قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے چند اشخاص کے

درمیان نزاع پیدا ہوئی، آپ کو معلوم ہوا تو چند صحابہ کے ساتھ اُن میں مصالحت کرانے کے لیے تشریف لے گئے،

آپ کو اس معاملہ میں دیر ہوئی اور نماز کا وقت آگیا، حضرت بلالؓ نے اذان دی، لیکن اذان کے بعد بھی آپ

تشریف نہیں لائے، تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد اُنھون نے حضرت ابوبکرؓ کو امام بناکر نماز شروع کردی، آپ

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۵۲ کتاب الایمان، [۲] بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۸ کتاب الاحکام،

اسی حالت میں تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں جا کھڑے ہوئے حضرت ابوبکرؓ اگرچہ نماز میں اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے لیکن جب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کیں تو اُنھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ آنحضرت صلعم کھڑے ہیں، آپ نے اگرچہ ہات سے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیں، لیکن آپ کی موجودگی میں انھوں نے امامت کرنا سوءِ ادب خیال کیا اسلئے پیچھے ہٹ آئے، اور آنحضرت صلعم آگے بڑھکر اُنکی جگہ کھڑے ہو گئے،[۱]

ایک بار اہل قبا کے درمیان نزاع قائم ہوئی، اور نوبت یہان تک پہنچی کہ لوگوں نے باہم سنگ اندازی کی، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو خبر ہوئی تو آپ صحابہ کے ساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے،[۲] بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ اتنی دور پیدل گئے تھے،

ابن ابی حدرد پر حضرت کعب بن مالک کا کچھ قرض تھا، اُنھوں نے مسجد مین تقاضا کیا، حدرد قرض کا ایک حصہ معاف کرانا چاہتے تھے، لیکن وہ اسپر راضی نہ ہوتے تھے، بات زیادہ بڑھی اور شور وغل ہوا تو آپ گھر کے اندر سے نکل آئے، اور کعب کو پکارا، کعب نے لبیک کہا، تو آپ نے فرمایا کہ "نصف معاف کردو" وہ راضی ہوگئے تو آپ نے حدرد سے کہا کہ جاؤ اور بقیہ حصہ ادا کردو"[۳]

اس قسم کے سیکڑون جزئی واقعات روزانہ پیش آیا کرتے تھے،

مدینہ مین اور مدینہ سے باہر دیگر فرائض کی انجام دہی کے لئے اکابر صحابہ، اور ارباب استعداد کو مختلف عہدون پر نصب فرمایا، کتابت وحی، نامہ وپیام، اجراے احکام وفرامین کے لیے سب سے پہلی ضرورت عہدۂ انشا اور کتابت کی تھی، اسلام سے پہلے عرب میں عام طور سے لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، لیکن اسلام عرب کیلئے رحمتوں کا جو خزانہ لایا تھا، اس میں ایک یہ نعمت بھی تھی،

اسیران بدر مین نادار لوگوں کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھاوین، حضرت زید بن ثابت نے جنکے متعلق کتابت وحی کی مقدس خدمت تھی، اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی، ابو داؤد کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے،

[۱] بخاری جلد ا صفحہ ، [۲] کتاب الصلح، [۳] بخاری کتاب الصلح،

کہ اصحاب صُفّہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی، اس کا ایک جُز کتابت کی تعلیم بھی تھی،)

کتابت (عہدۂ انشاء گویا آنحضرت صلعم کی ایک حیثیت سے سیاست تھی اس لیے مختلف اوقات میں بڑے بڑے صحابہ اس خدمت پر مامور کئے گئے، جن میں شرحبیل بن حسنہ کندی سب سے پہلے اس شرف سے ممتاز ہوئے، یہ نہایت قدیم الاسلام تھے، مکہ میں انہی نے سب سے پہلے کتابت وحی کا فرض انجام دیا، قریش میں سب سے پہلے کاتب عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھے، مدینہ میں اسکی اولیت کا شرف حضرت ابی بن کعب کو حاصل ہوا،

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن ارقم، حضرت ثابت بن قیس بن شماس، حضرت حنظلہ بن الربیع الاسدی، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت خالد بن ولید، حضرت خالد بن سعید بن العاص، حضرت علاء بن حضرمی، حضرت حذیفہ بن الیمان حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حضرت زید بن ثابت مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوئے،

ان بزرگوں کے نام اور تفصیلی حالات زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۱۳ میں مذکور ہیں،

اگرچہ ان تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت ادا کرنی پڑتی تھی، چنانچہ صلحنامۂ حدیبیہ حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، امرا اور سلاطین کے نام خطوط حضرت عامر بن فہیرہ لکھتے تھے، اور امرائے عمال کے نام آپ نے جو مکتوب بھیجا تھا وہ حضرت ابی بن کعب کا لکھا تھا قطن بن حارثہ کو جو خط بارگاہ نبوت سے بھیجا گیا تھا وہ حضرت ثابت بن قیس نے لکھا تھا، لیکن عام طور پر یہ خدمت حضرت زید بن ثابت کے متعلق تھی، اور صحابہ کے گروہ میں اُن کا نام اسی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے،

حضرت زید بن ثابت نے آنحضرت صلعم کے ارشاد سے ان تمام بزرگوں پر ایک خاص امتیاز حاصل کیا کہ عبرانی زبان سیکھی جسکی ضرورت یہ پیش آئی کہ مدینہ میں آنحضرت صلعم کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جنکی مذہبی زبان عبرانی تھی، اس بنا پر آپ نے حضرت زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، اور انھوں نے پندرہ دن میں اس میں مہارت حاصل کرلی،)

حکام اور وُلاۃ (فصل قضایا، اقامت عدل، بسط امن، رفع نزاع کے لیے متعدد ولاۃ و حکّام کی ضرورت تھی، اس غرض سے آپ نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی مقرر فرمایا، چنانچہ ان کے ناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے

باذان بن ساسان،	بہرام گور کے خاندان سے تھے اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف باسلام

ہوئے اُس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنکو یمن کا والی مقرر فرمایا

شہر بن باذان	باذان بن ساسان کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا،
خالد بن سعید بن العاص	شہر بن باذان مارے گئے تو اُن کے بعد آپ نے اُن کو صنعاء کا عامل مقرر فرمایا،
مہاجر بن امیۃ المخزومی،	آپ نے ان کو کندہ وصدف کا والی مقرر فرمایا تھا لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ نے انتقال فرمایا،
زیاد بن لبید الانصاری،	حضرموت کے والی تھے،
ابوموسے اشعری،	زبید، عدن، زمع، وغیرہ کے والی تھے،
معاذ بن جبل	والیٔ جند،
عمرو بن حزم	والیٔ نجران،
یزید بن ابی سفیان،	والیٔ تیمار،
عتاب بن اسید،	والیٔ مکہ،
علی بن ابی طالب،	متولی اخماس یمن
عمرو بن العاص،	والیٔ عمان،
علاء بن حضرمی،	والیٔ بحرین،

ان وُلاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے عہد مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر اثر آئے، ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا، اس بنا پر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اُس کو

پانچ حصوں میں منقسم فرمایا اور ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمائے، **خالد بن سعید** کو صنعا پر، **مہاجر بن ابی امیہ** کو کندہ پر، **زیاد بن لبید** کو حضرموت پر، **معاذ بن جبل** کو جند پر، **ابوموسیٰ اشعری** کو زبید، زمعہ، عدن اور ساحل پر، [1]

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر فرماتے تھے، تو اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے، ملکی انتظام، فصل مقدمات، اور تحصیل خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعت اسلام اور دین و فرائض کی تعلیم تھی، اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، یہ لوگ حاکم ملک اور والی صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغ دین اور معلم اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے، استیعاب، تذکرہ معاذ بن جبل میں ہے،

وبعث رسول الله صلى الله عليه وسلم قاضيا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو یمن کے ایک حصہ
الى الجند من اليمن يعلم الناس القرآن	یعنی جند کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن
وشرائع الاسلام ويقضي بينهم وجعل اليه	اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں، اور جو عمال یمن میں تھے
قبض الصدقات من العمال الذين باليمن،	اُنکے صدقات کے جمع کرنے کی خدمت بھی اُنکے متعلق کی،

چنانچہ جب یہ لوگ روانہ ہوتے تھے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان فرائض کی تعیین فرمادیتے تھے، معاذ بن جبل کو روانہ فرمایا تو یہ وصیت کی، [2]

انك تاتي قوما من اهل الكتاب فادعهم	تم اہل کتاب کے پاس جاتے ہو، پہلے اُنکو کلمۂ توحید
الى شهادة ان لا اله الا الله واني رسول الله	کی دعوت دو، اگر وہ اسکو قبول کرلیں تو اُن کو بتاؤ کہ
فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله	خدا نے رات اور دن میں اُن پر پانچ نمازیں فرض کی
افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم وليلة	ہیں، اگر وہ اسکو بھی مان لیں تو انکو بتاؤ کہ خدا نے اُنپر
فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله	صدقہ فرض کیا ہے، جو اُن کے امراء سے لیکر

[1] استیعاب تذکرۂ معاذ بن جبل، [2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۶،

افترض عليهم صدقة تؤخذ من اغنياءهم وترد — ان کے غرباء پر تقسیم کر دیا جائے گا اگر وہ اسکو بھی تسلیم

الى فقرائهم فان هم اطاعوا لذلك فاياك — کرلیں تو اُن کے بہترین مال سے احتراز کرنا، اور مظلوم

وكرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه — کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اُس میں اور خدا کے درمیاں

ليس بينها وبين الله حجاب، — کوئی پردہ نہیں ہے،

ان فرائض کے ادا کرنے کے لیئے سب سے زیادہ ضرورت تحمل علمی، وسعت نظر اور اجتہاد کی تھی، اس بناپر آپ ان لوگوں کے تحمل علمی اور طرز عمل کا امتحان لے لیتے تھے، چنانچہ جب حضرت معاذ کو روانہ فرمایا تو پہلے انکی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرمالیا، ترمذی میں ہے،

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لمعاذ — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو

بن جبل حين وجهه الى اليمن بم تقضي قال — یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ

بما في كتاب الله قال فان لم تجد بما في — کروگے، اُنھوں نے کہا قرآن مجید سے، آپ نے فرمایا، اگر

سنة رسول الله قال فان لم تجد قال اجتهد — اس میں وہ فیصلہ تمکو نہ ملے، اُنھوں نے کہا احادیث سے

رائي فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم — پھر آپ نے فرمایا اگر احادیث میں بھی اسکے متعلق ہدایت

الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يحب — نہ ملے؟ تو انھوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا، اسپر آپ نے

رسول الله، — فرمایا اُس خدا کا شکر ہے جسنے رسول اللہ کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جسکو خود اسکا رسول محبوب رکھتا ہے،

لیکن اہل عرب کے دلوں کے مسخر کرنے کے لیے ان تمام چیزوں سے زیادہ، رفق و ملاطفت، نرمی اور خوش خوئی کی ضرورت تھی، جسکی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً ناممکن ہوجاتی ہے، اسلیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گورنروں کو بار بار اسکی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے، چنانچہ جب معاذ بن جبل کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائی،

يسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا — آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا

لاتحملها۔ (مسلم جلد۱صفحہ۳۴ کتاب الایمان) اور اُن کو وحشت زدہ نہ کرنا، تاہم العاق رکھنا اور اصلاح کرنا،

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذ بن جبل جب رکاب میں پاؤں ڈال چکے تو اُن سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے،

احسن خلقك للناس، (ابن سعد تذکرۂ معاذ بن جبل) لوگوں کے ساتھ حسن خلق کے ساتھ برتاؤ کرنا،

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کتنی ہی رحمدل کیوں نہ ہو لیکن ابتدا میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لیے اسکو مجبوراً سختیاں کرنی پڑتی ہیں تو عرب اس کا سب سے زیادہ مستحق تھا لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی مقدس تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ ریگستان عرب کا ایک ذرہ بھی وُلاۃ کے مظالم کے سنگ گراں سے نہ دبا، یہاں تک کہ اخیر زمانہ میں جب صحابہ، عمال حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے تو اُن کو سخت استعجاب ہوتا تھا، اور وہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تلقینات کے ذریعہ سے اُن کو روکتے تھے، چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ مین کھڑے کئے گئے ہین، اُنہون نے لوگون سے اسکی وجہ پوچھی، لوگون نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لیئے اِن لوگوں کے ساتھ یہ سختی کیجا رہی ہے، اُنھون نے یہ سُنکر کہا،

اشھد لسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
یقول ان اللہ یعذب الذین یعذبون	علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا اُن لوگوں کو عذاب
الناس فی الدنیا[۱]،	دیگا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں،

محصلین زکوٰۃ وجزیہ (عرب کا خلوص اور جوش ایمان اگرچہ خود اُن کو صدقہ و زکوٰۃ کے ادا کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا چنانچہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر قبیلہ اپنی قوم کا صدقہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں خود پیش کرتا، اور آپ کی دعا سے برکت اندوز ہوتا تھا لیکن ایک وسیع ملک، اور ایک وسیع حکومت کے لیئے یہ طریقہ کافی نہ تھا، اِسلیئے وُلاۃ کے علاوہ یکم محرم ۹ھ کو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیئے ہر قبیلہ کے لیے الگ الگ

[۱] صحیح مسلم باب الوعد الشدید لمن عذب الناس بغیر حق،

محصلین مقرر فرمائے جو قبائل کا دورہ کرکے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کرکے آپ کی خدمتِ مبارک میں پیش کرتے تھے، عموماً خود روسائے قبائل اپنے اپنے قبیلوں کے محصّل ہوتے تھے، اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً اُنکا تقرر وقتی ہوتا تھا

بہرحال آپ نے اِس فرض کی انجام دہی کے لیے حسب ذیل اشخاص کو مختلف قبائل اور شہروں میں متعین فرمایا[1]۔

نام	مقام تقرر	نام	مقام تقرر
عدی بن حاتم	طے و بنی اسد	ابوجہم بن حذیفہ	بنولیث
صفوان بن صفوان[2]	بنی عمرو	ایک ہذیمی	بنو ہذیم
مالک بن نویرہ	بنو حنظلہ	عمر فاروقؓ	شہر مدینہ
بریدہ بن حصیب الاسلمی	غفار و اسلم	ابوعبیدہ بن جراح	شہر نجران
عباد بن بشر الاشہلی	سلیم و مزینہ	عبداللہ بن رواحہ	شہر خیبر
رافع بن مکیث جُہنی	جُہینہ	زیاد بن لبید	حضرموت
زبرقان بن بدر	بنوسعد	ابوموسیٰ اشعری	صوبہ یمن
قیس بن عاصم	"	خالدؓ	"
عمرو بن عاص	بنو فزارہ	ابان بن سعید	بحرین
ضحاک بن سفیان کلابی	بنوکلاب	عمرو بن سعید بن العاص	تیماء
بسر بن سفیان الکعبی	بنوکعب	محمیہ بن جزء الاسدی	تحصیل خمس
عبداللہ بن اللتبیہ	بنو ذبیان	عیینہ بن حصن فزاری	بنوتمیم

۱؎ اِس فہرست کے اکثر نام ابن سعد جزء مغازی، صفحہ ۱۱۵ میں مذکور ہیں، عمر فاروقؓ، محمیہ اور عبیدہ بن جراح کا ذکر بخاری کتاب الصلٰوۃ اور بعض کا ابوداؤد کتاب الخراج میں ہے، عیینہ کے لیے زاد المعاد ذکر مصدقین، و امرائے سوی اور فتوح البلدان بلاذری دیکھو،

۲؎ اصابہ، باب صفوان،

اِن محصّلین کے تقرر میں آپ حسبِ ذیل امور کی پابندی فرماتے تھے،

(۱) ان کو ایک فرمان عطا ہوتا تھا جس میں بتصریح بتایا جاتا تھا کہ کس قسم کے مال کی کتنی تعداد میں زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے؟ چھانٹ کر مال لینے کی یا حق سے زیادہ لینے کی اجازت نہ تھی، عام حکم تھا کہ ایاک وکرائم اموالھم، یہ عمال نہایت شدت کے ساتھ اس فرمان پر عمل کرتے تھے، اور اُس سے سر مو تجاوز جائز نہیں رکھتے تھے، بعض لوگوں نے خوشی حق سے زیادہ دینا چاہا، لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا، سوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا محصّل آیا، میں جاکر اُسکے پاس بیٹھا تو اُس نے پہلے جانوروں کے اُن اقسام کو بیان کیا جن کے لینے کی فرمان میں اجازت نہ تھی، چنانچہ اُسی وقت ایک شخص ایک نہایت عمدہ کوہان دار اونٹنی لیکر حاضر ہوا، اور اُسکی خدمت میں پیش کیا لیکن اُس نے انکار کر دیا[1]، اسیطرح جب ایک شخص نے ایک محصّل کو بچے والی بکری دی تو اُس نے کہا کہ ہمکو اِسکے لینے کی ممانعت کیگئی ہے[2]،

(۲) عرب کے مال و دولت کی کل کائنات بکریوں کے ریوڑ اور اونٹوں کے گلے تک محدود تھی، جو جنگلوں میں، بیابانوں میں، پہاڑوں کے دامنوں میں چرتے رہتے تھے لیکن بجائے اِسکے کہ دنیوی حکومتوں کی طرح جابرانہ احکام کے ساتھ لوگ خود زکوٰۃ کے جانور لاکر محصّلین کے سامنے پیش کرتے، محصّلوں کو خود اِن دروں میں جاکر زکوٰۃ وصول کرنا پڑتا تھا، ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں پہاڑ کے ایک درہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ دو شخص اونٹ پر سوار ہو کر آئے اور کہا کہ ہم رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قاصد ہیں، یہاں تمھاری بکریوں کا صدقہ وصول کرنے کے لیئے آئے ہیں، میں نے ایک بچہ والی شیر دار بکری پیش کی، لیکن اُنھوں نے کہا کہ ہمکو اس کے لینے کا حکم نہیں، میں نے ایک دوسرا بچہ دیا تو اُنھوں نے اُسکو اپنے اونٹ پر لاد لیا اور چلتے ہوئے[3]،

(۳) اگرچہ صحابہؓ اپنے تقدس اور پاک باطنی کی بنا پر ہر قسم کے ناجائز مال کے لینے سے خود احتراز کرتے تھے، چنانچہ جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا کہ وہاں کی

---

[1] نسائی صفحہ ۳۹، [2] نسائی صفحہ ۳۹۳ [3] نسائی صفحہ ۳۹۳،

زراعت کی نصف پیداوار حسب معاہدہ تقسیم کرا کے لائیں، تو انھوں نے انکو رشوت دینی چاہی، لیکن اُنھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ "اے خدا کے دشمنو کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو"[1] لیکن باایں ہمہ زہد و تقدس جب محصل اپنے دورہ سے واپس آتے تھے تو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) خود ان کا محاسبہ فرماتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لئے روانہ فرمایا، جب وہ واپس آئے اور آپ نے اُن کا محاسبہ کیا تو اُنھوں نے کہا یہ آپ کا مال ہے، اور یہ مجھے ہدیۃً ملا ہے، یہ سنکر آپ نے فرمایا کہ تم کو گھر بیٹھے بیٹھے ہدیہ کیوں نہیں ملا؟ اس پر بھی تسکین نہیں ہوئی تو ایک عام خطبہ دیا اور تمام لوگوں کو اس قسم کے مال لینے سے سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی،[2]

(۴) چونکہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے خاندان پر صدقہ و زکوٰۃ کا مال حرام کر دیا تھا اس لیے خاندان نبوت کا کوئی شخص صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا، ایک بار عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث اور فضل بن عباس نے کہ عمزاد بھائی اور بھتیجے تھے، آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ اب ہمارا سن نکاح کے قابل ہو گیا ہے تمام لوگوں کی طرح ہمکو بھی صدقہ کا عامل مقرر فرما دیجیے تاکہ اُس کے معاوضہ سے کچھ مال جمع کر کے نکاح کے لیے سرمایہ مہیا کریں، لیکن آپ نے فرمایا کہ صدقہ آل محمدؐ کے لئے جائز نہیں ہے، وہ لوگوں کا میل ہے،[3]

(۵) عمال کا انتخاب خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) فرماتے تھے، اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے خود پیش کرتے تھے، اُنکی درخواست نامنظور ہوتی تھی، چنانچہ ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی، آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کیا کہتے ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ مجھکو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں، آپ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کی اور فرمایا کہ جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے، لیکن اُسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا،[4]

(۶) عمال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا، آپ نے عام منادی فرما دی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۳۱، [2] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۱۳، [3] صحاح کتاب الصدقات [4] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۹۱،

شرح سے زیادہ لے گا وہ خیانت مالی ہے، مقدار ضرورت کی تصریح خود آپ نے فرما دی تھی[1]

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجة فان لم	جو شخص ہمارا عامل ہو اُسکو ایک بی بی کا خرچ لینا چاہیے
یکن له خادم فلیکتسب خادما وان لم یکن له	اگر اُس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو گھر
مسکن فلیکتسب مسکنا ومن اتخذ غیر	کا، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا، تو وہ خائن
ذلک فهو غال،	ہوگا۔

آپ کے زمانہ میں حضرت عمر فاروق کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملتا تھا، چنانچہ اُنکے عہد خلافت میں جب صحابہ نے زہد و تقدس کی بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کیا، تو اُنھوں نے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اسی طرز عمل سے استدلال کیا،[2]

قضاۃ | ان مناصب کے علاوہ بعض اور عہدے بھی سادہ طور سے قائم ہوگئے تھے، مثلاً فصل مقدمات کا کام اگرچہ زیادہ تر آپ خود انجام دیتے تھے لیکن کبھی کبھی آپ کے حکم سے حسب ذیل صحابہ نے بھی اس فرض کو انجام دیا ہے[3]

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبل،

پولیس | اگرچہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ قائم نہیں ہوا، اور اسکی ابتدا بنو امیہ کی سلطنت میں ہوئی[4]، تاہم آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے عہد مبارک میں بھی اُس کا ابتدائی نمونہ قائم ہو چکا تھا، چنانچہ آپکے عہد مبارک میں قیس بن سعد اس خدمت کو انجام دیتے تھے، اور اس غرض سے ہمیشہ آپکے ساتھ رہتے تھے[5]،

جلاد | مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیر، حضرت علی، مقداد بن الاسود، محمد بن مسلمہ، عاصم بن ثابت، ضحاک بن سفیان کلابی، کے سپرد تھی[6]۔

غیر قوموں سے معاہدے | عرب میں اب کفر و شرک کا بالکل وجود نہ تھا، کہین کہین صرف مجوس، نصاریٰ اور یہود کی آبادیاں تھیں، ان میں سے متعدد افراد نے گو نور ایمان سے قلوب کو روشن کر لیا تھا، لیکن مجموعی حیثیت

---

۱ ابو داؤد جلد ۲ باب ارزاق العمال میں دونوں حدیثیں ہیں، ۲ فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۶۱ ۳ بخاری کتاب احکام ۴ زاد المعاد ابن قیم،

سے وہ اب تک تاریکی میں تھے، تاہم خلافت الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کر سکے، حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی، اس لیے اسلام نے بھی ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی، اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک خفیف رقم (یعنی ہر مستطیع عاقل بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ) ان پر مقرر کی، اس رقم کا نقد روپے کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا، بلکہ عموماً جہاں جنس جیسی کی پیداوار ہوتی تھی، یا جو چیز ملتی تھی، وہی جزیہ قرار پائی[1]،

غیر قوموں میں سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ۷ھ میں خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی، اس وقت تک آیت جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا، اس بنا پر باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے تھے، وہ آیت جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے[2]، اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے، اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے[3]،

۹ھ ہجری میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی، اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رو سے قرار پائے، نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آکر مصالحت کی درخواست کی، جسکو آپ نے منظور فرمایا، شرائط صلح یہ تھے کہ "وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دیں گے اور ان کو دو قسط میں یعنی آدھا ماہ صفر اور آدھا ماہ رجب میں ادا کرینگے اگر یمن میں کبھی بغاوت یا شورش ہوگی تو وہ عاریتہً تیس زرہیں، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس تیس عدد ہر قسم کے ہتیار دیں گے اور مسلمان انکی واپسی کے ضامن ہوں گے، اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے، نہ اُن کے گرجے ڈھائے جائیں گے، نہ اُنکے پادری نکالے جائینگے نہ ان کو اُنکے مذہب سے برگشتہ کیا جائے گا[4]"،

حدود شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے، رجب ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے

---

[1] زاد المعاد ابن قیم جلد اول فصل جزیہ، [2] زاد المعاد ابن قیم، جلد اول، [3] بخاری ومسلم و ابوداؤد، ذکر خیبر و فتوح البلدان بلاذری ذکر فدک و وادی القریٰ و تیماء، [4] ابوداؤد کتاب الخراج باب اخذ الجزیہ،

موقع پر، دومۃ الجندل، ایلہ، مقنا، جرباء، اذرح، تبالہ، اور جرش کے جو عیسائی اور یہودی رئیس تھے اسلام نہیں لائے، ملکہ جزیہ دینا قبول کیا، ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا اور مسلمان جب ادھر سے گذریں تو ان کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی،[۱]

یمن کے جن یہودیوں نے اسلام قبول نہیں کیا ان پر بھی جزیہ کی یہی مقدار مقرر کی گئی، ان کو ایک آسانی یہ بھی دی گئی کہ اگر نقد ادا نہ کرسکیں تو اسی کے برابر معافری کپڑے دیا کریں[۲]، بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرح مقدار پر مصالحت کی گئی[۳]

اصناف محاصل ومخارج | مختلف اغراض ومصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے، غنیمت، فئی، زکوۃ، جزیہ، خراج، اول کے سوا بقیہ ذرائع آمدنی سالانہ تھے،

غنیمت کا مال صرف فتوحات کے موقع پر آتا تھا، عرب میں قاعدہ تھا کہ رئیس فوج غنیمت کا چوتھا حصہ خود لیتا تھا، جس کو اصطلاح میں مرباع کہتے تھے، اور بقیہ جو جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا لے لیتا تھا، تقسیم کا کوئی نظام نہ تھا، غزوۂ بدر کے بعد خدا نے غنیمت کو خود اپنی ملک قرار دیا، جس میں خُمس یعنی پانچواں حصہ خدا اور رسول کے نام سے حکومت الٰہی کے مصالح واغراض کے لئے مخصوص فرمایا۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ (انفال)　　اے پیغمبر لوگ تجھ سے مال غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں کہدے کہ وہ خدا اور رسول کی ملک ہے

خدا اور رسول کی ملکیت سے مقصود یہ ہے کہ وہ سپاہیوں کی شخصی ملکیت نہیں ہے، بلکہ مصالح کی بنا پر صاحبِ خلافت جس طرح مناسب سمجھے، اس کو صرف کرسکتا ہے، اسی طرح خمس کی نسبت ارشاد ہوا ہے

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ　　مسلمانو! جان لو کہ تم کو جو مال غنیمت ہاتھ آئے اُس کا

---

[۱] فتوح البلدان، بلاذری [۲] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ،

[۳] ابوداؤد اخذ الجزیۃ من المجوس، وتاریخ بلاذری ذکر بحرین

وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ، (انفال)
پانچواں حصہ خدا ورسول، اہل قرابت، اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے

ایک دو استثنائی واقعہ کے سوا خمس میں آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مال غنیمت مخصوص مہاجرین کو یا مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا، ہمیشہ آپکا یہ طرز عمل رہا کہ خمس کے بعد ایک ایک حصہ سپاہیوں پر برابر تقسیم فرما دیتے تھے، سواروں کو تین حصے اور پیادہ کو ایک حصہ، بعض روایتوں میں ہے کہ سواروں کو صرف دو حصے ملتے[1] تھے خمس کا بھی عموماً بہت کم حصہ ذاتی مصرف میں آتا تھا، آیت بالا میں جن ارباب استحقاق کا ذکر ہے، زیادہ تر ان ہی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ، صرف مسلمانوں پر فرض تھی، اور وہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی، نقد[1] روپیہ پیسہ[2]، اور پیداوار، مویشی[3] (بجز گھوڑا) اسباب تجارت[4]، دوسو درہم چاندی، بیس مثقال سونے اور پانچ اونٹ سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی، پیداوار سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی مقدار ۵ وسق (۳ صاع بہ تحقیق امام ترمذی) سے زیادہ ہو، سونا اور چاندی کا چالیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا، مویشیوں کا زکوٰۃ بھی مختلف جنس کی مختلف تعداد پر مقرر تھا، جو حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں مفصل مذکور ہے اراضی کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جسکی سیرابی صرف بارش کے پانی سے کی جاتی تھی، اس قسم کی اراضی کی پیداوار میں دسواں حصہ (عشر) وصول ہوتا تھا، اور جس کو آبپاشی کے ذریعہ سے سیراب کیا جاتا تھا، اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ لیا جاتا تھا[3]، سبزی پر کوئی زکوٰۃ نہ تھی[4]۔

زکوٰۃ کے آٹھ مصرف تھے جن کی تفصیل خود قرآن مجید نے کر دی تھی، فقراء، مساکین، نومسلم، غلام جن کو خرید کر آزاد کرایا ہے، مقروض، مسافر، محصلین زکوٰۃ کی تنخواہ، دیگر کار خیر، عموماً جہاں سے زکوٰۃ کی رقم وصول کیجاتی

---

[1] ابوداؤد حکم ارض خیبر بروایت مجمع، [2] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب العروض، اذا کانت للتجارۃ، [3] ترمذی کتاب الزکوۃ، [4] ترمذی کتاب الزکوۃ،

تھی وہیں کے مستحقین پر صرف کردی جاتی تھی، صحابہ اس حکم کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ ایک صحابی کو زیاد نے عامل بنا کر ایک مقام میں بھیجا، جب وہ واپس آئے تو زیاد نے ان سے رقم کا مطالبہ کیا، انھوں نے جواب میں کہا کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ سے جس طرح ہم کرتے آئے تھے وہی ہم نے کیا[1] معاذ بن جبل رض جب عامل بنا کر یمن بھیجے گئے، تو زکوۃ کے متعلق آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا وصدقۃ توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم۔

جزیہ غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا، اس کی مقدار متعین نہ تھی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے زمانہ میں ہر مستطیع بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرنے کا حکم دیا تھا، بچے اور عورتیں اس میں داخل نہ تھیں، ایلہ کے جزیہ کی مقدار ۳ دینار تھی، اذرح کی سو دینار تھی، عہد نبوی میں جزیہ کی سب سے بڑی مقدار بحرین سے وصول ہوتی تھی

خراج، غیر مسلم کاشتکاروں سے حق مالکانہ کے معاوضہ میں زمین کی پیداوار کا جو مخصوص حصہ باہمی مصالحت سے طے ہوگیا ہو، اس کا نام خراج ہے، خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیما، وغیرہ سے خراج ہی وصول ہوتا تھا، پھل یا پیداوار کے تیار ہونے کا جب وقت آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو بھیجدیتے تھے، وہ باغوں اور کھیتوں کو دیکھ کر تخمینہ لگاتے تھے، رفع استسقاط کے لیے تخمینہ میں سے ثلث کم کردیا جاتا تھا[2]، بقیہ پر حسب شرائط خراج وصول کیا جاتا، خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوئی تھی۔

جزیہ اور خراج کی رقم سپاہیوں کی تنخواہ اور جنگی مصارف میں صرف ہوتی تھی، تمام صحابہ ضرورت کے وقت والنٹیر سپاہی تھے، جو کچھ وصول ہوکر آتا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سب کو اسی وقت تقسیم فرمادیتے اوّل آپ اُن لوگون کو عطا فرماتے تھے جو پہلے غلام رہ چکے تھے، ایک رجسٹر پر لوگوں کے نام لکھے ہوتے تھے، اسی ترتیب سے نام پکارے جاتے تھے، جو لوگ صاحب اہل وعیال ہوتے تھے، ان کو دو حصے اور مجرد لوگوں کو ایک[3] حصہ ملتا تھا)

جاگیریں اور افتادہ زمینوں کی آبادی (ملک عرب کا اکثر حصہ ریگستانی، پتھریلا، شورا اور بنجر تھا، جو سرسبز قطعات تھے اُن پر بیرونی

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوۃ، باب الصدقہ تحمل من بلد الی بلد [2] بحوالہ مذکور باب فی الخرص، [3] ابوداؤد کتاب الخراج باب قسم الفئ،

تو میں خالص تھیں، بقیہ افتادہ زمینیں تھیں، مدینہ اور طایف میں البتہ کاشتکاری ہوتی تھی۔ بقیہ عام اہل عرب تجارت یا لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے تھے، عربوں کی غیر مامون زندگی کا راز یہی تھا کہ وہ مستقل پیشہ ور نہ تھے، اس بنا پر قیام امن کے لیے بھی ضروری تھا کہ زمین کا نئے سرے سے بندوبست کیا جائے، تجارتوں میں غیر قوموں کے انخلاء کے سبب سے یوں بھی بہت سی زمینیں خالی ہوگئی تھیں، جن کا انتظام ضروری تھا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے عام طور پر صحابہ کو اسکی ترغیب دی

من احیا ارضا میتة فھی له — جس شخص نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا وہ اسکی ملک ہے

من احاط حائطا علی ارض فھی له — جس شخص نے کسی زمین کو گھیر لیا وہ اسکی ملک ہے

ترغیب عام کے ساتھ خاص خاص انتظامات بھی فرمائے بنو نضیر اور قریظہ کے نخلستان اور کھیت خاص بارگاہ نبوت کی ملک فرمائے، اور آپ نے اپنی طرف سے ان کو مہاجرین اور بعض انصار میں تقسیم فرما دیا، خیبر کی زمین کچھ خاصہ رہی اور بقیہ ان مہاجرین اور انصار میں تقسیم فرما دی جو حدیبیہ میں شریک تھے، لیکن عملاً یہودیوں کے ساتھ ان کا بندوبست رہا، پیداوار کا نصف حصہ وہ خود لیتے تھے اور نصف مالکوں کو ادا کرتے تھے، جو زمینیں آباد تھیں ان کو بعض شرائط پر اصل مالک کے ہاتھ میں رہنے دیا، چنانچہ عک، ذوخیوان اور ایلہ، اذرح، نجران وغیرہ میں اسی طرح معاملات طے پائے، افتادہ زمینیں بھی صحابہ کو بطور جاگیر عطا فرمائیں حضرت وائل کو حضرموت میں ایک قطعہ زمین عنایت فرمایا، بلال بن حارث مزنی کو کو قابل زراعت زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اور کانیں مرحمت فرمائیں حضرت زبیر کو مدینہ کے پاس، اور حضرت عمرؓ کو خیبر میں جاگیریں عطا کیں، سور قاعہ کو دومۃ الجندل کے پاس زمین عنایت کی۔

یہ جاگیریں اس فیاضی اور وسعت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ ہر شخص حسب استطاعت ان کا انتخاب اور ان کے رقبہ کی تحدید کرسکتا تھا ایک بار آپ نے حضرت زبیر کو حکم دیا کہ جہاں تک ان کا گھوڑا دوڑ سکے وہ زمین انکی جاگیر میں داخل ہوگی چنانچہ انھوں نے گھوڑا دوڑایا، جب گھوڑا ایک خاص حد تک پہنچ کر رک گیا تو انھوں نے اپنا کوڑا پھینکا اور وہ جس نقطے پر گرا، وہی انکی جاگیر کا رقبہ قرار پایا عرب کی خشک زمین میں سب سے زیادہ ضرورت چشموں کی تھی، چنانچہ

ایک مرتبہ آپ نے حکم عام دیا من سبق الی ما لم یسبقہ الیہ مسلم فھولہ، یعنی جو شخص ایسے چشمہ پر قبضہ کرے جس پر کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے تو وہ اس کا ہے، تو تمام لوگوں نے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے چشموں کے حدود مقرر کر لیے۔

اس فیاضی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ لوگوں نے دُور دُور سے آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جاگیروں کی درخواست کرنا شروع کی، ابیض بن حمال یمن سے خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور ایک نمک کی کان کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمالیا لیکن ایک صحابی نے کہا کہ آپ نے اس کو جو چیز جاگیر میں عطا فرمائی ہے وہ پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ ہے، چونکہ وہ ایک پبلک چیز تھی اس بنا پر آپ نے اس کو واپس لے لیا۔

یہ تمام فیاضیاں صرف انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص تھیں جن کا تعلق پبلک کے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا، لیکن جو چیزیں رفاہِ عام کے کام میں آسکتی تھیں ان کو آپ نے اُسی قدیم حالت پر چھوڑ دیا عرب کا قدیم دستور تھا کہ اپنے مویشیوں کے لیے چراگاہ متعین کر لیتے تھے جس کو حمیٰ کہتے تھے، عرب میں پیلو کا درخت اونٹوں کی عام غذا تھی، اور اس کے متعلق کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، لیکن ابیض ابن حمال نے جب اس کو اپنے حمیٰ میں داخل کرنا چاہا تو آپ نے منع فرمایا لاحمی فی الاراک[1]۔

عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ مویشیوں کے چرانے کے لیے رؤسا اور ارباب اقتدار اپنے لیئے چراگاہ مخصوص کر لیتے تھے اور وہاں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے تھے، چونکہ اس سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی اسلئے اس طریقہ کو بھی روک دیا[1]۔

اسی طرح عرب میں ایک مقام دہنا ہے، جسکے ایک طرف بکر بن وائل کا قبیلہ تھا اور دوسری طرف بنو تمیم رہتے تھے، حریث بن حسان نے بکر بن وائل کے لیے اس زمین کی درخواست کی آپ نے فرمان لکھنے کا حکم دیا، اتفاق سے اس وقت ایک تمیمیہ موجود تھی، آپ نے اس کی طرف دیکھا، اسے عرض کی یا رسول اللہ! وہ اونٹوں، اور بکریوں کی چراگاہ ہے اور اسی کے پاس بنو تمیم کی عورتیں اور بچے رہتے ہیں، آپ نے فرمایا "بیچاری سچ کہتی ہے، فرمان نہ لکھو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے" ایک چشمہ اور ایک چراگاہ سب کو کافی ہوسکتا ہے"۔

---

[1] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الخراج کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں۔

مذہبی انتظامات

(ملک میں امن وامان قایم رکھنے کی غرض سے جو بعض ضروری ملکی انتظامات سرانجام پائے تھے اُن سے زیادہ ضروری مسلمانوں کے مذہبی امور کے انتظامات کا مسئلہ تھا، یہودیوں میں مذہبی فرائض کے ادا کرنے کے لیے ایک مخصوص خاندان مقرر تھا، اس کے علاوہ کسی اور کو ان خدمات کی بجا آوری کا حق حاصل نہیں ہوسکتا تھا عیسائیوں میں گو خاندان کی تخصیص نہ تھی، لیکن اُن میں ایک خاص طبقہ پیدا ہوگیا تھا جس نے ان خدمات کو اپنا حق قرار دے لیا تھا، ہندوؤں میں غیر برہمن کسی مذہبی خدمت کا مستحق نہیں، دنیا کی اور دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا لیکن جو شریعت محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دنیا میں قایم کی اُس میں مخصوص اشخاص، مخصوص خاندان، اور مخصوص طبقہ کی حاجت نہ تھی، بلکہ ہر شخص جو اسلام کا کلمہ گو تھا اِس رتبہ کا مستحق ہوسکتا تھا،)

دعاۃ اور معلمِ اسلام

ایک مشہور مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ "مدینہ میں آکر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا، اور اب اسلام کے معنی بجائے اس کے کہ خدا پر ایمان لایا جائے، یہ رہ گئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکومت تسلیم کرلی جائے[1]" اسلام کا مقصد، وہ تھا جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا — (وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ — قایم کریں، زکوۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں، اور
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ، (حج) — بُری باتوں سے روکیں)

اِس بنا پر ہر مسلمان، واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی، داعی مذہب بھی اور ماہر شریعت بھی، یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اس قدر جہالت پائی جاتی تھی کہ شرفا میں لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا، یا ایک ایک گھر، فقہ، حدیث اور تفسیر کا دار العلم بن گیا تاہم چونکہ ہر شخص کو تفقہ و تدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا، اس لیے

---

[1] دیکھو ولہوسن صاحب کا آرٹیکل اسلام پر (انسائیکلوپیڈیا)

یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود رہیں جو تعلیم و ارشاد کا فرض انجام دے سکیں اسی بنا پر قرآن مجید میں حکم آیا

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ	اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آسکتے، اس لیے
كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا	ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہیے تاکہ وہ شریعت اور دین میں
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝	تفقہ حاصل کریں، اور تاکہ واپس جاکر اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ وہ
(توبہ، رکوع آخر)	لوگ بری باتوں سے بچیں

ان کی تعلیم و تربیت | چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت طیار کی جائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر و نواہی سے واقف ہو، بلکہ شب و روز آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں رہنے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے جس کی گفتار، کردار، بات چیت، نشست برخاست، قول و عمل ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے پرتو سے منور ہو جائے تاکہ وہ تمام ملک کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بن سکے، اس لیے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی اور آپ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتی تھی

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

كان ينطلق من كل حي من العرب عصابة فيأتون	عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
النبي صلى الله عليه وسلم فيسألونه عما يريدون من	جاتا تھا اور آپ سے مذہبی امور دریافت کرتا تھا اور دین میں
أمر دينهم ويتفقهون في دينهم[1]	تفقہ حاصل کرتا تھا

داعیانِ اسلام جو اطراف عرب میں بھیجے جاتے تھے اُن کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ میں آجائیں اور یہیں بود و باش اختیار کریں اس کا نام ہجرت تھا اس بنا پر بیعت کی دو قسمیں کر دی گئی تھیں بیعت اعرابی، اور بیعت ہجرت، بیعت اعرابی صرف ان بدوؤں کے لیے

---

[1] تفسیر جامع البیان سورہ توبہ آیت وما كان المؤمنون لينفروا كافة

حکو مدینہ منورہ میں رکھکر تعلیم دینا مقصود ہوتا تھا مختصر شکل الآثار میں روایت ہے کہ عقبہ جہنی جب اسلام لائے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے دریافت کیا کہ بیعت اعرابی کرتے ہو، یا بیعت ہجرت، اس کے بعد مصنف لکھتا ہے

ان البیعۃ من المہاجر توجب الاقامۃ عندہ صلی اللہ علیہ وسلم لیصرف فیما یصرفہ فیہ من امور الاسلام بخلاف البیعۃ الاعرابیۃ۔	ہجرت کی بیعت کرنے سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کرے تاکہ آنحضرت صلعم کو ان اسلامی امور میں لگائیں اور بیعت اعرابی میں یہ ضرور نہیں

اسی بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کرکے مدینہ میں چلے آئے تھے، حضرت ابو موسیٰ اشعری آئے تو اسی شخصوں کو لیکر آئے اور مدینہ میں آباد ہوئے خلاصۃ الوفاء سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جہینہ وغیرہ قبایل کی الگ الگ مسجدیں تھیں یہ وہی قبایل تھے جو ہجرت کرکے مدینہ میں آگئے تھے اور چونکہ مسجد نبوی سب کے لیے کافی نہ تھی اس لیے الگ الگ مسجدیں بنگئی تھیں۔

تعلیم وارشاد کے مختلف طریقے تھے۔

ایک یہ کہ دس بیس دن، یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسایل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبایل میں واپس جاتے تھے اور ان کو تعلیم دیتے تھے مثلاً مالک بن الحویرث جب سفارت لیکر آئے تو بیس دن تک قیام کیا، اور ضروری مسایل کی تعلیم حاصل کی جب چلنے لگے تو آپ نے فرمایا۔

ارجعوا الی اہلیکم فعلّموہم ومروہم وصلوا کما رأیتمونی اُصلّی، (بخاری باب رحمۃ البہائم)	اپنے خاندان میں واپس جاؤ ان میں رہکر انکو امور شریعت کی تعلیم دو اور جس طرح مجھکو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو

دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے اور عقاید شریعت، اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے اُن کے لیے صُفّہ کا خاص درسگاہ تھا اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہوکر شب و روز، زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمت علم میں مصروف رہتے تھے

مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) مسجد میں تشریف لے گئے اُسوقت

مسجد میں دو حلقے تھے، حلقۂ ذکر، اور حلقۂ درس آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) حلقۂ درس میں جا کر بیٹھ گئے۔

اُس وقت کی اصطلاح میں ان طالبانِ علم کو قُرّاء کہتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہر جگہ یہی نام آتا ہے۔ غزوہ میں جو لوگ تعلیم و ارشاد کے لیے گئے تھے اور کفار نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا وہ اسی درسگاہ کے تربیت یافتہ تھے، اور کتب حدیث میں انکا نام اسی لقب (قُراء) کے ساتھ آیا ہے[1] ارباب سیر نے لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا تو اُس جماعت سے نکل آتا تھا اور انکے بجائے دوسرے لوگ داخل ہوتے تھے

اصحاب صفہ، اگرچہ اس قدر مفلس اور نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جسکو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے کہ چادر اور تہمد دونوں کا کام دیتا تھا تاہم یہ لوگ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چُن لاتے تھے اور انکو بیچ کر آدھا خیرات کر دیتے تھے اور آدھا اخوان طریقت میں تقسیم ہوتا تھا اس بنا پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا تھا بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درسگاہ کے معلمین میں سے حضرت عبادہ بن الصامت بھی تھے جو مشہور صاحب علم تھے اور جنکو حضرت عمرؓ نے زمانہ خلافت میں تعلیم فقہ و قرآن کے لیے فلسطین بھیجا تھا ابو داؤد میں حضرت عبادہ بن الصامت سے روایت ہے۔

علمت ناسا من اھل الصفۃ القرآن والکتابۃ فاھدی الی رجل منھم قوسا (صفحہ ۱۲۹، جلد دوم)

میں نے اصحاب صفہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی اس کے صلہ میں مجھکو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے عبادہ کو اس تحفہ کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درسگاہ صفہ کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی جہاں اصحاب صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے مسند امام ابن حنبل میں ہے

عن انس کانوا سبعین فکانوا اذا جنھم اللیل انطلقوا الی معلم لھم بالمدینۃ فیدرسون اللیل حتی یصبحوا (مسند جلد ۳ صفحہ ۱۳۷)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے ستر شخص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے۔

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ بیر معونہ۔

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا لیکن اسلام آیا تو تحریر و کتابت کا فن بھی گویا ساتھ لیکر آیا، سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید کے ضبط و تدوین کی تھی، اس بنا پر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے شروع ہی سے کتابت کی ترویج کی طرف توجہ فرمائی، جنگ بدر کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ اسیران جنگ میں سے جو لوگ فدیہ نہیں ادا کر سکے ان کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ مدینہ میں رہ کر لوگوں کو لکھنا سکھا دیں، ابو داؤد کی مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس میں لکھنا بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت عبادہ قرآن مجید کے ساتھ، لکھنے کی بھی تعلیم دیتے تھے۔

مساجد کی تعمیر | (آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) اگرچہ زینت و جاہ پرستی سے طبعاً نفور تھے، اور اسلیے اینٹ اور مٹی پر صرف زر نا پسند فرماتے تھے، تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تسبیح و تقدیسِ الٰہی تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی، ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں، بلکہ درحقیقت یہ تمام اہل قریہ یا اہل محلہ کو دن میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے ان کے اجتماعی اور اتحادی قوت کو زور بزور اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بنتی تھیں، اس لیے آپ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے۔

خود مدینہ کے اندر بہت سے قبائل آباد تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا، اور ہر محلہ میں ایک ایک مسجد تھی، ابو داؤد نے کتاب المراسیل میں بہ سند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپ کے زمانہ میں ۹ مسجدیں تھیں، جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں، ان کے نام یہ ہیں، مسجد بنی عمرو [1]، مسجد بنی ساعدہ [2]، مسجد بنی عبید [3]، مسجد بنی سلمہ [4]، مسجد بنی رابح [5]، مسجد بنی زریق [6]، مسجد غفار، مسجد اسلم، مسجد جہینہ [9]، ان کے علاوہ متفرق روایات میں، مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے، مسجد بنی خدرہ [10]، مسجد بنی امیہ [11] (انصار کا ایک قبیلہ تھا) مسجد بنی بیاضہ [12]، مسجد بنی الحبلی [13]، مسجد بنی عصیہ [14]، مسجد ابی فضیل [15]، مسجد بنی دینار [16]، مسجد ابی بن کعب [17]، مسجد السابقہ [18]، مسجد ابن عدی [19]، مسجد الحارث بن خزرج [20]، مسجد بنی خطمہ [21]، مسجد الفصیح [22]، مسجد بنی حارثہ [23]، مسجد بنی ظفر [24]، مسجد بنی عبد الاشہل [25]، مسجد واقم [26]، مسجد بنی معاویہ [27]، مسجد عاتکہ [28]، مسجد بنی قریظہ [29]، مسجد بنی وائل [30]، مسجد الشجرہ [31] ([2])

---

[1] اصابہ ناحم باب مودمس "[2] یہ تمام تفصیل عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۶۴ سے ماخوذ ہے،

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعت اسلام کے ساتھ ہی مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں بنتی جاتی تھیں جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غزوات میں معمول کرلیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ فرماتے، چنانچہ ایک سفر جہاد میں آپ کے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی تو آپ نے فرمایا "یہ تو فطری شہادت ہے" اس کے بعد آپ نے اشہد ان لا الہ الا اللہ کی آواز سنی تو فرمایا "آگ سے نجات ہوگی"، صحابہ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکرے کے چرواہے کی آواز تھی[1]۔ تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپ نے ایک سریہ کو روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی،

اذا رأیتم مسجدا او سمعتم مؤذنا — اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز سنو تو وہاں

فلا تقتلوا احدا[2]، — کسی شخص کو قتل نہ کرو،

ان روایتوں سے ایک طرف تو عہد نبوت میں اشاعت اسلام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لائے تھے، انھوں نے الگ الگ مسجدیں تعمیر کرلی تھیں، اور ان میں پنجوقتہ غلغلۂ تکبیر و اذان بلند ہوا کرتا تھا،

اگرچہ اس وقت کی عام عسرت اور سادگی کی وجہ سے جو مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں، وہ ایک زمانۂ ممتد تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں، اسلیے ان باقیات الصالحات کا بہت بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اور اُن کے ساتھ انکا نام اور ان کی تاریخ بھی مٹ گئی، تاہم جو مسجدیں مدتوں قائم رہیں ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا کوئی گوشہ ان مذہبی یادگاروں سے خالی نہ تھا[3]۔

عرب کے عام قبائل سے پہلے بحرین کا ایک قبیلہ **عبدالقیس** اسلام لاچکا تھا، اس قبیلہ نے ایک مسجد

---

[1] صحیح مسلم جلد اوّل کتاب الاذان باب الامساک عن الاغارۃ علی قوم فی دار الکفر اذا سمع فیہم الاذان [2] ابوداؤد کتاب الجہاد فی دعاء المشرکین [3] نسائی کتاب المساجد صفحہ ۱۱۸،

تعمیر کی تھی، چنانچہ اسلام میں مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی، بخاری کتاب الجمعہ میں ہے،

عن ابن عباس انہ قال ان اول جمعۃ جمعت	حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد
بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلعم فی	پہلا جمعہ قبیلہ عبدالقیس کی مسجد میں پڑھا گیا جو بحرین کے ایک
مسجد عبد القیس بجواثی من البحرین،	گاؤں جواثی نامی میں واقع تھی

اہل طائف جب اسلام لائے تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ خاص اس جگہ مسجد تعمیر کرائیں، جہاں ان کا بت نصب[1] تھا، حضرت طلق بن علی سے روایت ہے کہ جب ہماری قوم کے لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہمنے عرض کی کہ ہمارے ملک میں ایک گرجا ہے تو آپ نے اپنے وضو کا پانی عنایت فرمایا، اور ہدایت کی کہ گرجے کو توڑ ڈالو اور وہاں یہ پانی چھڑک کر مسجد بنالو، چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو حسب ارشاد مسجد تعمیر کرلی[2]

اس قسم کی مسجدیں اگرچہ عرب کے گوشہ گوشہ میں تعمیر ہوئی ہوں گی لیکن عموماً احادیث کی کتابوں سے صرف ان مسجدوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے، جو مدینہ اور حوالی مدینہ میں تعمیر ہوئیں، صحیح مسلم میں ہے کہ حوالی مدینہ میں انصار کے جو گاؤں آباد تھے، عاشورا کے دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک دن اُن میں منادی کرا دی کہ جو لوگ روزہ دار ہیں وہ اپنے روزے کو پورا کرلیں، اور جو لوگ افطار کرچکے ہیں وہ بقیہ دن روزہ رکھیں، اس اعلان کے بعد صحابہ نے اسپر اس شدت کے ساتھ عمل کیا کہ خود روزے رکھتے تھے اور اپنے بچوں سے روزے رکھواتے تھے، یہاں تک کہ انکو گھر سے باہر مسجدوں میں لے جاکر رکھتے تھے اور جب وہ کھانے کے لیے روتے تھے تو ان کو اون کے بنے ہوئے کھلونوں سے بہلاتے تھے[3]،

---

[1] زاد المعاد جلد اول صفحہ ۴۸۵، بروایت ابوداؤد الطیالسی، [2] سنن نسائی کتاب المساجد، [3] صحیح مسلم کتاب الصیام، باب من اکل فی عاشوراء فلیکف بقیۃ یومہ،

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے کہ مساجد کو اشخاص کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس باب کے تحت میں جو حدیث لائے ہیں، اس میں بتصریح مسجد بنی زریق کا نام لیا ہے، حضرت انس بن مالک، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ کر اپنے محلہ میں آتے تھے، یہاں لوگ مسجد میں منتظر رہتے تھے، وہ آکر کہتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ہو چکی تب لوگ یہاں نماز پڑھتے تھے[1]، ان روایتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان قبایل کی مسجدیں الگ الگ تھیں، صحاح کی روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنی قوم کی امامت کر کے آتے تھے اور پھر دوبارہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ شریک جماعت ہو جاتے تھے، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل کا اسی پر عمل تھا، مدینہ میں جو قبایل آباد تھے اُن کے علاوہ جو قبایل ہجرت کر کے آئے تھے وہ بھی اپنی مسجد تعمیر کر لیتے تھے، چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے

ولجهينة مسجد بالمدينة[2]، مدینہ میں جہینہ کی ایک مسجد ہے

قبائل کی ضروریات کے علاوہ مسجدوں کی تعمیر کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا تھا کہ آں حضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) راہ میں جہاں کہیں نماز پڑھتے تھے وہاں صحابہ تبرکاً مسجد تعمیر کر لیتے تھے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے، باب المساجد التی علی طرق المدینة والمواضع التی صلی فیها النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی وہ مسجدیں جو مدینہ کے راستوں اور ان مقامات میں واقع ہیں جہاں آپ نے نماز پڑھی ہے، اور اس کے تحت میں اس قسم کی متعدد مسجدوں کا نام لیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے ان کے حسب ذیل نام گنائے ہیں،

مسجد قبا، مسجد الفضیخ، مسجد بنی قریظہ، مشربہ ام ابراہیم، مسجد بنی ظفر یا مسجد بغلہ، مسجد بنی معاویہ، مسجد فتح، مسجد القبلتین

حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے[3] کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں جو مسجدیں منقش پتھروں سے تعمیر ہوئی ہیں اُن سب میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نماز ادا فرمائی ہے، کیونکہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے جب ان مساجد کی تجدید

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۳۲ [2] طبقات ابن سعد جزء رابع صفحہ ۱، [3] فتح الباری جلد اول صفحہ ۱۷۴

کی تھی تو اہل مدینہ سے اس کی تحقیق کرلی تھی)

ائمہ مساجد کا تقرر | مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مختلف قبایل کے لیے الگ الگ امام مقرر کر دیے جائیں عموماً عادت شریف یہ جاری تھی کہ جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا، اس میں جو شخص سب سے زیادہ حافظ قرآن ہوتا، وہی امام مقرر کر دیا جاتا، اور اس شرف میں چھوٹے بڑے، غلام اور آقا سب برابر تھے، آپ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ میں جو مہاجرین آچکے تھے، اُن کے امام حضرت ابو حذیفہ رض کے آزاد کردہ غلام سالم رض تھے، جرم کا قبیلہ جب اسلام لایا، تو عمرو بن سلمہ جرمی اسوقت سات یا آٹھ برس کے کم سن بچہ تھے، لیکن چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے، اس لیے وہی امام قرار پائے،

امامت کے انتخاب کے لیے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے چند اصول مقرر فرما دئے تھے،

عن ابی مسعود الانصاری، قال قال رسول اللہ	ابو مسعود انصاری سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ
صلعم یؤم القوم اقرأهم لکتاب اللہ فان کانوا	جماعت کی امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا
فی القراءة سواء فاعلمهم بالسنة فان کانوا	ہو، اگر اس میں سب برابر ہوں تو جو سب سے زیادہ واقف
فی السنة سواء فاقدمهم هجرة فان کانوا فی	ہو، اگر اس میں بھی مساوات ہو تو جس نے پہلے ہجرت کی تھی
الهجرة سواء فاقدمهم سناً، (مسلم)	اگر اس میں بھی برابر ہوں تو جسکی عمر زیادہ ہو۔

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ پوچھتے کہ تم میں سب سے زیادہ حافظ قرآن کون ہے اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو لوگ اس کا نام لیتے، اور آپ اُس کو اُس عہدہ پر خود ممتاز فرماتے، چنانچہ اہل طایف کے امام عثمان بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے تھے، اور اگر سب مساوی الحیثیت ہوتے تو ارشاد ہوتا، تم میں جو بڑا ہو وہ جماعت کی امامت کرے، مالک بن حویرث جب اپنی قوم کی طرف سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہی ارشاد فرمایا

---

[1] فتح الباری جلد اول صفحہ ۴۷۱،

مدینہ میں، مدینہ سے باہر اطراف میں، عرب کے مختلف صوبوں میں جہاں جہاں مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں، ظاہر ہے کہ وہاں ہر جگہ الگ الگ امام مقرر ہوئے ہوں گے، جن قبایل میں عمال مقرر ہوتے تھے، وہی اُن کے امام بھی ہوتے[1] تھے، بڑے بڑے مقامات میں یہ دونوں عہدے الگ الگ ہوتے تھے، عمان میں حضرت عمرو بن العاص عامل تھے، اور ابو زید انصاری امام[2]، لیکن افسوس ہو کہ احادیث وسیر کی کتابوں میں نام بنام انکی مستقل تفصیل مذکور نہیں ہے، ضمنی واقعات میں جہاں تک سراغ لگ سکا ہے وہ حسب ذیل ہی،

نام	مقام تقرر	کیفیت
مصعبؓ بن عمیر،	مدینہ منورہ مسجد نبوی	ہجرت نبوی سے پہلے انصار کی امامت کرتے تھے، (دابن ہشام ذکر بیعت عقبہ،)
سالم مولی ابی حذیفہ رض،	"	آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کے امام تھے، (بخاری وابوداؤد)
ابن ام مکتوم،	"	جب آپ مدینہ سے باہر غزوات میں تشریف فرما ہوتے تو اکثر صحابہ بھی ہمرکاب ہوتے لیکن چونکہ یہ آنکھوں سے معذور تھے اس لیے مدینہ ہی میں رہتے تھے، اس سبب سے اس موقع پر انھیں کو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) امام مقرر فرما جاتے (ابوداؤد)
ابو بکر صدیق رض،	"	آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی عدم تشریف آوری پر مسجد نبوی میں امام ہوتے تھے (صحیح بخاری وابوداؤد)
عتبانؓ بن مالک،	بنو سالم	اپنے قبیلہ کے امام تھے، (ابوداؤد، ونسائی)
معاذؓ بن جبل،	بنو سلمہ	" (بخاری وغیرہ)

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ [2] فتوح البلدان بلاذری

نام	مقام تقرر	کیفیت
ایک انصاری	مسجد قبا	اپنے قبیلہ کے امام تھے، (بخاری)
عمرو بن سلمہ	بنو جرم	" (ابوداؤد و نسائی)
اسید بن حضیر		(ابوداؤد)
انس بن مالک (یا کوئی دوسرے صحابی)	بنو نجار	" " امام کا نام مشکوک ہے (مسند جلد ۳ صفحہ ۲۳۲)
مالک بن حویرث	"	(ابوداؤد)
عتاب بن اسید	مکہ معظمہ	(نسائی[1])
عثمان بن ابی العاص	طائف	" (ذکر وفد طائف)
ابو زید انصاری	عمان	" (بلاذری ذکر عمان)

مؤذن (عام طور پر اذان کے لیے کوئی خاص شخص منتخب نہیں کیا جاتا تھا، تاہم چند مثالوں سے قیاس ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں یہ عہدہ الگ آپ نے قائم فرمایا تھا، چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اس عہدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحبوں کو ممتاز فرمایا تھا،

بلال بن رباح	مدینہ منورہ	مؤذن مسجد نبوی،
عمرو بن ام مکتوم قرشی	"	"
سعد القرظ	عوالی مدینہ	مؤذن مسجد قبا،
ابو محذورہ جمحی قرشی	مکہ مکرمہ	مؤذن مسجد حرام[2])

[1] کتب مذکورہ کے کتاب الصلوۃ سے یہ نام ملتقط ہیں [2] نسائی صفحہ ۱۸

تاسیس و تکمیل شریعت

— اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا،

آج ہم نے تمہارا مذہب کامل کردیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی، اور اسلام کو تمہارے لیے مذہب پسند کیا

(یہ تمام انتظامات اور نظم و نسق اسلام کا حقیقی نصب العین نہ تھا، بلکہ جیسا کہ تفصیل بیان کیا جاچکا ہے، یہ اس لیے تھا کہ ملک میں امن و امان پیدا ہو، اور ایک منتظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو، تاکہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلامزاحمت، اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے،

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ — ان کافروں سے جہاد کرو، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے،

وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ، — اور مذہب تمامتر خدا کے لیے ہوجائے،

انھوں نے فرمایا کہ "یہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں تھا، جب اسلام کم تھا، آدمی اپنے مذہب کی بنا پر فتنہ میں مبتلا ہوجاتا تھا، لوگ اُس کو قتل کردیتے تھے، اب جب اسلام ترقی کرگیا تو کوئی فتنہ نہیں رہا[1] "

ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمامتر (انھیں فتنوں کی دار وگیر، مخالفین کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن و امان قائم کرنے میں گذرا، اسی لیے) آٹھ برس کی وسیع مدت میں فرائض اسلام میں سے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف جہاد ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی تفصیل سیکڑوں صفحے میں ہے، لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق دو دو چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم ہوتا ہے تو اس قدر لکھدیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہوگئیں

اسکی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ ارباب سیر دیگر فرائض کی اہمیت اور عظمت پیش نظر نہیں رکھتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت (اور ملک کی بدامنی) کی وجہ سے اکثر فرائض دیر میں فرض ہوئے، اور جو پہلے فرض

([1] بخاری جلد ا صفحہ ۶۷ تفسیر سورۂ انفال،)

ہو چکے تھے، ان کی تکمیل بھی تدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی جس کے لیل و نہار زیادہ تر مخالفین کے تیر باراں کے روکنے میں بسر ہو گئے

جن احکام کا تعلق قانون ملکی سے تھا، وہ اس وجہ سے نازل نہ ہو سکے کہ اب تک اسلام کوئی حکمراں طاقت نہ تھا، خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اُسی زمانہ میں نازل ہوتے رہے، اور بتدریج جیسے جیسے اُن کے مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے، وہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے، سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں یہ تھا کہ اُن سے مقصود محض عربوں کو ایک نیا دین بتانا نہیں تھا، بلکہ عملاً ایک زندگی کو ان پر کار بند بنا دینا تھا، اس لیے نہایت آہستہ آہستہ، بتدریج، ترتیب کے ساتھ، اُن کو آگے بڑھایا گیا، اسی نکتہ کو حضرت عائشہؓ نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ "پہلے عذاب و ثواب کی آیتیں نازل ہوئیں، جب دلوں میں استعداد اور رقت پیدا ہو گئی، تو احکام نازل ہوئے، ورنہ اگر پہلے ہی دن یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو، تو کون مانتا؟"[1]

الغرض ان مختلف اسباب کی بنا پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اُس وقت تکمیل کو پہنچے جب تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا) مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ سرے سے فرض نہیں ہوا، مدینہ منورہ میں روزے فرض ہوئے، لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی، اسکی وجہ یہی تھی، رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک پہنچنے کہاں پائی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آئے، فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین مقدس میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے، اس لیے اسوقت تک حج بھی فرض نہ ہوا نماز روزانہ کا فرض ہے، اور یہ فرض اسلام کے وجود کے ساتھ آیا، لیکن اسکی تکمیل بتدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی، ۸ھ ہجری تک نماز میں بات چیت کرنا جائز تھا، اور کوئی باہر کا آدمی سلام کرتا، تو نمازی عین نماز میں جواب دیتے تھے، جیساکہ ابوداؤد وغیرہ میں متعدد روایتیں مذکور ہیں[2]۔

غرض فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا، اور تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا، تو مذہبی احکام کی تفصیل،

---

[1] صحیح بخاری باب تالیف القرآن [2] ابو داؤد باب رد السلام فی الصلوٰۃ

اور نظام شریعت کی تکمیل کا موقع آیا، احکام بہت سے ایسے تھے جو سرے سے ابھی شروع ہی نہیں ہوئے تھے، مثلاً زکوٰۃ حج، حرمت ربا، وغیرہ، بہت سے ایسے تھے کہ ابتدائی ارکان قائم ہو گئے تھے لیکن تکمیل نہیں ہوئی تھی[1]،

عقاید[2] اور اسلام کے اصول اولین

(اسلام کے فرائض اولین عقاید ہیں یعنی، توحید، رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر و نشر، وغیرہ پر ایمان لانا) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اول اول جو وحی نازل ہوئی، یعنی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، اس میں خدا کی بڑائی کے سوا کسی مخصوص عقیدہ کی تعلیم نہ تھی، لیکن دوسری بار جو وحی نازل ہوئی وہ یہ تھی[3]،

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ	اے چادر اوڑھنے والے اٹھ، لوگوں کو ڈرا، اپنے پروردگار
وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ (مدثر)	کی بڑائی کر، اور بتوں کو چھوڑ دے،

اس کے بعد مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ بیشتر عقائد کے متعلق تھیں، شرک، اور بت پرستی کی برائی، خدا کی عظمت و جلال کا اظہار، قیامت کے ہولناک سماں اور جنت و دوزخ کا پر اثر بیان، رسالت کے خواص اور اس کی ضرورت کے دلایل، مکہ میں تیرہ برس تک زیادہ تر یہی مطالب ادا ہوتے رہے[4]

غرض عقاید کے تمام اجزا اگرچہ آغاز اسلام ہی میں لوگوں کو سنائے جا چکے تھے، لیکن مکی آیتوں کے استقصا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا بیان اب تک الگ الگ ہوتا تھا، عقاید کا مسلسل بیان سورۂ بقرہ، اور سورۂ نساء میں ہے، اور یہ دونوں سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، مکی سورتوں میں زیادہ تر زور، توحید، قیامت، کے اعتقاد،

---

[1] اسلام کے بعض احکام کے نزول اور تدریجی تکمیل کی تاریخ جلد اول کے واقعات متفرقہ کے تحت میں بھی ضمناً گذر چکی ہے، بایں ہمہ ایک دو جگہ احکام کی تاریخ اور سنین میں یہاں سے اختلاف پائیں گے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جلد اول میں عام مورخین اور ارباب سیر کی تقلید کی گئی ہے اور یہاں احادیث اور کتب شان نزول سے استقرا کر کے جو امر محقق نظر آتا ہے اسکی تفصیل کی گئی ہے اور اصل یہ کہ احکام کے سنین اور تاریخیں کتب حدیث میں بالتصریح مذکور نہیں ہیں، محدثین اور ارباب روایت کے قیاسات اور استنباطات ہیں، اور اسی بنا پر باہم ان میں اختلافات ہیں، ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح اور معتبر دلایل کی رہنمائی سے اس راستہ کو طے کریں والعصمۃ بید اللہ (س)،

[2] اصابہ ناجم باب ''دہم''، [3] صحیح بخاری تفسیر سورہ مدثر،

[4] صحیح بخاری باب تالیف القرآن،

اور رسولؐ کی صداقت پر صرف ہوا ہے، لیکن مدینہ آکر اسلام کے تمام عقاید اور اصول اولیں کی مجموعی تعلیم شروع ہوجاتی ہے

ایمان اور اسلام کے اصول اولیں کے متعلق سورۂ بقرہ کی سب سے پہلی آیت یہ ہے،

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ، وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ،

جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں نماز کھڑی کرتے ہیں ہمنے جو روزی دی ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور جو اُن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے محمدؐ) تجھ پر اُتاری گئیں اور جو تجھ سے پہلے نازل ہوئیں، اور ان کو آخرت پر بھی یقین ہے۔

وسط سورہ میں یہ اصول دوبارہ ادا ہوتے ہیں،

لَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ،

لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی خدا پر، روز قیامت پر، فرشتوں پر کتاب پر پیغمبروں پر ایمان لائے۔

اس کے بعد نماز، زکوٰۃ، اور بعض اخلاقی احکام گنائے گئے ہیں، یہ آیتیں تحویل قبلہ کی آیت کے ساتھ سنہ ۲ھ میں نازل ہوئیں،[1]

اسی کی تفصیل سورہ کے آخر میں کی گئی ہے، یہ آیتیں ہجرت کے چند سال بعد غالباً نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی روایتوں سے ثابت ہے،[2]

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ،

پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس پر اترا، اور تمام مسلمان خدا پر خدا کے فرشتوں پر، اسکی کتابوں پر، اور اُس کے پیغمبروں پر سب ایمان لائے

سورۂ نساء کی آیت یہ ہے جس میں تفصیل بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوچکے ہیں، اُن کے کیا عقاید ہونے چاہئیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اسکے رسول پر

[1] صحیح بخاری تفسیر یمحق اللہ الربوا۔ [2] اسباب النزول سیوطی، بحوالہ صحیح مسلم ومسند احمد،

الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ — اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری، اور اس کتاب

اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ — پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اُس کے فرشتوں کا

وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا — اور اسکی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا، اور روز آخرت

بَعِیْدًا، — کا انکار کریگا وہ سخت گمراہ ہوا۔

احادیث کتاب الایمان میں بہت سے ایسے واقعات مذکور ہیں جنمیں لوگوں نے آپ سے اسلام اور ایمان کے معنی دریافت کیے ہیں، اور آپ نے سائل کی، یا وقت کی، مناسبت سے مختلف جوابات دیے ہیں، آپ نے فرمایا کہ مجھکو حکم دیا گیا ہے کہ میں اسوقت تک لڑوں جب تک لوگ یہ گواہی دیں، خدا ایک ہی، محمد خدا کا پیغمبر ہے، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں،"

ایک دفعہ کسی دیہات سے ایک مسلمان حاضر خدمت ہوا، اور دریافت کیا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہی؟ آپ نے تین چیزیں بتائیں، "رات دن میں پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے، اور زکوٰۃ، عبدالقیس کے وفد نے سنہ ۵ میں حاضر ہوکر عرض کی کہ ہم دشمنوں کی مزاحمت کے سبب سے ہمیشہ نہیں حاضر ہوسکتے اس لیے ایسے احکام بتا دیے جائیں جو ان لوگوں کو بھی بتا دیے جائیں، جو شرف حضوری حاصل نہیں کرسکتے ہین، آپ نے فرمایا،

شهادة أن لا إله إلا الله، وأن محمدا رسول الله — اس بات کی شہادت کہ خدا ایک ہی ہے، محمد خدا کے پیغمبر ہیں

وإقام الصلوة وإيتاء الزكوة، وصيام رمضان — نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، روزے رکھنا، اور مال غنیمت میں

وأن تعطوا من المغنم الخمس، — سے پانچواں حصہ دینا،

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص نے آکر سوال کیا، ایمان کیا چیز ہی؟ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ خدا پر، فرشتوں پر، خدا کی ملاقات پر، اس کے پیغمبروں پر، اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر یقین ہو،" اُس نے پوچھا اور اسلام کیا ہے، فرمایا، "اسلام یہ ہے کہ صرف خدا کو پوجو، کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اسنے پھر دریافت کیا کہ "احسان کسکو کہتے ہیں" ارشاد ہوا کہ

خدا کی اس طرح عبادت کرو، گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ سمجھو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے،

یہ اصول اسلام کا تقریباً کامل نقشہ ہے، غالباً یہ سوال وجواب فتح مکہ یعنی ۸ھ سے پہلے کا واقعہ ہے، کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے، تاہم اس قدر اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ تکمیل عبادت کے لیے خضوع وخشوع کی قید بھی اضافہ کیجاسکی

اصول اسلام کا آخری اعلان یہ ہے،

بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الہ الا اللّٰہ	اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے، اس بات کی گواہی
وان محمدا رسول اللّٰہ واقام الصلوٰۃ وایتاء	کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں، محمدؐ اسکا پیغمبر ہے، نماز پڑھنا
الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان،	زکوٰۃ دینا، حج کرنا رمضان کے روزے رکھنا۔

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصول کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی آپ نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں جن میں ایک شاخ حیا ہے، ایک دفعہ فرمایا کہ بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان اسکی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے، ایک اور صاحب کے جواب میں فرمایا کہ بہترین اسلام یہ ہے کہ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ، اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو، مگر اسکو سلام کرو، یہ بھی فرمایا کہ اسوقت تک تم مومن نہیں جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو[۱]۔

غرض اسلام کے تمام اصول وفروع کی تعلیم اسی طرح بتدریج تکمیل کو پہونچتی گئی، اور آخر ۹ ذیحجہ ۱۰ھ جمعہ کے روز وہ ساعت آئی جب خدانے فرمایا[۲]،

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، (مائدہ)	آج ہم نے تمہارا مذہب کمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

عبادات

اوپر یہ حدیث گذر چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے، ان میں سے توحید ورسالت کے علاوہ بقیہ

۱؎ یہ تمام حدیثیں صحیح بخاری کتاب الایمان میں ہیں۔ ۲؎ صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور،

چار چیزیں یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عبادات میں داخل ہیں، ان میں سب سے اول شے نماز ہے، نماز کی صحت کے لیے متعدد شرائط ہیں سب سے اوّل اور ضروری شرط طہارت ہے،

طہارت طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس، ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو، طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، اُسکا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی دفعہ کی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا تو توحید کے بعد دوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ — اے چادر اوڑھنے والے اٹھ، اور ڈرا، اور اپنے

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، (مدثر) — کپڑے پاک کر، اور ناپاکی کو چھوڑ دے،

اگرچہ مفسرین نے عموماً کپڑے کی طہارت سے "دل کی طہارت" اور "ناپاکی" سے "بت پرستی" مراد لی ہے، تاہم اس سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے، نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے، اس فرضیت کا ثبوت ابتداے اسلام سے ثابت ہوتا ہے، تاریخ و سیر اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغازِ وحی ہی میں حضرت جبریل نے آپ کو سکھایا[1] تھا، حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے[2] تھے لیکن قرآن میں وضو کا حکم بالاتفاق محدثین مدینہ میں نازل ہوا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا — مسلمانو! جب نماز کے لیے کھڑے ہو، تو منھ اور کہنیوں تک

وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا — ہاتھ دھولو، سر پر مسح کرو، اور ٹخنوں تک پاؤں دھو

بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ، — ڈالو،

یہ آیت سورۂ مائدہ میں ہے اور اس سورہ کی اکثر آیتیں ہجرت کے چار پانچ سال بعد کی ہیں، اس آیت کے متعلق بخاری میں تصریح ہے کہ وہ آیت تیمم کے ساتھ اتری ہے، آیت تیمم ۵ھ ہجری میں نازل ہوئی اسی بنا پر اکثر علما کی راے یہ ہے کہ وضو پر عمل تو پہلے سے تھا لیکن قرآن میں اس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد نازل ہوئی، ایسا

---

[1] ابن ہشام و فتح الباری بحوالہ مغازی ابن لہیعہ و امام احمد و ابن ماجہ، [2] فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۲۰۵ و طبرانی فی الاوسط،

معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً لوگ نہایت جلدی جلدی وضو کر لیتے تھے، کچھ حصہ بھیگتا تھا، کچھ نہیں بھیگتا تھا سنہ ھ میں یا اس کے بعد کے کسی سفر میں آپ مکہ سے واپس آرہے تھے، کچھ لوگ جھپٹ کر تالاب کے پاس پہنچے، اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھولیا، ایڑیاں کچھ کچھ خشک رہیں، آپ نے فرمایا[1]،

ویل للاعقاب من النار اسبغوا الوضوء — ان ایڑیوں پر دوزخ کی پھٹکار ہے، وضو کو کامل کرو۔

اس وقت سے اسباغ وضو، یعنی سکون و طمانیت کے ساتھ وضو کے تمام فرائض ادا کرنا، لازم قرار دیا گیا، اسباغ وضو کے فضائل آپ نے بیان فرمائے، ابتداءً وضو ٹوٹے یا نہ ٹوٹے، ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرتے تھے، لیکن آخر عام مسلمانوں پر حرج ہونے کے خیال سے ہر وقت ضروری نہ رہا[2]، اور اس کا اعلان آپ نے عملاً فتح مکہ کے وقت[3] فرمایا)

تیمم (وضو کے لیے پانی کی ضرورت ہے لیکن ہر وقت سفر میں اس کا ملنا مشکل ہے، پھر بیماری کی حالت میں پانی کا استعمال کبھی مضر ہے اسلیے سنہ ۵ھ میں تیمم کی آیت نازل ہوئی

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ	اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے
مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا	آئے، یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو، اور پانی میسر نہ آئے
صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ	تو طاہر مٹی لیکر اس سے تیمم یعنی منہ اور ہاتھوں کا اس سے مسح
مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ	کرلو، اللہ تمہیں کسی طرح کی تنگی کرنا نہیں چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے
يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ	کہ تمکو پاک و صاف کردے اور اپنا احسان تم پر پورا کردے
تَشْكُرُوْنَ ۝ (مائدہ)	تاکہ تم شکرگذار رہو

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق (سنہ ۵ھ) سے آپ واپس آرہے تھے، ام المومنین حضرت عائشہ ساتھ تھیں، مدینہ کے قریب جب قافلہ پہنچا تو اتفاقاً ام المومنینؓ کا ہار کہیں گر گیا، سارا قافلہ وہیں اتر پڑا، نماز کا وقت آیا تو پانی نہ ملا، تمام صحابہ پریشان خاطر تھے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی، اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی، مسلمانوں کو

[1] صحیح مسلم باب وجوب غسل الرجلین [2] فتح الباری بحوالہ ابو داؤد، و احمد، [3] صحیح مسلم،

اس اجازت سے بڑی خوشی ہوئی، اسید بن حضیر ایک صحابی نے کہا اے آل ابی بکر تم لوگوں کے لیے سرمایۂ برکت ہو"

حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) چھوٹے بچوں کو نماز میں کندھے پر چڑھا لیتے سجدہ میں جاتے وقت اتار دیتے، دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے تو پھر چڑھا لیتے، حضرت عائشہ باہر سے آتیں اور دروازہ کھٹکھٹاتیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھتے ہوئے، عین اسی حالت میں جا کر دروازہ کھول دیتے[1]، ان حدیثوں کی بنا پر بہت سے فقہا کی یہ رائے ہے کہ یہ سب افعال نماز نفل میں جائز ہیں، نفل کی تخصیص اس لیے کہ جن نمازوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے افعال کیے وہ فرض نہ تھیں، بلکہ نفل تھیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں، ایک حدیث میں صاف موجود ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) امامہ بنت ابوالعاص کو کاندھے پر چڑھائے مسجد میں آئے، اور نماز ادا کی[2]، ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں اسی زمانہ کی ہیں، جبکہ نماز میں بات چیت اور اس قسم کے حرکات ممنوع نہیں قرار پائے تھے،

رفتہ رفتہ نماز تکمیل کی اس حد کو پہنچی کہ وہ تمام تر خضوع وخشوع ومراقبہ ومحویت بن گئی،

قرآن مجید میں آیت اتری، قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ، یعنی فلاح پانے والے مسلمان، وہ مسلمان ہیں، جو خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں"، اس بنا پر نماز میں ادھر اُدھر دیکھنا یا کوئی حرکت خضوع وخشوع کے خلاف کرنا منع ہو گیا، نماز کے تمام ارکان کا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا لازمی قرار پایا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم کے سامنے نماز ادا کی اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح نہیں ادا کیے، تو آپ نے اُس سے فرمایا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی، جا کر پھر پڑھو"، اُس نے دوبارہ اسی طرح ادا کی، آپ نے پھر فرمایا کہ نماز نہیں ہوئی" تیسری دفعہ اُسے پوچھا کہ کیوں کر پڑھوں، آپ نے رکوع، سجدہ، قیام سب کی نسبت ہدایت کی کہ نہایت اطمینان کے ساتھ ادا کیے جائیں، چنانچہ صحیح بخاری[3] وغیرہ میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے

غرض یا تو یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، اتفاقاً شام سے تجارت کا قافلہ آیا، دس بارہ آدمیوں کے سوا جس قدر لوگ نماز میں شریک تھے، اُٹھ کر قافلہ کی طرف دوڑے، اُس پر

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب العمل فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد باب العمل فی الصلوٰۃ [3] صحیح بخاری باب امر النبی صلعم من لا یتم صلوٰۃ بالاعادۃ،

یہ آیت[1] اتری،

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا، قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۔

اور جب لوگ تجارت، یا کھیل تماشا دیکھ پاتے ہیں، تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تجھکو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں کہدے کہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے،

اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تعلیم سے یہ حالت ہوئی کہ ایک انصاری نماز کی حالت میں تین دفعہ تیر کا زخم کھاتے ہیں، لیکن نماز نہیں توڑتے کہ جو سورہ انھوں نے شروع کیا تھا، اسکی لذت معنوی اس درد زخم سے زیادہ تھی، اس سے بڑھکر یہ) کہ حضرت عمر فاروق نماز میں زخم کھا کر گرتے اور تڑپتے ہیں، یہ قیامت خیز منظر سب کے سامنے ہے، لیکن ایک شخص مڑکر نہیں دیکھتا، کیونکہ خشیت الٰہی اور محویت کا عالم خود دلوں پر طاری ہے وہ اور کسی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا،

نماز جمعہ اور عیدین مکہ میں چار شخصوں کا یکجا ہوکر نماز ادا کرنا ناممکن تھا، اس لیے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی (کیونکہ جمعہ کی پہلی شرط جماعت ہے) لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لاچکی تھی اور کوئی شخص ادائے نماز میں خلل انداز نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آچکے تھے، اسعد بن زرارہ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلہ میں انھوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا[2] کی، مصعب بن عمیر[3] امام تھے، اور کل چالیس مسلمان نمازی تھے، اس کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا یہاں سے روانگی کے لیے آپ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا، بنی سالم کے محلہ میں پہنچے تو نماز کا وقت آگیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں ادا فرمائی، یہ اواخر ربیع الاول سنہ ۱ھ کا واقعہ[5] ہے، مدینہ سے باہر عرب کے

---

۱ صحیح بخاری کتاب البیوع و تفسیر آیت مذکور۔ ۲ ابوداؤد و ابن ماجہ و دارقطنی کتاب الجمعہ بسند عبدالرزاق و احمد وغیرہ بحوالہ فتح الباری، ۳ ابن اسحاق

۴ ابوداؤد و ابن ماجہ وغیرہ، کتاب الجمعہ، ۵ طبری صفحہ ۱۲۵۶۔

دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی کثیر تعداد سب سے زیادہ جواثی میں تھی، جو بحرین میں واقع تھا، حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں قائم ہوئی[1]

لیکن بظاہر نماز جمعہ کا اہتمام مسلمانوں میں پہلے ایسا نہ تھا، جیسا کہ ہونا چاہیے، ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے، اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اتفاقاً شام سے غلہ کے بیوپاری آگئے، سب لوگ اُٹھکر اُدھر چلے گئے، جماعت میں صرف بارہ[2] آدمی، اور دوسری روایت کی رو سے چالیس آدمی[3] رہ گئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں،

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ	ایمان والو جب نماز جمعہ کے لیے پکارا جائے تو یاد الٰہی کی
مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ	طرف دوڑو، اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے
وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	بہتر ہے اگر تم کو علم ہو، جب نماز سے فارغ ہوجائے تو زمین
فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ	میں چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو، اور خدا کو اکثر
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ	یاد کیا کرو، تاکہ فلاح پاؤ، جب لوگ تجارت اور کھیل
كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً	تماشہ دیکھ پاتے ہیں، تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں، اور
اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا قُلْ	تجھکو اے پیغمبر، کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہدے کہ جو کچھ
مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ	خدا کے پاس ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے
وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (جمعہ)	اور خدا بہتر روزی دینے والا ہے

اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ نماز کے سامنے تمام دنیا کی دولت کا خزانہ بھی اُن کے آگے ہیچ ہوگیا، خدا نے انکی مدح فرمائی،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ	یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی

[1] صحیح بخاری کتاب الجمعہ، [2] صحیح بخاری باب الجمعہ، [3] دارقطنی کتاب الجمعہ،

ذِكْرِ اللّٰهِ ، — یاد سے غافل نہیں کرتی ،

عید کی نماز بھی مدینہ ہی میں آکر قائم ہوئی، لیکن جس سال آپ تشریف لائے اس سال عید کی نماز نہیں ہوئی، بلکہ ۲ھ میں مشروع[۱] ہوئی جسکی وجہ یہ ہے کہ عید کی نماز، روزۂ رمضان کے تابع ہے، اور رمضان کے روزے دوسرے سال فرض ہوئے)

نماز نماز آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے ساتھ فرض[۲] ہوئی، (چنانچہ دوسری ہی وحی میں حکم ہوا،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر) — اے پروردگار کی بڑائی (تکبیر) بیان کر،

اس تکبیر سے مقصود بجز نماز کے اور کیا ہوسکتا ہے، لیکن چونکہ تین برس تک دعوت اسلام مخفی رہی اور کفار کے ڈر سے علانیہ نماز پڑھنا ممکن نہ تھا، اس لیے صرف رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، دن میں کوئی نماز فرض نہیں ہوئی چنانچہ سورۂ مزمل میں جو ابتدائی سورتوں میں سے ہے یہ حکم بصراحت مذکور ہے،

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا — اے کملی اوڑھ کر سونے والے! رات کو تھوڑی دیر کے
نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ — علاوہ ساری رات اٹھ کے نماز پڑھا کر، آدھی رات تک
عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا إِنَّا — یا اس سے بھی کچھ کم کر یا اس سے بھی کچھ بڑھا دے، اور
سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا إِنَّ نَاشِئَةَ — قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات
اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا — ڈالنے والے ہیں، رات کا اٹھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے

[۱] طبری صفحہ ۱۲۸۱، لورپ، [۲] نماز کے سال تاریخ میں محدثین مختلف الرائے ہیں، ابن حجر نے فتح الباری (جلد اول صفحہ ۳۹۳) میں جو خلاصۂ مباحث نقل کیا ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے "ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ معراج سے پہلے رات کی غیر موقت نماز کے علاوہ کوئی اور نماز فرض نہ تھی، حربی کی رائے ہے کہ صبح وشام دو دو رکعتیں فرض تھیں، امام شافعی نے بعض اہل علم سے روایت کی ہے کہ پہلے رات کی (دیر تک) نماز فرض تھی، بعد ازیں فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ کی آیت سے یہ حکم منسوخ ہوگیا، اور صرف تھوڑی رات تک نماز فرض رہ گئی، اس کے بعد نماز پنجگانہ نے اس حکم کو بھی منسوخ کردیا،" ہم نے نماز کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ انہیں چند سطروں کی تفصیل ہے جسکی تطبیق قرآن مجید کی چند آیتوں سے کردی گئی ہے، اس تفصیل سے یہ گرہ بھی کھل جاتی ہے کہ قرآن مجید میں اوقات نماز کے مختلف بیانات کیوں ہیں؟ (س

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا	اور یہ وقت دُعا کے لیے مناسب بھی زیادہ ہے، دن کو
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ	تجھکو زیادہ شغل رہتا ہے، اپنے پروردگار کا نام لے سب
إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۞	سے ٹوٹ کر اسی کا ہو رہ،

اس کے بعد صبح وشام کی دو دو رکعتیں اور فرض ہوئیں

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا وَمِنَ اللَّيْلِ	صبح وشام خدا کا نام لیا کر، اور رات کے وقت دیر تک
فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا (دھر)	اسکو سجدہ کیا کر اور اس کی تسبیح بیان کر

رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا جو حکم تھا، ایک سال تک قایم رہا، چنانچہ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ آپکا اور اکثر صحابہ کا ایک سال تک اسی حکم پر عمل رہا، نماز پڑھتے پڑھتے ان کے پاؤں سوج جاتے تھے، ایک سال کے بعد فرضیت منسوخ ہوگئی،[1] اور حکم ہوا،

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ	تیرا پروردگار جانتا ہے کہ دو تہائی رات سے کم، اور
مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ	آدھی رات، اور تہائی رات تک نماز پڑھا کرتا ہے
مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ	اور کچھ لوگ اور تیرے ساتھ خدا ہی رات اور دن کا اندازہ
وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ	کرتا ہے اسے جان لیا کہ تم اس کو گن نہیں سکتے، تم پر اسنے
عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ	مہربانی کی، اب جتنا ہو سکے اتنا ہی قرآن نماز میں پڑھو،
عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ	اسے جان لیا کہ تم میں بیمار بھی ہونگے مسافر بھی ہونگے، جو
يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن	خدا کی روزی ڈھونڈنے کو سفر کریں گے اور لوگ خدا
فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ	کی راہ میں سفر جہاد کریں گے، پس اب جتنا ہو سکے
فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ،	اتنا ہی پڑھو،

رات کی اس نفل نماز کا نام تہجد ہے نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد، فجر، مغرب، اور عشاء میں

[1] ابوداؤد باب فی صلوٰۃ اللیل ومسند احمد جلد ۶ صفحہ ۵۴

وقت کی نمازیں فرض ہوئیں،

أَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (هود)

دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں (یعنی فجر ومغرب) اور تھوڑی رات گذرنے کے بعد نماز پڑھا کرو،

معراج میں جو بعثت کے پانچویں سال ہوئی پانچ وقت کی نمازیں فرض[1] ہوئیں (اور سورۂ اسراء میں جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے یہ آیت اُتری،

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ، إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ،)

نماز کے اوقات زوال آفتاب سے لیکر ظلمت شب تک ہیں، (ظہر، عصر، مغرب، عشا) اور صبح کی نماز میں شب جمع ہوتے ہیں اور رات کو تہجد پڑھ یہ تیرے لیے مزید ہے،)

لیکن رکعتیں دو ہی رہیں، مدینہ منورہ میں آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا تو اس فرض نے وسعت حاصل کی اور دو کے بجائے چار رکعتیں فرض ہوگئیں[2]،

تاہم ہمہ نماز میں خضوع وخشوع اور تمکین ووقار کے لیے جو ارکان ضروری ہیں ان کے لیے جس اطمینان کی ضرورت تھی وہ مدت تک نصیب نہیں ہوا، اس لیے فوراً وہ ارکان اور آداب لازمی نہیں قرار پائے، بلکہ رفتہ رفتہ ان کی تکمیل کی گئی، پہلے لوگ نماز میں آنکھ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے۔ بالآخر آں حضرت (صلے اللہ علیہ وسلم،) نے فرمایا،

ما بال اقوام یرفعون البصر الی السماء فی صلواتھم[3]،

یہ کیسے لوگ ہیں کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا کرتے ہیں،

ایک مدت تک یہ حالت تھی کہ نماز پڑھتے میں کوئی کام یاد آجاتا تو کسی سے کہدیتے، یا کوئی سلام کرتا تو نماز ہی میں جواب دیتے، پاس پاس کے آدمی نماز میں باہم باتیں کیا کرتے، جب مہاجرین حبش سنہ ۲ھ میں واپس آکر خدمت اقدس

[1] فتح الباری مصری جلد، صفحہ ۱۵۵، [2] صحیح بخاری باب الہجرۃ، [3] بخاری کتاب الصلوۃ باب رفع البصر الی السماء فی الصلوۃ

میں حاضر ہوئے تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نماز میں مشغول تھے، معمول کے موافق لوگوں نے سلام کیا لیکن جواب نہیں ملا، نماز کے بعد آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ "خدا نے اب حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو"[1]، اُس وقت سے بات چیت کرنا یا سلام کا جواب دینا بالکل منع ہو گیا،

معاویہ بن حکم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نماز ادا کی، ایک صاحب کو چھینک آئی، میں نے یرحمک اللہ کہا، لوگوں نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا "آپ لوگ کیا دیکھتے ہیں"؟ لوگوں نے رانوں پر ہاتھ مارے، اُس وقت میں سمجھا کہ بات کرنے سے روکنا چاہتے ہیں، میں چپ ہو گیا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نماز سے فارغ ہو کر (خلق احمدی سے) مجھکو نہ سزا دی، نہ ڈانٹا، نہ بُرا کہا، صرف یہ فرمایا کہ "نماز تسبیح و تکبیر اور قرأت کا نام ہے، اس میں بات چیت جائز نہیں"[2]،،

تشہد کا جو طریقہ اب ہے، پہلے نہ تھا، بلکہ مختلف اشخاص کے نام لے کر کہتے تھے، السلام علی فلان وفلان، بالآخر التحیات کے خاص الفاظ سکھائے گئے جو اب نماز میں معمول بہا ہیں[3]،

صلوٰۃ خوف (نماز کسی حالت میں قضا نہیں کی جا سکتی، خوف کی حالت میں مثلاً جنگ میں یہ حکم ہے کہ تمام فوج کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں پہلے ایک جماعت تمام ہتھیاروں سے مسلح ہو کر امام کے پیچھے کھڑی ہو اور قصر نماز ادا کرے پھر بہ ترتیب یہ آگے بڑھے اور دوسری جماعت جو دشمن کے مقابلہ میں تھی وہ پیچھے ہٹے، اور وہ بھی قصر نماز ادا کرے، امام اپنی جگہ پر قیام کرے، راویوں میں اختلاف ہے کہ ہر جماعت دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے یا ایک ایک رکعت امام کے ساتھ اور دوسری رکعت علیحدہ علیحدہ پڑھے، یا صرف ایک ہی رکعت اس حالت میں فرض ہے، ابو داؤد نے صلوٰۃ الخوف کی تمام صورتیں بروایت صحابہ الگ الگ لکھدی ہیں، ہمارے نزدیک ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ جنگ کی حالت پر موقوف ہے، امام حسب وقت جو مناسب سمجھے کرے، اگر لڑائی پورے زور اور شدت پر ہو تو ہر سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اشارات سے نماز ادا کرے گا، سورۂ نساء میں صلوٰۃ الخوف کی صورت

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ [2] ایضاً [3] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب التشہد،

یہ تفصیل مذکور ہے،

صلوۃ الخوف کا حکم غزوۃ الرقاع سنہ ۵ھ میں نازل ہوا، اسی غزوہ کا نام بعض راویوں نے غزوہ نجد بتایا ہے ابوداؤد میں ابوعیاش زرقی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوۃ الخوف کی آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر مقام عسفان میں نازل ہوئی، یعنی سنہ ۶ھ میں، لیکن زیادہ تر رواۃ حدیث اور اہل سیر غزوۃ الرقاع ہی کو اس حکم کا زمانہ سمجھتے ہیں[1])

روزہ اسلام سے پہلے قریش عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے، (اس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا[2] جاتا تھا) آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) بھی اس دن روزہ رکھا کرتے تھے، اور عجب نہیں کہ آپ کی بعثت میں دوسرے صحابہ بھی روزہ رکھتے ہوں، سنہ نبوی میں یعنی ہجرت سے آٹھ برس پہلے حضرت جعفر نے حبش کے نجاشی کے سامنے اسلام پر جو تقریر کی تھی اس میں روزہ کا ذکر بھی موجود ہے، وہ غالبا اسی دن کا روزہ ہوگا، اس کے بعد جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں، آپ نے لوگوں سے وجہ پوچھی لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت موسے نے اسی روز فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی تھی، آپ نے فرمایا "ہم کو موسے کی تقلید کا زیادہ حق ہے" چنانچہ آپ نے (یہاں بھی) عاشورا کا روزہ رکھا، (اور صحابہ کو بھی رکھنے کا حکم دیا) پھر سنہ ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے، تو عاشورا کا روزہ مستحب ہوگیا یعنی جس کا جی چاہتا تھا، رکھتا تھا، اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا[3] لیکن آپ نے بہ نفس نفیس اس دن کا روزہ برابر رکھا، سنہ ۱۰ھ میں لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہود تو اس دن کی بڑی عزت کرتے ہیں، فرمایا کہ آئندہ سال اس کے بجائے ۹ کو روزہ رکھوں گا، لیکن افسوس کہ آپ نے اسی سال وفات[4] پائی"،

یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نماز عشا کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے، اور اس کو حرام سمجھتے تھے، عورت کے ساتھ

---

[1] دیکھو کتب احادیث صلوۃ الخوف و طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۵۴، ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۴۳، (۲) مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۴ (معجم کبیر طبرانی)

[3] ابوداؤد کتاب الصوم، (۴) یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ابوداؤد کتاب الصوم میں بہ تفصیل مذکور ہیں)

ہم بستری بھی منع تھی، ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی اسی طریقہ کے موافق مامور ہوئے لیکن اسلام کے تمام احکام میں سب سے مقدم یہ اصول ملحوظ رہتے تھے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ) — خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا،

لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ (ابوداؤد واحمد) — اسلام میں جوگی پن نہیں ہے،

اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ وَ — روزے کی راتوں میں تمہارے لیے عورتوں سے لطف اٹھانا
كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ — حلال کر دیا گیا ہے جب تک صبح کی سپید لکیر رات کی سیاہ لکیر
الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ) — سے الگ ہو جائے تم کھاتے پیتے رہو،

اہل عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے، اول اول روزہ ان پر شاق ہوا[2] اس لیے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی، اول اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر روزے کی فرضیت نازل ہوئی تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اتری،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۚ — جو رمضان کا مہینہ پائے، وہ ضرور روزہ رکھے،

اب بالتعیین روزہ فرض ہو گیا، اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی، البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو، اس کے لیے یہ حکم ہوا کہ اس وقت روزہ توڑ دے اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کر دے چونکہ اور تمام قوموں میں خصوصاً عیسائیوں میں رہبانیت بڑی فضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لیے جو لوگ زیادہ خدا پرست تھے، روزہ میں زیادہ سختی برداشت کرتے تھے، لیکن آنحضرت صلعم وقتاً فوقتاً اس سے روکتے رہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم سفر میں تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد بھیڑ لگی ہوئی تھی، اور اس پر لوگوں نے سایہ کر رکھا ہے، سبب پوچھا معلوم

[1] ابوداؤد کتاب الصوم، باب مبدء فرض الصیام و اسباب النزول للسیوطی صفحہ ۲۷ [2] صحیح بخاری میں ہے نزل رمضان فشق علیہم،
[3] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب کیف الاذان

ہوا کہ سخت گرمی میں اس شخص نے روزہ رکھا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کچھ ثواب کی بات نہیں[1]
بعض لوگوں نے صوم وصال رکھنا چاہا، یعنی رات دن روزہ رکھیں، بیچ میں افطار نہ کریں، آپ نے اس سے منع فرمایا۔

روزہ کا مقصد عام طور پر صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ثواب کی بات ہے، اسلیے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ہر طرح کی آسانیوں کا حکم دیا، سفر اور بیماری میں روزہ رکھنا فرض نہ تھا۔
راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت تھی، سحر کھانے کی فضیلت بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ صبح کے قریب کھائی جائے، تاکہ دن بھر قوت باقی رہے

روزہ کا مقصد صرف معاصی سے کف نفس تھا، اور روزہ اس کا ضامن تھا، اس لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "جو شخص روزہ میں جھوٹ فریب نہیں چھوڑتا، خدا کو اس کی فاقہ کشی کی کوئی حاجت نہیں[2]"

زکوٰۃ خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتدا ہی سے معمول بہ تھی، مکہ میں جو سورتیں اتریں ان میں زکوٰۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے، اور خیرات نہ دینے والوں پر نہایت عتاب ہے،

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَٰلِكَ	تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے، یہی وہ
الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ	شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانا کھلانے
طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝	کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا۔

مدینہ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں، ۲ھ میں عید کے دن صدقہ فطر دینا واجب قرار دیا گیا[3]، ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے، حدیثوں میں صحابہ کے فقر و تنگدستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں، اسی زمانہ کے ہیں۔ اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیے، ورنہ عذاب ہوگا، چنانچہ خاص آیت نازل ہوئی[4]

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم [2] ایضاً بحوالہ بالا [3] طبری مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۲۸۱، [4] صحیح بخاری مقولہ حضرت عبداللہ بن عمر،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا — جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور خدا کی راہ میں
يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۝ — خیرات نہیں کرتے،

اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ۝ — لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات دیں کہدو کہ جو کچھ مصارف ضروری سے بچ رہے،

بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے، بے کار، یا ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے، اس پر حکم ہوا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا — مسلمانو اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے
كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۝ — لیے زمین میں پیدا کیا، اچھا حصہ خیرات دو

مزید تاکید کے لیے یہ حکم ہوا کہ جو شخص اپنی محبوب چیز نہ دے گا، اُس کو ثواب نہ ملے گا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ — تم لوگ اس نیکی تک نہیں پہنچ سکتے تک وہ چیز خیرات کرو جو تمکو عزیز ہے

اس صدقہ اور خیرات کی طرف یہ عام رغبت پیدا ہوئی کہ جو لوگ نادار تھے وہ صرف اس لیے بازار میں جاکر مزدوری کرتے اور کمر پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات کریں[1]،

بایں ہمہ ۸ھ تک زکوۃ فرض نہیں ہوئی، فتح مکہ کے بعد اسکی فرضیت ہوئی، تو اس کے مصارف بیان کیے گئے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام ممالک مفتوحہ میں زکوۃ کے وصول کرنے کے لیے (محرم ۹ھ میں) محصلین مقرر کیے[2]، زکوۃ کے مصارف حسب ذیل تھے،

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَ — زکوۃ ان مصارف کے لیے ہے، فقراء، مساکین، زکوۃ کے
الْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي — وصول کرنے والے، مولفۃ القلوب، غلام، جن کو آزاد
الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ — کرانا ہو، قرضدار، مسافر، اور خدا کی راہ یہ خدا کا فرض ہے

---

[1] بخاری کتاب الزکوۃ، [2] طبری مطبوعہ یورپ جلد ۳ صفحہ ۱۷۲۲، (ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۱۱۵)

وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ) — اور خدا علیم و حکیم ہے

زکوۃ کی شرح نہایت تفصیل سے روایتوں میں منقول ہے، فقہ میں کتاب الزکوۃ انھیں روایتوں سے ماخوذ ہے۔

حج دنیا میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا پرستی کے لیے عبادت گاہ عام بنایا اور تمام دنیا کو وہاں آکر عبادت کرنے کی دعوت دی،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ	اور جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے کعبہ کی جگہ مقرر کر دی کہ ہمارے ساتھ
بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَ	کسی کو شریک نہ کر اور ہمارے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام
الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ	اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھ اور حج کی
رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ	منادی کر دے تو لوگ ہر طرف سے دوڑے آئیں گے کچھ پیدل
لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ	اور کچھ دبلی اونٹنیوں پر سوار تاکہ فائدہ اٹھائیں اور تاکہ ایام مقررہ
اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ۵	میں خدا کا ذکر کریں (حج)

حضرت ابراہیم کی دعوت عام پر دنیا نے لبیک کہا، اور ہر سال عرب کے دور و دراز اطراف سے لوگ حج کو آتے تھے، لیکن ایک طرف تو یہ افسوسناک انقلاب ہوا، کہ جو گھر خالص توحید کے لیے تعمیر ہوا تھا، وہ تین سو ساٹھ بتوں کا تماشا گاہ بن گیا۔ دوسری طرف اس گھر کی تولیت کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا، اور پورے آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔

بالآخر ظہور حق کا وقت آیا مکہ فتح ہوا، اور جانشین ابراہیم اور اُن کے متبعین کو موقع ملا کہ شعار ابراہیمی کو پھر زندہ کیا جائے، چنانچہ سنہ ۹ھ میں حج فرض ہوا[1] تاہم آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس سال یہ فرض ادا نہیں کیا کہ عرب ننگے ہو کر طواف کعبہ کرتے تھے، اور آنحضرت صلعم ایسی بے حیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے، اس لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ ایام حج میں روانہ کیے گئے کہ کعبہ میں جا کر منادی کر دیں کہ آیندہ سے

[1] زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۱۸۰

کوئی شخص عریاں ہوکر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا [1]

ایک اور وجہ یہ تھی کہ نسئی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذوقعدہ میں آگیا تھا، چنانچہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا، لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا، اسلیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک سال کا انتظار فرمایا اور اس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آگیا۔[2]

حج کے اصلاحات حج کی رسم اگرچہ کفار نے قایم رکھی تھی، لیکن اسکی صورت بالکل بدل دی تھی اور اس میں اسقدر بدعات اضافہ کردیے تھے کہ وہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا، سب سے مقدم یہ کہ حج اور تمام عبادات کا مقصد خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے، لیکن اہل عرب جب حج میں جمع ہوتے تھے تو خدا کے بجائے اپنے باپ دادا کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے تھے، اس بنا پر یہ آیت اتری،

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ	پھر جب حج کے ارکان پورے کرلو، تو خدا کا ذکر کرو جس طرح اپنے
أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا [3] (بقرہ)	باپ دادا کا ذکر کرتے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر،

خاص اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ مناۃ جو بت تھا، اس کا طواف کرتے تھے اور اس بنا پر جب کعبہ کا حج کرتے تھے، تب بھی صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے، حالانکہ حج کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کی یادگاریں قایم رکھی جائیں، اور صفا و مروہ کا طواف اسی عہد کی یادگار ہے، اسی بنا پر یہ آیت اتری،

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ	صفا اور مروہ خدا کی یادگاریں ہیں، اسلیے جو شخص حج یا عمرہ کرے تو
الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا،	اس کو ان دونوں مقاموں کا بھی طواف کرنا چاہیے [4]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحج باب لایحج البیت مشرک ولا یطوف بالبیت عریان [2] آنحضرت صلعم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ فرمائے تھے "الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض السنۃ اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم ثلث متوالیات ذوالقعدہ و ذوالحجہ والمحرم و رجب مضر الذی بین جمادی وشعبان" اس سے اسی طرف اشارہ تھا [3] اسباب النزول للواحدی، [4] قرآن مجید میں جناح کا جو لفظ ہے اس کا عام ترجمہ حرج یا نقصان ہے اس بنا پر ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کچھ حرج نہیں لیکن جناح کا لفظ واجب اور مستحب کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

ایک طریقہ یہ جاری ہوگیا تھا کہ اکثر لوگ (آجکل کی طرح) جن کے پاس زادِ سفر نہیں ہوتا تھا، یوں ہی حج کے لیے چل کھڑے ہوتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں، ان لوگوں کو اکثر راہ میں گداگری اور دوستوں کی دستگیری کا محتاج ہونا پڑتا تھا، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ[۱] ۵ — اور گھر سے زادِ سفر لے کر چلو، کیونکہ اچھا زادِ سفر تقویٰ ہے

احرام حج میں سر کے بالوں کا منڈوانا یا ترشوانا منع ہے لیکن اس میں اہل جاہلیت نے بہت سختی کر دی تھی، یہاں تک کہ بعض صاحبوں کے بالوں میں اسقدر جوئیں پڑ گئیں کہ بینائی جاتے رہنے کا خوف ہوگیا، تاہم وہ بال نہ ترشوا سکے، اسلام میں چونکہ سب سے مقدم یہ امر پیش نظر ہے کہ اسکی عبادات اور احکام تکلیف مالایطاق نہ بن جائیں، اسلیے حکم ہوا

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ، — تو جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ عارضہ ہو تو وہ (اگر بال منڈائے) تو فدیہ ادا کر دے یعنی یا روزہ یا خیرات یا قربانی،

قربانی جو کرتے تھے اس کا خون لیکر کعبہ کے در و دیوار پر ملتے تھے، اور اس کو ثواب سمجھتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[۲]،

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ، — خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہاری پرہیزگاری اس تک پہنچتی ہے۔

اس آیت میں صرف اس فعل سے نہیں روکا گیا، بلکہ یہ بھی بتایا گیا کہ قربانی خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ اصل چیز جسکو خدا قبول کرتا ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے،

رسوم حج میں ایک بڑی چیز جو **قریش** نے اصول اسلام کے خلاف قایم کر دی تھی یہ تھی کہ وہ عرفات جو حج کا اصلی عبادت گاہ عام تھا، نہیں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، ہم حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتے،

---

[۱] بخاری کتاب الحج باب، "تزودوا فان خیر الزاد التقوی" [۲] تفسیر بیضاوی (یہ رسم یہودیوں سے آئی تھی) لادیس ۱۷ ۶ تاریخ دوم ۲۹ ۲۲)

یہ ہمارے خانداں کی توہین ہے اس لیے وہ صرف مزدلفہ تک جاکر ٹھہر جاتے تھے، باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے تھے، اور وہاں سے چل کر مزدلفہ اور منیٰ میں آتے تھے، چونکہ اسلام کا اصول اصلی مساوات عامہ ہے اور عبادت میں سب یکساں ہیں، اس لیے حکم آیا[1] کہ،

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ — پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس خدا کا
الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ — ذکر کرو جس طریقہ سے اس نے تم کو ہدایت کی ہے اور اس سے
مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ — پہلے بیشک تم گمراہ تھے، پھر وہیں سے چلو جہاں سے اور
اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ — لوگ چلتے ہیں، اور خدا سے معافی مانگو، وہ غفور رحیم ہے

قربانی کے جانور کو چونکہ سمجھتے تھے کہ خدا پر چڑھا دیا گیا ہے، اس لیے اس پر سوار نہیں ہوتے تھے اور پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کرتے تھے، یہ رسم اسلام کے زمانہ تک قایم رہی، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو سفر حج میں دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہیں، لیکن خود پیدل جارہے ہیں، آپ نے ان سے فرمایا کہ "سوار ہولو"، بولے "یہ قربانی کے اونٹ ہیں" آپ نے دوبارہ فرمایا، انھوں نے دوبارہ وہی عذر کیا، آپ نے زجر کے ساتھ حکم دیا کہ "بیٹھ لو"[2]

ایک قسم کا حج ایجاد کرلیا تھا جس کو حج مُصْمِت کہتے تھے، یعنی جو شخص حج کرتا تھا، وہ آغاز حج سے اخیر تک منھ سے کچھ بولتا نہ تھا، اسلام نے اس تکلیف مالایطاق سے منع کیا، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے قریش کی ایک عورت کو جس کا نام زینب تھا، دیکھا کہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حج مُصمت کی نیت کی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے اس سے کہا کہ "یہ جائز نہیں، یہ زمانہ جاہلیت کی بات ہے"[3]،

سب سے بڑی بےحیائی کی بات یہ تھی کہ قریش (حمس) کے سوا عام عرب مرد و زن کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے، حدود حرم میں آکر تمام لوگ اپنے اپنے کپڑے اتار ڈالتے تھے، اور عاریۃً کسی قریشی سے کپڑے مانگ لیتے تھے

[1] صحیح بخاری جلد ا کتاب الحج، صفحہ ۲۲۶، [2] بخاری کتاب الحج [3] بخاری جلد ا صفحہ ۸۲،

اگر یہ ملتے تو ننگے کعبہ کے گرد گھومتے تھے، عورتیں بھی اسی طرح ننگی طواف کرتی تھیں اور یہ شعر گاتی جاتی تھیں،

اَلْيَوْمَ يَبْدُوْ بَعْضُهٗ اَوْ كُلُّهٗ ۔ وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا اُحِلُّهٗ

آج کچھ حصہ اوس کا یا پورا کھلے گا ۔ اور جو کھلا ہے اُسکو میں حلال نہیں کرتی

اس پر یہ آیت نازل ہوئی[۱]،

يَا بَنِيْ آدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ۔ اے آدم کے بیٹو، مسجدوں میں کپڑے پہن لیا کرو،

(اس بنا پر ۹ھ میں آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکر صدیق کو بھیجا، اُنھوں نے عین موسم حج میں اعلان کیا کہ آیندہ کوئی برہنہ حج نہ کرنے پائے گا[۲]۔

معاملات

شریعت کی تکمیل میں جو تدریج ملحوظ رہی اس کے لحاظ سے (وراثت نکاح وطلاق) وقصاص وتعزیرات (وغیرہ) کے احکام بعثت کے بہت بعد آئے، (سبب یہ ہے کہ ان احکام کے اجرا کے لیے ایک مادۂ الامر قوت کی ضرورت تھی، جو اب تک اسلام کو حاصل نہیں ہوئی تھی، غزوۂ بدر کے بعد سے اسلام کی سیاسی طاقت کا نشوونما شروع ہوا) ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں جو احکام نازل ہوئے وہ تحویلِ قبلہ، فرضیت روزہ، زکوۃ فطر، نماز عید اور قربانی تھی، تیسرے سال سے جب اسلام کے کاروبار زیادہ پھیلنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے توریث کا قانون قرآن مجید میں نازل ہوا۔

وراثت (مسلمان جب ابتداءً مدینہ آئے ہیں تو اُس وقت یہ حالت تھی کہ باپ مسلمان ہے تو بیٹا کافر ہے، ایک بھائی کافر ہے تو دوسرا بھائی مسلمان ہے، اس حالت میں اقربا اور اعزہ کی وراثت کا قانون کیونکر نافذ ہوسکتا تھا اس لیے) آنحضرت صلعم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ (برادری) قایم کردی،

[۱] (یہ پورا واقعہ اور شان نزول نسائی، کتاب مناسک الحج میں ہے)، [۲] صحیح مسلم وصحیح بخاری اور تمام حدیث کی کتابوں میں باب لایطوف بالبیت عریان میں مذکور ہے،

جسکی رو سے یہ قاعدہ مقرر ہوگیا، کہ کوئی انصاری مرتا تو اسکی وراثت مہاجرین کو ملتی[1]، عرب میں پہلے بھی دستور تھا کہ دو آدمی آپس میں عہد کرلیتے کہ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، ان میں سے جب کوئی مرتا تو دوسرا وارث ہوتا، لیکن (سنہ میں قرآن کی اس آیت نے اس قاعدہ کو منسوخ کردیا،)

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ، (انفال) قرابت مند ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں

اس کے رو سے مواخاۃ کی بنا پر وراثت موقوف ہوگئی، اور خاندان اور ذوی الارحام میں وراثت محدود ہوگئی

(آیت وراثت کے نزول سے پہلے **قرآن** نے وصیت کا قاعدہ جاری کیا تھا، یعنی مرنے والا اپنے مال و جائداد کی نسبت یہ وصیت کرجاتا کہ اس میں سے اتنا اُس کو دیا جائے اور اتنا اس کو ملے، مرنے کے بعد اُسی طریقہ سے اسکی جائداد تقسیم کردی جاتی۔ مرنے سے پہلے ہر مسلمان پر اس وصیت کا مکمل کرجانا فرض تھا۔)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ، (بقرہ)

مسلمانو! تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے بطریق مناسب وصیت کرجائے، متقی لوگوں پر فرض ہے۔

جو لوگ حالت مسافرت میں مرجاتے، اُن کے لیے گواہی اور شہادت کا قانون قرآن میں مقرر کیا گیا، گواہی کو چھپانا یا بدل دینا قانوناً حرام تھا، چنانچہ سورہ بقرہ اور مائدہ میں اسکی پوری تفصیل ہے، غزوہ بدر کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں کافی ترقی ہوگئی، خاندان کے خاندان مسلمان ہوگئے، اس لیے وراثت کے مخصوص قانون کی ضرورت ہوئی، پھر وصیت کے قاعدہ میں بڑی دقت یہ تھی کہ ناگہانی موت کے موقع پر تقسیم جائداد کا کوئی اصول جاری کرنا ممکن نہ تھا، مثلاً جہاد میں سیکڑوں مسلمان شریک ہوئے، اب کس کو معلوم ہے کہ کس کو شہادت ہوگی، اس حالت میں وصیت نہ کرجانے سے رشتہ داروں میں جسکا قابو چل جاتا وہ جائداد پر قبضہ کرلیتا۔ چنانچہ غزوۂ اُحُد میں یہی موقع پیش آیا، ۔

---

[1] مفسرین کا بیان ہے لیکن صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ حکم حسب ذیل آیت کریمہ سے منسوخ ہوا وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ، وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (نساء) دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور،

سعد بن الربیع جو بہت دولتمند صحابی تھے، (اُحد کی جنگ میں) شہید ہوئے، ان کی بیوی آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئیں کہ سعد آپ کی خدمت میں شہید ہوئے، انھوں نے دو لڑکیاں چھوڑیں لیکن سعد کے بھائی نے سعد کی ساری جائداد پر قبضہ کر لیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا خدا فیصلہ کرے گا، پھر (غالباً ۳ھ میں) یہ آیت نازل[1] ہوئی، جس میں وراثت کے تمام احکام مذکور ہیں۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ الخ، — خدا تم کو تمہاری اولاد کی نسبت حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کی برابر حصہ ملے (آخر تک)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سعد کے بھائی کو بلا کر فرمایا کہ سعد کے ترکہ میں سے دو تہائی ان کی بیٹیوں اور آٹھواں حصہ ان کی بیوی کو دو، اس کے بعد جو بچ رہے وہ تمہارا حق ہے،

اہل عرب عورتوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے، اور کہتے تھے کہ وراثت اُس کا حق ہے جو تلوار چلائے، دنیا کی اور اکثر قوموں میں بھی یہی دستور تھا، یہ پہلا دن ہے کہ اس صنف ضعیف کی دادرسی کی گئی۔

وصیت احکام وراثت کے بعد بھی وصیت کی اجازت باقی رہی، لیکن چونکہ اس سے حقوق وراثت کی حق تلفی کا اندیشہ تھا، اس لیے وصیت کی تحدید کی ضرورت تھی، سنہ ۱ھ میں حضرت سعد (عامر کے والد) بیمار ہوئے، آنحضرت صلعم ان کی عیادت کو گئے، انھوں نے عرض کی کہ میں مر رہا ہوں اور میرے صرف ایک ہی لڑکی ہے، چاہتا ہوں کہ دو تہائی مال خیرات کر دوں، آنحضرت صلعم نے اجازت نہیں دی، اُنھوں نے کہا تو نصف، آپ نے اس کو بھی

[1] آیت میراث کے شان نزول میں احادیث میں تین واقعے مروی ہیں، اول یہ کہ حضرت جابر سنہ ۱ھ میں بیمار پڑے تو آیت اتری یہ روایت تمام صحاح ستہ میں ہے لیکن درحقیقت اس روایت میں راویوں سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے، کیونکہ وراثت سنہ ۱ھ سے پہلے جاری ہو چکی تھی، اور دوسرے یہ کہ حضرت جابر اس وقت تک لاولد تھے اس لیے صحیح یہ ہے کہ حضرت جابر کا واقعہ وراثت کی ایک خاص صورت لاولدیت (یعنی کلالہ) سے متعلق ہے جیسا کہ مسلم کی دوسری روایتوں میں (کتاب الفرائض) اس کی تصریح ہے دوسرا شان نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسان کے بھائی عبدالرحمان کی وفات کے بعد ان کی بیوی ام کجہ کی فریاد پر یہ آیت اتری، یہ روایت طبری وغیرہ کی ہے، جو گو ضعیف ہے لیکن بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیع کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں تیسرا شان نزول بھی سعد بن ربیع کا واقعہ ہے، جو ابوداود، ترمذی، حاکم اور مسند احمد میں مذکور ہے) س

قبول نہیں کیا، انھوں نے کہا ایک تہائی، آپ نے فرمایا یہ بھی بہت ہے وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے اچھا ہے کہ وہ بھیک مانگتے پھریں[1]، تاہم یہ مقدار آپ نے جائز رکھی، اُسوقت سے وصیت ایک ثلث سے زیادہ ممنوع ہو گئی،

وقف (وقف شریعت کا بہت بڑا مسئلہ ہے، اِسلام نے اس مسئلہ کو جس حد تک صاف کیا، اُس کا دوسرے مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں ہے اسی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلام طریقۂ وقف کا موجد ہے، اسلام میں وقف کی تاریخ نہایت قدیم ہے، آنحضرت صلعم نے ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ میں مسجد نبوی کی بنیاد جس زمین میں رکھی تھی وہ دو یتیموں کی ملکیت تھی آپ نے قیمت دینی چاہی لیکن انھوں نے کہا،

لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ، — نہیں ہم خدا کی قسم قیمت نہ لیں گے ہم اسکی قیمت خدا ہی سے لیں گے۔

یہ اسلام کا پہلا وقف تھا اور نہایت سادہ صورت میں تھا، چنانچہ امام بخاری اس حدیث کو وقفِ مُشاع (بیلک وقف) کے ثبوت میں لائے ہیں اس کے بعد ۲ھ یا ۳ھ میں جب یہ آیت نازل ہوئی،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا — تم نیکی اسوقت تک نہیں پاسکتے جب تک

مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵ — وہ خدا کی راہ میں نہ دو جو تم کو سب سے محبوب ہے،

تو ابو طلحہ صحابی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی "یا رسول اللہ صلعم بیرحاء[2] مجھکو سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اس کا ثواب اور اجر خدا سے چاہتا ہوں، آپ جس مصرف میں چاہیں، اسکو رکھیں، چنانچہ آپ کے مشورہ سے انھوں نے اس کا منافع اپنے اعزہ پر وقف کیا۔

اب تک وقف کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے تھے، وہ صرف یہ تھے کہ "وہ ذاتی تصرف سے نکال کر خدا کی ملکیت میں دیا گیا"، لیکن ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد اسکی حقیقت بالکل واضح کر دی گئی خیبر میں حضرت عمر کو

[1] بخاری جلد اکتاب الوصایا۔ [2] ایک زمین کا نام ہے جو مدینہ میں واقع تھی

ایک زمین ملی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کو وقف کرنا چاہا، آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا،

ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها، — اگر چاہو اصل جائداد باقی رکھو اور منافع صدقہ کردو

چنانچہ ان شرائط کے ساتھ وہ جائداد وقف ہوئی[1]،

انہ لایباع اصلها ولا یوهب ولا یورث، — اصل جائداد نہ بیچی جائے نہ ہبہ کیجائے اور نہ وراثت میں بانٹی جائے۔

نکاح وطلاق

نکاح کے متعلق جو اصلاحی احکام آئے، ان کی تفصیل اصلاحات کے عنوان کے نیچے آئے گی، یہاں اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں کئی قسم کے نکاح کے طریقے جاری تھے جن میں سے ایک کے سوا، سب زنا کے مشابہ تھے، سب سے پہلے اسلام نے ان کو ناجائز ٹھہرایا، مُتعہ[2] جو زمانہ جاہلیت سے چلا آتا تھا، بار بار حرام اور حلال ہوتا رہا، یہاں تک کہ سنہ غزوہ خیبر میں قطعاً حرام ہوگیا، اگرچہ اس پر بھی اسکی ضرورت پیش آئی کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں منبر پر کہا کہ میں متعہ کو حرام کرتا ہوں، یعنی متعہ کی حرمت جو اچھی طرح اب بھی ملک میں شائع نہیں ہوسکی میں آج اس کا اعلان کرتا ہوں

(نکاح اور طلاق کے دیگر احکام مثلاً محرمات شرعی کا بیان، منہ بولے بیٹے کی بیوی کا حرام نہ ہونا، کثرت ازواج کی تحدید، تعداد طلاق کی تعیین، زمانہ عدت کا بیان، مہر کا ضروری ہونا، ظِہار یعنی ایک طریقہ طلاق جس میں اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دیتے تھے، اور لِعان یعنی شوہر کا اپنی بیوی کی عصمت پر تہمت کرنا اور باہم اپنی سچائی اور دوسرے کی دروغگوئی کا دعویٰ کرنا، یہ تمام تفصیلیں اصلاحات کے تحت میں آئیں گی، یہاں صرف اسیقدر بتا دینا کافی ہے کہ یہ تمام احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں، اور ان کے نزول کا زمانہ سنہ اور سنہ ہجری ہے)

حدود وتعزیرات

(دنیا[3] کے مادی خزانہ میں انسان کی جان سے زیادہ کوئی قیمتی شے نہیں، حدود اور تعزیرات کے اکثر قوانین، ہجرت کے چند برس بعد نازل ہوئے، لیکن انسان کی جان کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں اتر چکا تھا، معراج کے سلسلہ میں جو اخلاقی احکام بارگاہ الٰہی سے عطا ہوئے ان میں ایک یہ بھی تھا۔

---

[1] یہ تمام حدیثیں بخاری باب الوقف میں ہیں (2) مجدود والوف نکاح) [3] اصابہ باجم باب حلال وحرام)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ	خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے اسکو ناحق نہ مارو، اور جو ناحق
قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا	مارا جائے تو اسکے وارث کو ہم نے اختیار دیا، چاہیے کہ وہ
يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا، (بنی اسرائیل)	قصاص میں زیادتی نہ کرے اسکی مدد کی جائے۔

عرب میں اسلام سے پہلے بھی قتل وقصاص کے کچھ قوانین موجود تھے، یہود جو اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، توراۃ کے حدود وتعزیرات کا مجموعہ اُن کے پاس بھی موجود تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب میں چونکہ منظم حاکمانہ طاقت اور اخلاقی روح نہ تھی، اس لیے وہ ان احکام کا نفاذ نہیں کر سکتے تھے، مدینہ پہنچنے کے ساتھ ہی یہود نے فصل مقدمات کے لیے بارگاہ نبوت کی طرف رجوع کیا، آپ اُن کے مقدمات عموماً توراۃ کے احکام کے مطابق فیصل کر دیتے تھے،

عرب میں ایک شخص کا قتل صدہا قبائل کی خانہ جنگی کا سلسلہ چھیڑ دیتا تھا، اس لیے غزوہ بدر کے بعد جب اسلام کے بازوؤں میں حاکمانہ زور آچلا تھا، **قصاص** کا حکم نازل ہوا، یاد ہوگا کہ اطراف مدینہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر دو یہودی قبائل رہتے تھے، ان دونوں میں بنو نضیر معزز سمجھے جاتے تھے اس لیے کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کر ڈالتا تو اس کو بنو نضیر مار ڈالتے تھے، اور اگر کسی نضری کے ہاتھ سے کوئی قریظی قتل ہو جاتا تو چھوہاروں کے سو وسق خونبہا دیدیتے، مدینہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری کے بعد اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، لوگوں نے اس کا مرافعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس پر سورۂ مائدہ کی چند آیتیں اتریں، ان میں سے ایک آیت[1] یہ ہے،

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ	ہم نے انکو توراۃ میں حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے
بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ	بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان
وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۵	اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم،

یہ حکم گو یہودیوں کے لیے تھا لیکن ایک اور آیت نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الدیات،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الخ	مسلمانو تم پر مقتولوں میں مساوات اور برابری کا حکم دیا جاتا ہے،

اس حکم نے مساوات اور عدل کے پلے کو دنیا میں ہمیشہ کے لیے برابر کر دیا

یہودیوں میں خون بہا (دیت) کا قانون نہ تھا[1] لیکن عرب میں یہ قانون تھا، اور اسلام نے چند اصلاحات کے ساتھ اس کو باقی رکھا،

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ	اسکے بھائی (یعنی اولیائے مقتول) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو
وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۚ (بقرہ)	اسکی پابندی خوبی کے ساتھ کرنا، اور بطور احسن اسکو ادا کر دینا چاہیے۔

اب تک قتل عمد اور قتل شبہ (یعنی غلطی سے قتل) میں کوئی تفریق نہ تھی، سنہ میں ایک مسلمان غلطی سے ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا، ایک اور مسلمان انصاری کے ہاتھ سے ایک ویسی قتل ہوا، آنحضرت صلعم نے مقتول کے بھائی کو خون بہا دیکر راضی کر لیا، اس کے بعد وہ منافقانہ اسلام لایا اور غداری سے اس انصاری کو قتل کر کے قریش میں جا کر مل گیا ان واقعات کی بنا پر قتل شبہ کے متعلق متعدد احکام نازل ہوئے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ	کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو مار ڈالے،
قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ	لیکن غلطی سے اگر کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا، تو ایک مسلمان
إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ	غلام اور خون بہا اسکے وارثوں کو ادا کرنا چاہیے، لیکن یہ کہ وہ
لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ	معاف کریں تو خیر، اگر مقتول خود مسلمان ہو ہو کسی دشمن سے تو
قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ	صرف ایک غلام آزاد کر دو اور اگر ایسی قوم سے ہو جس سے تمہارے معاہدہ ہو
وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ	تو خون بہا بھی اور ایک غلام آزاد کرنا چاہیے، اگر قاتل کو یہ
مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا،	مقدور نہ ہو تو پے در پے دو مہینے روزے رکھنے چاہئیں کہ خدا کی
وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا	طرف رجوع ہو خدا علیم اور حکیم ہے، اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر، آیۂ کتب علیکم القصاص۔

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝

تو اسکی جزا دوزخ ہے، اسمیں ہمیشہ رہے گا، خدا اس پر غضب اور لعنت بھیجے گا، اور اُسکے لیے بڑا عذاب اسنے مہیا کیا ہے

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قصاص قتل کے متعلق یہ سب سے آخری حکم تھا، حفاظت جان کا آخری اعلان فتح مکہ کے موقع پر ہوا، جب آپ نے ارشاد فرمایا کہ "زمانہ جاہلیت کے تمام خون میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں"، اسکے بعد قتل خطا شبہ بہ قتل عمد کے خونبہا کی تحدید فرمائی،[1] قتل خطا کا خونبہا اہل قریہ کے لیے ۸۰۰ دینار مقرر کیا،[2]

۶ھ تک رہزنوں کے لیے کوئی حد مقرر نہ تھی، ۶ھ میں عکل و عرینہ کے قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ آکر مسلمان ہوئے یہاں کی آب و ہوا انکو راس نہ آئی، آنحضرت صلعم نے شہر سے باہر چراگاہ میں انکو قیام کی اجازت دی، ایک دن موقع پاکر مسلمان چرواہوں کو طرح طرح سے عذاب دیکر بڑی بے رحمی سے مار ڈالا، اور مویشی لوٹ کر لے گئے، وہ گرفتار ہو کر آئے تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بھی انکو اُسی طرح عذاب کے ساتھ قتل کا حکم دیا، گویہ برابر کا انتقام تھا، تاہم اسمیں کسی قدر بیرحمی تھی، اس لیے خدائے پاک کی طرف سے عتاب ہوا، اور ڈاکوؤں کے لیے علیحدہ احکام نازل ہوئے[3]

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ، (مائدہ ۵)

اُن لوگوں کی سزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑائی لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا پھانسی دیے جائیں یا ان کے اِدھر کے ہاتھ اور اُدھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں، یا ملک سے الگ کر دیے جائیں، (یعنی قید ہوں یا جلاوطن کیے جائیں)

جان کے بعد مال کا درجہ ہے، اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کے لیے قطع ید کی سزا جاری تھی، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا، اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا، ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا، چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی اس لیے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، حضرت

---

[1] ابوداؤد کتاب الدیات باب فی دیۃ الخطاء شبہ العمد [2] ابوداؤد، دیات الاعضاء [3] ابوداؤد، کتاب الحدود باب المحاربہ،

اسامہ بن زید آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بہت چہیتے تھے، اُن سے سفارش کرائی گئی، آپ بہت برہم ہوئے، اور لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ "تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقہ کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے، لیکن اونچے درجہ کے لوگ جب جرم کا ارتکاب کرتے تو اُن سے درگذر کرتے، خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا" اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی[1]

عربوں میں زنا کی کوئی سزا مقرر نہ تھی، یہودیوں میں توراۃ کی رو سے زانی کی سزا "رجم" یعنی (سنگسار کرنا) مقرر تھی، لیکن اخلاقی کمزوری کی بنا پر وہ اس قانون کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے، اطراف مدینہ میں جو یہود آباد تھے، رجم کے بجائے انھوں نے یہ سزا مقرر کی تھی کہ مجرم کے منہ میں کالک لگا کر کوچہ و بازار میں اسکی تشہیر کرتے تھے، جب آں حضرت صلعم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں نے ایک مجرم کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، غالباً یہ ۳ھ کے اندر کا واقعہ ہے، آپ نے استفسار فرمایا کہ تمھاری شریعت میں اس جرم کی کیا سزا ہے، انھوں نے اپنا رواج بتایا، آپ نے توراۃ منگوا کر اُن سے پڑھوایا، انھوں نے رجم کی آیت پر انگلی رکھکر چھپا دی، آخر ایک مسلمان یہودی نے نکال کر وہ آیت سنائی آپ نے فرمایا، خداوندا یہ تیرا حکم ہے جسکو ان لوگوں نے مردہ کر دیا ہے، میں سب سے پہلا شخص ہوں، جو تیرے اس حکم کو زندہ کروں گا"[2]، چنانچہ آپ نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ سنگسار ہو گیا،

۵ھ میں سورۂ نور نازل ہوا، جس میں زنا کی سزا سو دُرّے قرار دی گئی، حضرت عمر کا بیان ہے کہ رجم کی سزا بھی قرآن نے باقی رکھی تھی، لیکن اسکی تلاوت منسوخ ہو گئی[3]، بہرحال احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو درے اور بیاہوں کے لیے رجم کا حکم ہے[4]، چنانچہ ۵ھ میں ایک مسلمان نے اس جرم کا ارتکاب کیا، اور گو لوگوں کو اس کا علم نہ تھا، لیکن دنیا کی سزا کو آخرت کے عذاب پر اُسے ترجیح دی، اور مجمع عام میں آکر بارگاہِ نبوت میں عرض پرداز ہوا کہ یا رسول اللہ میں گنہگار ہوں مجھے پاک کیجیے، آپ نے تحقیق فرمائی اور اُس کے رجم کا حکم دیا[5]۔

[1] صحیح بخاری، غزوۃ الفتح، [2] ابو داؤد، باب فی رجم الیہودیین [3] صحیح بخاری رجم المحصن [4] تمام کتب حدیث میں یہ مذکور ہے [5] ۵ھ کی تحدید کہیں بتفصیل مذکور نہیں ہو یہ اس قیاس سے ہے کہ بعض حدیث سے اظہار کیا ہے کہ اس وقت حضرت ابوہریرہ مدینہ میں موجود تھے اور یہ ثابت ہے کہ وہ اسی سال زمانہ فتح خیبر مدینہ میں آئے تھے

شراب ۴ھ میں حرام ہوئی، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں شراب خواری کی کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی، چالیس درے تک لوگوں کو اس جرم میں مارے گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اسی درے کر دیئے تھے[1]، قذف یعنی پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا ۵ھ میں نازل ہوئی[2]،

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ	جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ
شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا	نہ لاسکیں تو انکو اسی درے مارو اور پھر کبھی ان کی گواہی
لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا (نور)	قبول نہ کرو

دنیا میں تین چیزیں ہیں، جان، مال، اور آبرو، جن حدود و تعزیرات کا اوپر ذکر ہوا، وہ انہیں تین چیزوں کے تحفظ کے لیے ہیں، اسی لیے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان قوانین کے نزول کے بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر حرم کے اندر ماہ حرام کی تاریخوں میں فرمایا

مسلمانو! ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو اسی طرح قابل حرمت ہے، جس طرح اس محترم شہر میں اس احاطۂ حرم کے اندر یہ مقدس دن قابل حرمت ہے "۔

حلال و حرام

ماکولات میں حلال و حرام عرب میں کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ تھا، اور نہ کوئی شے حلال یا حرام تھی، مردار، اور حشرات الارض تک کھاتے تھے، البتہ بعض بعض جانور جنکو بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے انکا ذبح کرنا گناہ سمجھتے تھے، بعض جانوروں میں یہ قید مانتے تھے کہ مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں، اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو مرد و عورت دونوں کھا سکتے ہیں، اور زندہ ہو تو صرف مرد کھائیں۔ اسی قسم کے اور بعض بت پرستانہ رسوم تھے، سورۂ انعام میں جو مکہ میں نازل ہوا تھا، ان رسوم کا تفصیلی ذکر ہے، اسلام کے اکثر احکام گو مدینہ میں اُترے لیکن ماکولات کی حلت و حرمت کے احکام مکہ ہی میں اترنے شروع ہو چکے تھے، چنانچہ سورۂ انعام میں مشرکین کے ان رسوم کی تردید کے بعد یہ حکم آیا۔

---

[1] ابو داؤد باب اذا تتابع فی الخمر، [2] واقعۂ افک اسی سال ہوا تھا، اور یہ آیت اسی تعلق سے نازل ہوئی ہے اسلئے اسکے لئے ۵ھ کا زمانہ متعین کیا گیا،

قُلْ لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (انعام)

کہدے کہ مجھ پر جو وحی اتری ہے، اُس میں کسی کھانے والے پر کوئی شے حرام نہیں، ہاں اگر حرام ہے تو مردار، یا بہتا ہوا خون یا سؤر کا گوشت کیونکہ یہ چیزیں ناپاک ہیں یا وہ گناہ (کا جانور) جو غیر خدا کے نام پر چڑھایا جاوے وہ بھی حرام ہے لیکن جو بھوک سے لاچار ہو کر نافرمانی اور گناہ کے ارادہ سے نہیں اس سے کچھ کھالے تو پروردگار معاف کرنے والا اور رحم والا ہے۔

مشرکین کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ جو آپ سے مر جائے اس کو حرام کہتے ہیں اور جسکو خود اپنے ہاتھ سے ماریں اس کو حلال جانتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں، اس پر یہ آیت اتری۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (انعام)

جو جانور خدا کا نام لیکر ذبح کیا گیا ہو وہ کھاؤ، جو خدا کا نام لیکر ذبح کیا گیا وہ کیوں نہ کھاؤ خدا نے تم پر جو حرام کیا ہے اسکو تو وہ بیان ہی کر چکا

اس کے بعد مکہ معظمہ ہی میں سورہ نحل کی آیت فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ الخ نازل ہوئی جس میں اُسی حکم سابق کا اعادہ کیا گیا، اور یہی چار چیزیں مردار، خون، سور، اور بتوں پر چڑھاوے، حرام بیان کی گئیں، مدینہ طیبہ آکر پہلے سورہ بقرہ میں إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ الخ تیسری بار یہ محرمات اربعہ بیان کیے گئے، عرب میں حلال و حرام کی تمیز کم تھی، وحشت وجہالت کے علاوہ اس کا ایک سبب، عام غربت اور افلاس تھی، اس لیے مسلمانوں کی مالی حالت جیسے جیسے درست ہوتی جاتی تھی، حلال و حرام کی تفریق بڑھتی جاتی تھی، لوگ عموماً مردار اُسی کو سمجھتے تھے جو بیمار ہو کر اپنی موت سے مر جائے، اس لیے اگر اور کسی سبب سے جانور مر جاتا تو اس کو حرام نہیں سمجھتے، ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد سورۂ مائدہ میں مردار (میتة) کی تفصیل بیان کی گئی، یعنی یہ کہ یا وہ گلا گھٹنے سے مرا ہو وَالْمُنْخَنِقَةُ، یا گردن ٹوٹنے سے مرا، وَالْمَوْقُوذَةُ یا اوپر سے گر کے مرا ہو، وَالْمُتَرَدِّيَةُ، یا کسی جانور کا سینگ لگ کر مر گیا ہو، وَالنَّطِيحَةُ، یا کسی جانور نے اس کو پھاڑا ہو، وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ۔ صرف وہ جانور حلال ہے جسکو تم نے ذبح کیا، إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ،

سنہ میں جب مسلمانوں کو خیبر کی فتوحات اور جاگیریں ہاتھ آئیں تو جانوروں میں بھی حلال و حرام کی تفریق کی گئی، اور اعلان کیا گیا کہ آج سے گدھا، درندہ جانور اور پنجہ دار پرند حرام ہیں سنہ میں فتح مکہ کے بعد طے کے قبیلے جو عیسائی تھا اسلام قبول کیا، اور شام کے بعض عیسائی مسلمان ہوئے، یہ لوگ شکاری کتے پالے تھے، اور اس سے شکار کرتے تھے، اسلام لانے پر ان کو معلوم ہوا کہ مردہ جانور حرام ہیں، اُنھوں نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں اپنا عرض حال کیا، اس پر یہ آیت اتری،

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ — تجھسے پوچھتے ہیں کہ انکے لیے کیا حلال کیا گیا کہدے کہ تمام ستھری چیزیں

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ شکاری جانور اگر سدھے ہوئے ہوں اور خدا کا نام لیکر چھوڑے جائیں تو اُس کا شکار کیا ہوا کھانا حلال ہے[۱]

شراب کی حرمت | مخالفین کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے اکثر احکام (مثلاً تعدد ازدواج وغیرہ) نفس پرستی کے موید تھے، اس لیے اہل عرب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی ایثار درکار نہ تھا، بلکہ اسلام وہی کہتا تھا جو وہ خود چاہتے تھے، اس بحث کی تحقیق آگے آئے گی، یہاں صرف تاریخی حیثیت سے شراب کی حرمت کا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے،

عرب کو شراب سے بڑھکر کوئی چیز محبوب نہ تھی، تمام ملک اس مرض میں مبتلا تھا، عرب کی شاعری کا موضوع اعظم شراب ہے، مصلحت کے لحاظ سے اسلام کے تمام احکام بتدریج آئے ہیں، اس لیے شراب بھی بتدریج حرام کی گئی۔

مدینہ میں شراب خواری کا رواج کسی قدر زیادہ تھا، بڑے بڑے شرفاء علانیہ شراب پیتے تھے، عرب میں ایسے بھی نیک لوگ تھے، جنھوں نے شراب پینی چھوڑ دی تھی، اور اسکو خلاف اتقا سمجھتے تھے، ابھی تک اسلام نے اسکے متعلق کوئی ایسا فیصلہ نہ سنایا تھا، لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے حضرت عمر نے کہا۔

اللهم بين لنا في الخمر بيانا شافيا — خدا شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کردے

اس پر یہ آیت اتری

[۱] ان جانوروں کے لیے ان آیتوں کے شان نزول تفسیروں میں دیکھو

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ، (بقرہ رکوع ۲۶)

لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت دریافت کرتے ہیں، تم کہدو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے گناہ بڑھکر ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف کی دعوت کی جس میں شراب بھی تھی، کھانے کے بعد مغرب کا وقت آگیا، اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی لیکن نشہ کے خمار میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے، (حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی کہ خدایا شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کردے) اس پر یہ آیت اتری،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ، (نساء)

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ جو تم کہو اُس کو سمجھ بھی سکو۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں نہ شامل ہونے پائے[1]، لیکن چونکہ عام حکم نہ تھا، اس لیے نماز کے سوا باقی اوقات میں لوگ بے تکلف پیتے پلاتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر وہی دعا کی، اسی زمانہ میں کچھ لوگ شراب پی کر اس قدر مست ہوئے کہ آپس میں مارپیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ اس پر یہ آیت[2] اتری

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ

مسلمانو! یہ شراب اور جوا اور بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں، تو تم ان سے باز آؤ کہ تم کو فلاح حاصل ہو، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں میں شراب اور جوئے کے ذریعہ سے دشمنی اور بغض ڈال دے

---

[1] یہ پورا واقعہ ابوداؤد کتاب الاشربہ میں مذکور ہے [2] ابوداؤد میں پوری آیتیں نہیں مذکور ہیں بلکہ چند لفظ نقل کرکے پوری آیت کی طرف اشارہ کردیا ہے

وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ — اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے،

اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ، (مائدہ) — تو کیا تم باز آئے ہو؟

(ان آیتوں کے نزول کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، اسی وقت آنحضرت صلعم نے مدینہ کی گلی کوچوں میں منادی کرادی کہ آج سے شراب حرام ہے لیکن باایں ہمہ شراب کی تجارت اور خرید و فروخت جاری تھی، ۸ھ میں یہ بھی حرام ہوگئی، آپ نے مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کرکے اسکا اسی وقت اعلان کیا[1]، اس کے بعد اسی سال فتح مکہ کے زمانہ میں آپ نے علی الاعلان اُن چیزوں کی تجارت کی ممانعت فرمائی جنکا کھانا یا رکھنا جائز نہیں، آپ نے فرمایا،

ان اللّٰه و رسوله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام[2] — (خدا اور اس کے رسول نے شراب، مردہ، سور، اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کردی)

غور کرو، شراب کی حرمت کس طرح اعلان عام کے ساتھ عمل میں آئی، باایں ہمہ ابھی تک یہ نہیں متعین ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے، محدثین اور ارباب روایت اس امر میں نہایت مختلف الآرا ہیں[3]۔

حافظ ابن حجر فتح الباری، کتاب التفسیر، سورۂ مائدہ باب لیس علی الذین آمنوا میں لکھتے ہیں۔

والذی يظهر ان تحريمها كان عام الفتح سنة ثمان لما روى احمد من طريق عبد الرحمن بن وعلة قال سالت ابن عباس عن بيع الخمر فقال كان لرسول الله صلى الله عليه وسلم صديق من ثقيف او دوس فلقيه — اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت فتح مکہ کے زمانہ ۸ھ میں ہوئی اور اسکی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے عبد الرحمن بن وعلہ کی سند سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے پوچھا کہ شراب کا بیچنا کیسا ہے تو انہوں نے کہا کہ آں حضرت صلعم

---

(1) صحیح بخاری (تفسیر آیت الربوا) و صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر، میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اواخر سورہ بقرہ کے نزول کے بعد جس میں حرمت ربوا کا حکم ہے یہ اعلان فرمایا، یہ آیتیں سنہ میں نازل ہوئی ہیں۔ (2) صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر والمیتہ والاصنام (3) سیرۃ النبی جلد اول میں حرمت شراب کی دو تاریخیں دو مختلف مقامات پر لکھی گئی ہیں صفحہ ۲۰۸ میں ۴ھ اور صفحہ ۲۹۰ میں ۸ھ لکھا گیا ہے پہلا بیان عام ارباب سیر کا ہے دوسرا علامہ ابن حجر کی تحقیق ہے لیکن مصنفین سیرت النبی کی اصلی تحقیق یہاں مذکور ہوتی ہے اور وہ اس باب میں عام محدثین کے ساتھ ہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا ۔ اس

یوم الفتح براویة خمر یهدیها الیه فقال له | کہ ایک دوست تھے ثقیف یا دوس کے قبیلہ سے تھے وہ آنحضرت صلعم سے فتح مکہ میں ملے

اما علمت ان الله حرمها، الخ | اور ایک مشک شراب تحفہ میں پیش کی، آپ نے فرمایا تم کو معلوم نہیں کہ خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے

ہماری رائے میں حافظ ابن حجر کا خیال اور ان کا استدلال صحیح نہیں، اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوا تھا، یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت تک حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی، بہت سے احکام ہیں جن کی خبر دور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوئی۔ علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہو گئی تھی۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شراب جیسی ناپاک چیز ۸ہجری تک حلال رہتی، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات سے صرف دو برس پہلے حرام ہوتی، حقیقت میں شراب ہجرت کے تیسرے یا چوتھے برس حرام ہو چکی تھی[۱]

سود کی حرمت | (سود[۲]) خواری بھی اُن اخلاق ذمیمہ میں سے ہے جو اہل عرب کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے تھے۔ اسی لیے نہایت تدریج کے ساتھ اسکی حرمت کے احکام بھی اترے، قریش عموماً تجارت پیشہ تھے، ان میں جو امیر

(۱) مصنف کا یہ قیاس بالکل درست ہے، جن صاحب کا یہ واقعہ ہے وہ قبیلہ ثقیف یا دوس سے تھے، ثقیف کا قبیلہ ۹ھ میں مسلمان ہوا، اور دوس گو بہت پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن وہ مدینہ سے بہت دور آباد تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے جسکی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی اور وہ یہ ہے جیسا کہ ہم ابھی متن میں پہلے لکھ آئے ہیں کہ شراب کا پینا گو ۴ھ میں حرام ہو چکا تھا، لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی چنانچہ یہ صاحب بھی بے فروش تھے۔ شراب کی خرید و فروخت ممانعت ربا کی حرمت کے ساتھ عمل میں آئی ہے اور ربا کی حرمت ۸ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے یعنی ۸ھ میں شراب فروشی کی ممانعت مدینہ میں اسی وقت کر دی گئی لیکن اس کا عام اعلان آپ نے فتح مکہ کے زمانہ میں فرمایا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں تصریح مذکور ہے (دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت ربا و باب بیع المیتہ والاصنام اور صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر) حافظ ابن حجر جو اس بات کے قائل ہیں کہ شراب کی حرمت ۸ھ میں نازل ہوئی وہ خود جلد اول صفحہ ۴۶۱ میں قاضی عیاض کے جواب میں لکھتے ہیں، قلت ويحتمل ان يكون تحريم التجارة فيها تأخر عن وقت تحريمها، والله اعلم، یعنی ممکن ہے کہ شراب پینے کی حرمت کے بعد شراب کی تجارت کی حرمت نازل ہوئی ہو" صحیح مسلم میں ابوسعید خدری سے روایت ہے (باب تحریم الخمر) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے اور اسکی خرید و فروخت کی ممانعت ایک ساتھ نازل ہوئی، لیکن اس کے بعد حضرت عائشہ اور جابر بن عبداللہ سے جو روایتیں ہیں۔ اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں حضرت ابوسعید خدری یا ان کے بعد کے راویوں سے کسی قدر تسامح ہوا ہے وهذا هو الحق علاوہ ازیں حافظ ابن حجر نے امام احمد کی جس حدیث سے فتح مکہ میں شراب نوشی کی حرمت کے نزول پر استدلال کیا ہے وہ حدیث صحیح مسلم (باب تحریم بیع الخمر) میں بھی ہے لیکن اس میں "فتح مکہ" کی تعیین نہیں ہے، سب سے بڑی دلیل اسکی یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے مسلمان بھائی جو شراب پی کر جنگ احد میں (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

(۲) اصابہ ناحم سود

اور دولتمند سوداگر تھے، وہ غریبوں اور کاشتکاروں کو بھاری شرح سود پر روپیہ قرض دیتے اور جب تک قرض وصول ہوتا اصل سرمایہ کو ہر سال بڑھاتے جاتے تھے[1]، خود آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چچا عباس (اسلام سے پہلے) بہت بڑے سودی کاروبار کے مالک تھے[2]، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی تاجروں کے سب سے یہاں مختلف قسم کے سود کا رواج دیکھا، سب سے پہلے آپ نے چاندی اور سونے کے اُدھار خرید و فروخت کو سود قرار دیا[3]، پھر دوگنے اور چوگنے سود لینے کی ممانعت آئی اور یہ آیت اتری،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، آل عمران — مسلمانو! دگنا چوگنا سود نہ کھایا کرو، اور خدا سے ڈرا کرو تاکہ فلاح پاؤ

اس کے بعد آپ نے ہم جنس اشیاء کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلہ منع فرمایا[4]، ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کیا، اُس وقت آپ نے اعلان فرمایا کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے[5]، سود کی حرمت کے متعلق تفصیلی احکام [illegible]ھ میں نازل ہوئے آل عمران کے بعد سورۂ بقرہ میں سب سے پہلے یہ آیت اتری،

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ — جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح شیطان کسی کو چھو کر مخبوط سا دیتا ہے، اسلیے کہ وہ یہ کہتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شریک ہوئے اور اسی حالت میں مارے گئے، ان کا کیا حال ہوگا اسپر یہ آیت لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا نازل ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت کا واقعہ جنگ احد سے بالکل متصل تھا اور جنگ احد کا زمانہ یہی ہے۔ بخاری تفسیر آیت مذکورہ میں حضرت جابر کی روایت ہے

صَبَّحَ أُنَاسٌ غَدَاةَ أُحُدٍ الْخَمْرَ فَقُتِلُوا مِنْ يَوْمِهِمْ جَمِيعًا شُهَدَاءَ وَذَلِكَ قَبْلَ تَحْرِيمِهَا، — غزوہ احد کی صبح کو کچھ لوگوں نے شراب پی، اور یہ سب اسی دن شہید ہوئے، یہ شراب کی حرمت سے پہلے ہوا

اس روایت کے ساتھ حضرت انس کی اس روایت کو ملاؤ، جو اس کے بعد ہی واقع ہے

فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ قُتِلَ قَوْمٌ وَهِيَ فِي بُطُونِهِمْ قَالَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا الخ) — حرمت شراب کی آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ کچھ لوگ اس حالت میں مارے گئے ہیں کہ شراب انکے پیٹ میں تھی اسپر یہ آیت اتری کہ مومنوں پر کچھ حرج نہیں)

---

[1] موطا امام مالک باب الربا، [2] ابن جریر تفسیر آیت ربا، [3] صحیح مسلم باب الصرف [4] صحاح کتاب البیوع

[5] صحیح مسلم باب بیع القلادہ فیہا خرز

قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ،

کہ بیع اور سود کا معاملہ ایک ہی ہے، خدا نے بیع کو تو حلال کیا اور سود کو حرام کردیا بس جسکے پاس خدا کی طرف سے نصیحت کی بات پہنچی اور وہ باز آگیا تو اوسکو وہی لینا چاہیے جو پہلے دیا۔

لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ سود بھی ایک قسم کی تجارت ہی، جب تجارت جائز ہے تو سود کیوں حرام ہے، اس سوال کا جواب تو کتاب کی دوسری جلدوں میں آئیگا، یہاں صرف سود کی تاریخ حرمت سے بحث ہے بہرحال اس آیت میں بھی سود کی قطعی حرمت کا فیصلہ ہوا آخر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد غالباً ۸ھ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ، (بقرہ)

مسلمانو! خدا سے ڈرو اور سود جو باقی رہ گیا ہے اسکو چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو اگر یہ نہ کرو تو خدا و رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ اگر باز آجاؤ تو تم کو اپنے راس المال کا حق ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے

یہ آیت جب اُتری تو آپ نے مسجد میں تمام مسلمانوں کو جمع کر کے یہ حکم سنایا،[۱] ۹ھ میں اہل نجران سے جو معاہدات صلح ہوئے اُن میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ "سود نہ لیں گے"[۲] دیکھو ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کے نزول سے پہلے تمام ملک عرب میں جسقدر سودی معاملات تھے، آپ نے سب کو کالعدم قرار دیا

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلۂ احکام کی سب سے آخری کڑی ہے[۳])

۱؎ صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر، ۲؎ ابوداؤد، باب اخذ الجزیہ ۳؎ صحیح بخاری تفسیر آیت واتقوا یوما، (بقرہ)

سالِ اخیر، حجۃ الوداع، اختتام فرضِ نبوت

ذی الحجہ ۱۰ھ مطابق فروری ۶۳۲ء

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ	جب خدا کی مدد آگئی اور مکہ فتح ہو چکا اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے
فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ	دین میں فوج کی فوج داخل ہو رہے ہیں، تو خدا کے حمد کی تسبیح
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا،	پڑھ، اور استغفار کر، خدا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ نصرت اور فتح کے مقابلہ میں شکر کی ہدایت ہونی چاہیے تھی، تسبیح اور استغفار کو فتح سے کیا مناسبت ہے؟ اسی بنا پر ایک صحبت میں حضرت عمرؓ نے صحابہ سے اس آیت کے معنی پوچھے، لوگوں نے مختلف معنی بتائے، حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا، وہ کمسن تھے اور جواب دیتے جھجکتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی ڈھارس بندھائی تو انہوں نے کہا کہ "یہ آیت آنحضرت صلعم کے قرب وفات کا اعلان[1] ہے کہ استغفار موت کے لیے مخصوص ہے"

اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا[2] تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آگیا، اس لیے اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت اور اخلاق کے تمام اصول اساسی کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے، آنحضرت صلعم نے ہجرت[3] کے زمانہ سے اب تک فریضۂ حج ادا نہیں فرمایا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ اذا جاء۔ واحدی نے اسباب النزول میں لکھا ہے کہ یہ سورہ آنحضرت صلعم کی وفات سے دو برس پہلے اتری لیکن ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ ۱۰ھ میں اور عین ایام تشریق میں اتری (یہ دوسری روایت اصل میں بیہقی کی ہے) ابن حجر اور زرقانی نے تصریح کی ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے اس لیے واحدی کی روایت صحیح ہے، سیوطی نے بھی اسباب النزول میں مصنف عبد الرزاق کے حوالہ سے یہی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورہ فتح مکہ کے بعد ہی فوراً نازل ہوئی بہر حال ایماء اور اشارات حدیث کے علاوہ خود اس سورہ کا طرز بیان ظاہر کر رہا ہے کہ وہ فتح مکہ کے متصل ہی اتری ہے۔ یعنی حجۃ الوداع سے تقریباً دو، پونے دو برس پہلے جن روایتوں میں وفات سے چند روز پہلے اس سورہ کا نازل ہونا بیان ہوا ہے وہ روایت اور درایت دونوں حیثیتوں سے ضعیف ہیں) [2] سنن ابن ماجہ میں ہے (باب حجۃ النبی صلعم) کہ ہجرت سے پہلے آپ نے دو حج فرمائے بعض حدیثوں میں جو یہ ہے کہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا (ترمذی باب کم حج النبی اور ابوداؤد وقت الاحرام) اس سے مقصود بعد ہجرت ہے)

ایک مدت تک تو قریش سدِ راہ رہے، صلح حدیبیہ کے بعد موقع ملا، لیکن مصالح اس کے مقتضی تھے کہ یہ فرض سب سے آخر میں ادا کیا جائے۔

بہرحال[۱] ذوقعدہ میں اعلان ہوا کہ آنحضرت صلعم حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے جارہے ہیں، یہ خبر دفعۃً پھیل گئی، اور شرف ہمرکابی کے لیے تمام عرب امڈ آیا، (سنیچر کے دن) ذوقعدہ کی ۲۶ تاریخ کو آپ نے غسل فرمایا اور چادر اور تہمد باندھی، نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے، تمام ازواج مطہرات کو ساتھ چلنے کا حکم دیا، مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ ایک مقام ہے جو مدینہ کی میقات ہے، یہاں پہنچکر رات بھر اقامت فرمائی، دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، حضرت عائشہ نے اپنے ہات سے آپ کے جسم مبارک میں عطر ملا[۲]) اس کے بعد آپ نے دو رکعت نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہوکر احرام باندھا اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے

لبیک لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک	اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں، ہم حاضر
ان الحمد والنعمۃ لک والملک لک لا شریک لک	ہیں تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے اور سلطنت میں تیرا کوئی شریک نہیں

حضرت جابر رضہ جو اس حدیث کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھاکر دیکھا تو آگے پیچھے، دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی، آدمیوں کا جنگل[۳] نظر آتا تھا، آنحضرت صلعم جب لبیک فرماتے تھے تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی اور تمام دشت وجبل گونج اٹھتے تھے،

فتح مکہ میں آپ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی، وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مسجدیں بنالی تھیں آنحضرت صلعم ان مساجد میں نماز ادا کرتے جاتے تھے، سرف پہنچکر غسل فرمایا، دوسرے دن (اتوار کے روز) ذوالحجہ

---

[۱] ابوداؤد اور صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کا واقعہ نہایت تفصیل سے مذکور ہے، جس کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت امام باقر نے حضرت جابر سے جب وہ نابینا ہوگئے تھے آنحضرت صلعم کے حج کا حال پوچھا حضرت جابر نے آل رسول کی محبت سے امام باقر کے گریبان کے تکمے کھولے اور ان کے سینہ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا بھتیجے! پوچھ کیا پوچھتا ہے؟ پھر نہایت تفصیل سے حج نبوی کے تمام حالات بیان کیے (اوقات کی تعیین بھی بخاری ومسلم میں حضرت ابن عباس، انس، اور حضرت عائشہ کی روایتوں میں ہے اور امام نسائی نے کتاب المناسک میں آنحضرت صلعم کے اوقات وتاریخ کے لیے خاص باب باندھا ہے) ([۲] صحیح بخاری وصحیح مسلم [۳] کم وبیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے۔)

کی چار تاریخ کو صبح کے وقت) مکہ معظمہ میں داخل ہوئے مدینہ سے مکہ تک کا یہ سفر نو دن میں طے ہوا خاندانِ ہاشم کے لڑکوں نے آمد آمد کی خبر سنی تو خوشی سے باہر نکل آئے، آپ نے فرط محبت سے اونٹ پر کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیا[۱]۔ کعبہ نظر پڑا تو فرمایا کہ "اے خدا اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے" پھر کعبہ کا طواف کیا، طواف سے فارغ ہو کر **مقام ابراہیم** میں دوگانہ ادا کیا اور یہ آیت پڑھی۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى	اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔

صفا پر پہونچے تو یہ آیت پڑھی۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ	صفا اور مروہ خدا کی نشانیاں ہیں۔

(یہاں سے) **کعبہ** نظر آیا تو یہ الفاظ فرمائے۔

لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله	خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اسکا کوئی شریک نہیں اسکے
الحمد يحيي ويميت وهو على كل شيء قدير لا اله	لیے سلطنت اور ملک اور حمد ہے، وہ مارتا اور جلاتا ہے اور وہ تمام چیزوں پر
الا الله وحده، انجز وعده، ونصر عبده وهزم	قادر ہے کوئی خدا نہیں مگر وہ اکیلا خدا، اسنے اپنا وعدہ پورا کیا
الاحزاب وحده،	اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی

صفا سے اتر کر کوہ **مروہ** پر تشریف لائے یہاں بھی دعا و تہلیل کی، اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے، صفا و مروہ کے طواف و سعی سے فارغ ہو کر آپ نے ان لوگوں کو جنکے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے، عمرہ تمام کر کے احرام اتار دینے کا حکم دیا، بعض صحابہ نے گذشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجا آوری میں معذرت کی آنحضرت صلعم نے فرمایا "اگر میرے ساتھ قربانی کے اونٹ نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا" حضرت علی حجۃ الوداع سے کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے، اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لیکر مکہ میں وارد ہوئے، چونکہ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے، اس لیے انھوں نے احرام نہیں اتارا، جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ

---

[۱] نسائی باب استقبال الحج، [۲] ابوداؤد،

منیٰ میں قیام فرمایا دوسرے دن نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز، صبح کی نماز پڑھکر منیٰ سے روانہ ہوئے،

قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لیے نکلتے تھے تو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں مقام کرتے تھے جو حرم کے حدود میں تھا، ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کیے تو انکی شان یکتائی میں فرق آجائے گا لیکن اسلام کو جو مساوات عام قایم کرنی تھی اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جاسکتی تھی، اس لیے (خدا نے حکم دیا، ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ آپ (بھی عام مسلمانوں کے ساتھ) عرفات میں آئے (اور یہ اعلان کرادیا[2]

وقفوا على مشاعركم فإنكم على إرث من إرث أبيكم إبراهيم — اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرے رہو کہ تم اپنے باپ ابراہیم کی وراثت پر ہو

یعنی عرفہ میں حاجیوں کا قیام حضرت ابراہیم کی یادگار ہے اور انھیں نے اس مقام کو اس غرض خاص کے لیے متعین کیا ہے، عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے وہاں آپ نے ایک) کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا، دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ پر (جسکا نام قصواء تھا) سوار ہوکر میدان میں آئے اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا،

(آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا، اور جاہلیت کے تمام بیہودہ مراسم کو مٹا دیا، اس لیے آپ نے فرمایا،

ألا كل شيء من أمر الجاهلية تحت قدمي موضوع[3] (صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد) — ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں،)

---

[1] صحیح بخاری باب الوقوف بعرفة [2] ابوداؤد، موضع الوقوف بعرفہ [3] اور اس کے بعد کے تمام عربی جملے آنحضرت صلعم کے خطبہ کے ٹکڑے ہیں۔ (یہ جملے کسی حدیث میں یکجا ساں نہیں ہوئے ہیں اسلئے ان کو مختلف ماخذوں سے جمع کرنا پڑا ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم (باب حجۃ النبیؐ وباب الدیات) اور ابوداؤد (باب الاشہر الحرم وحجۃ النبیؐ) وغیرہ میں یہ خطبہ حضرت ابن عباس حضرت ابن عمر حضرت ابوامامہ باہلی حضرت جابرؓ حضرت ابوبکرہؓ وغیرہ صحابہ کی روایتوں سے مذکور ہے ان روایتوں میں بعض باتیں مشترک ہیں مثلاً ان دماءکم واموالکم حرام علیکم کحرمۃ الخ اور بعض باتیں الگ ہیں۔ مغازی وسیر کی کتابوں میں کچھ اور باتیں بھی مذکور ہیں اصل یہ ہے کہ یہ ایک طویل خطبہ تھا ہر ایک شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا اُسی کی اُسے روایت کردی، اس بنا پر مختلف ماخذوں سے ان ٹکڑوں کو جمع کرلیا گیا ہے۔ اور اس کے جابجا حوالے دیے گئے ہیں خطبہ کے بعض ضمنی الفاظ مصنف نے چھوڑ دیے ہیں روایتوں میں ایک اور اختلاف ہے حضرت جابر اپنی روایت میں (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

تکمیل انسانی کی منزل میں سب سے بڑا سنگ راہ امتیاز مراتب تھا، جو دنیا کی قوموں نے، تمام مذاہب نے، تمام ممالک نے مختلف صورتوں میں قائم کر رکھا تھا، سلاطین سایہ یزدانی تھے، جنکے آگے کسی کو چون وچرا کی مجال نہ تھی، ائمہ مذہب کے ساتھ کوئی شخص مسائل مذہبی میں گفتگو کا مجاز نہ تھا شرفا، رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھی، غلام آقا کے ہمسر نہیں ہوسکتے تھے، آج یہ تمام تفرقے، یہ تمام امتیازات، یہ تمام حدبندیاں دفعۃً ٹوٹ گئیں،

لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربیّ کلکم ابناء آدم وآدم من التراب (عقد الفرید خطبہ نبوی)	عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے،
ان کل مسلم اخو المسلم وان المسلمین اخوۃ،	مسلمان مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔ (طبری و ابن اسحاق)
ارقاءکم ارقاءکم اطعموھم مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون (ابن سعد)	تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ، وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ،

عرب میں کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہوتا تو اس کا انتقام لینا خاندانی فرض ہوجاتا تھا یہانتک کہ سیکڑوں برس گذر جانے پر بھی یہ فرض باقی رہتا تھا، اور اسی بنا پر لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہوجاتا تھا، اور عرب کی زمین ہمیشہ خون سے رنگین رہتی تھی، آج یہ سب سے قدیم رسم عرب کا سب سے مقدم فخر، خاندانوں کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس خطبہ کا دن یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ اور حضرت ابوبکرہ اور حضرت ابن عباس دوسری روایتوں میں یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ بتاتے ہیں بعض روایتیں ایام التشریق کے خطبہ کی ہیں، ابن اسحاق نے اسکو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں خطبۂ حجۃ الوداع کے چند فقرے منقول ہیں جن میں یہ تصریح نہیں کہ کس تاریخ کے خطبہ میں آپ نے فرمایا، بہرحال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات کو یکجا کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اس حج میں تین دفعہ خطبہ دیا ۹ ذی الحجہ یوم عرفہ کو ۱۰ ذی الحجہ یوم النحر کو، اور تیسرا خطبہ ایام التشریق میں ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو، ان خطبوں میں اصولی طور پر بعض باتیں مشترک ہیں اور بعض مختص المقام ہیں یہ بہت ممکن ہے جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ چونکہ مجمع بہت بڑا تھا اور جو پیغام اس امت کو پہنچانا چاہتے تھے وہ نہایت اہم تھا، اس لیے آپ نے اسی تقریر کے بعض بعض فقرے مکرر اعادہ فرمائے ہیں (لہ یہ فقرہ حدیث اور سیر کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا ترمذی آخر کتاب المناقب اور ابوداؤد باب التفاخر بالاحساب میں اسکے ہم معنی مفہوم مذکور ہے، ان اللّٰہ اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء، انما ھو مومن تقی وفاجر شقی الناس کلھم بنو آدم وآدم خلق من التراب، لیکن اس روایت میں حجۃ الوداع کا نام نہیں ہے، البتہ مورخ یعقوبی نے جو تیسری صدی ہجری میں تھا، یہ فقرہ خطبۂ حجۃ الوداع میں نقل کیا ہے صفحہ ۱۲۳ طبع یورپ س)

پر محر مسئلہ برباد کر دیا جاتا ہے، (اور اس کے لیے سب سے پہلے اپنا نمونہ آپ پیش کرتا ہے)

ودماء الجاهلية موضوعةٌ وانّ اول دمٍ اضع من دمائنا دم ابن ربيعة بن الحرث ، (صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد، بہ روایت جابر رض)

جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیے گئے، اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحرث کے[1] خون باطل کر دیتا ہوں۔

(تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا ہوا تھا جس سے غربا کا ریشہ ریشہ جکڑا ہوا تھا اور جہلیت کے لیے وہ اپنے قرضخواہوں کے غلام بن گئے تھے، آج وہ دن ہے کہ اس جال کا تار تار الگ ہوتا ہے اس فرض کی تکمیل کے لیے بھی معلّمِ حق سب سے پہلے اپنے خاندان کو پیش کرتا ہے۔

وربا الجاهلية موضوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبد المطلب ، (صحیح مسلم و ابو داؤد)

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود، عباس[2] بن عبد المطلب کا سود باطل کرتا ہوں)

آج تک عورتیں ایک جائداد منقولہ تھیں، جو قمار بازیوں میں داؤں پر چڑھا دی جا سکتی تھیں، آج پہلا دن ہے کہ یہ گروہِ مظلوم، یہ صنفِ لطیف، یہ جوہرِ نازک، قدر دانی کا تاج پہنتا ہے،

فاتقوا الله فى النساء (صحیح مسلم و ابو داؤد)

(عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو)

اِنَّ لکم علٰى نسائكم حقا ولهن عليكم حقا (طبری ابن ہشام وغیرہ)

تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے

عرب میں جان و مال کی کچھ قیمت نہ تھی، جو شخص جس کو چاہتا تھا قتل کر دیتا تھا، اور جس کا مال چاہتا تھا چھین لیتا تھا آج امن و سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے)

[1] ربیعہ قریش کے خاندان سے تھے اور ان کے خون کا انتقام لینا میراث کی طور پر ایک فرض خاندانی چلا آتا تھا، (ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب آنحضرت صلعم کے چچا زاد بھائی تھے، اور بعض روایتوں میں خود ان کے قتل کا ذکر ہے لیکن یہ صحیح نہیں، ربیعہ خلافت فاروقی تک زندہ تھے اور ۲۳ھ میں وفات پائی صحیح یہ ہے کہ ربیعہ کا ایاس نام ایک بیٹا تھا وہ قبیلہ بنی سعد میں پرورش پا رہا تھا کہ ہذیل نے اسکو قتل کر ڈالا دیکھو ابو داؤد و صحیح مسلم، باب حجۃ النبی صلعم اور زرقانی جلد ۵ صفحہ ۱۹۲-)

[2] آنحضرت صلعم کے چچا عباس اسلام سے پہلے سود کا کاروبار کرتے تھے، بہت سے لوگوں کے ذمہ ان کا سود باقی تھا، (دیکھو تفسیر آیات ربا، ج ۵ ص ۳) اس کے بعد آپ نے زن و شوہر کے فرائض کی تفصیل فرمائی)

إنّ دماءكم وأموالكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا	تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے
في بلدكم هذا إلى يوم تلقون ربكم (صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ)	جس طرح یہ دن، یہ مہینہ، اور یہ شہر حرام ہے

(اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے لیکن انکی بنیاد خود صاحب شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی، انکو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں صدیوں کی ہوس پرستیوں نے انکی حقیقت گم کردی تھی، ایک ہی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایات ربّانی کا مجموعہ خود اپنے ہات سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہی اور تاکید کرتا ہی)

وإني قد تركت فيكم ما لن تضلوا بعده إن اعتصمتم به كتاب الله، (صحاح)	میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اسکو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ

اُس کے بعد آپ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا[1]،

إنّ الله عزّ وجلّ قد أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث	خدا نے ہر حقدار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دیدیا اب کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں،
الولد للفراش وللعاهر الحجر وحسابهم على الله۔	لڑکا اُس کا ہے جسکے بستر پر پیدا ہوا، زناکار کے لیے پتھر ہے اور اُن کا حساب خدا کے ذمہ ہے
من ادّعى إلى غير أبيه أو تولّى إلى غير مواليه فعليه لعنة الله،	جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت
ألا لا يحل لامرأة أن تعطي من مال زوجها شيئا إلا بإذنه الدين مقضيّ والعارية مؤداة والمنحة مردودة، والزعيم غارم)	ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اسکی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس کیجائے، عطیہ لوٹایا جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے)

(۱) سنن ابن ماجہ باب الوصایا و مسند ابوداؤد طیالسی بروایت ابی امامۃ الباہلی ابوداؤد کتاب الوصایا میں مختصراً ہے ابن سعد اور ابن اسحاق نے بھی اسکی بسند روایت کی ہے کہ یہ عرفہ کے خطبہ میں آپ نے فرمایا)

یہ فرما کر آپ نے مجمع کی طرف خطاب کیا،

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون (صحیح مسلم وابوداؤد) تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائیگا، تم کیا جواب دوگے،

صحابہؓ نے عرض کی ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا، اور اپنا فرض ادا کردیا،، آپ نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی، اور تین بار فرمایا،

اللھم اشھد (صحیح مسلم وابوداؤد) اے خدا تو گواہ رہنا۔

عین اُسوقت جب آپ یہ فرض نبوت ادا کر رہے تھے یہ آیت اُتری[۱]،

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا، آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لیے مذہب اسلام کو انتخاب کرلیا۔

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شاہنشاہ عالم جسوقت لاکھوں آدمیوں کے بیچ میں فرمان ربانی کا اعلان کر رہا تھا، اُس کے تحت شاہنشاہی کا مسند و بالیں (کجاوہ اور عرق گیر) ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا[۲]

خطبہ سے فارغ ہوکر آپ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، اور ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر ناقہ پر سوار ہوکر موقف تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہوکر دیر تک قبلہ رو دعاء میں مصروف رہے، جب آفتاب ڈوبنے لگا تو آپ نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی حضرت اُسامہؓ بن زید کو اونٹ پر پیچھے بٹھالیا، آپ ناقہ کی زمام کھینچے ہوئے تھے، یہاں تک کہ اسکی گردن کجاوے میں آکر لگتی تھی، لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہوگیا تھا، لوگوں کو دست راست سے، اور بخاری میں ہے کہ کوڑہ سے آپ اشارہ کرتے جاتے تھے کہ آہستہ آہستہ!! اور زبان مبارک سے ارشاد فرما رہے تھے،

السکینۃ ایہا الناس السکینۃ ایہا الناس (صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد) لوگو! سکون کے ساتھ! لوگو! سکون کے ساتھ،

اثنائے راہ میں ایک جگہ اُتر کر طہارت کی، اُسامہ نے کہا، یارسول اللہ نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے، فرمایا

(۱) صحیح بخاری وصحیح مسلم وابوداؤد وغیرہ (ابن سعد میں تصریح خاص ہے) (۲) طبقات ابن سعد صفحہ ۱۲۷ (کتاب الشمائل للترمذی وابن ماجہ)

نماز کا موقع آگے آتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد آپ تمام قافلہ کے ساتھ مزدلفہ پہنچے، یہاں پہلے مغرب کی نماز پڑھی، اسکے بعد لوگوں نے اپنے اپنے پڑاؤ پر جاکر سواریون کو بٹھایا، ابھی سامان کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ فوراً ہی نماز عشا کی تکبیر ہوئی نماز سے فارغ ہوکر آپ لیٹ گئے اور صبح تک آرام فرمایا، بیچ میں روزانہ دستور کے خلاف عبادت شبانہ کے لیے بیدار ہوے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ یہی ایک شب ہے جس میں آپ نے نماز تہجد ادا نہیں فرمائی، صبح سویرے اُٹھکر باجماعت فجر کی نماز پڑھی، کفار قریش مزدلفہ سے اُسوقت کوچ کرتے تھے جب آفتاب پورا نکل آتا تھا، اور آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیون پر دھوپ چمکنے لگتی تھی، اُسوقت آواز بلند کہتے تھے "کوہ ثبیر! دھوپ سے چمک جا"، آنحضرت صلعم نے اس رسم کے ابطال کے لیے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے کوچ کیا[1]، یہ ذیحجہ کی دسویں تاریخ اور سنیچر کا دن تھا،

فضل بن عباس آپ کے برادر عم زاد ناقہ پر ساتھ تھے، اہل حاجت داہنے بائیں حج کے مسائل دریافت کرنے کے لیے آرہے تھے، آپ جواب دیتے تھے، اور رہ رہ کر مناسک حج کی تعلیم دیتے جاتے تھے[2]، وادی محسّر کے راستہ سے آپ جمرة کے پاس آئے، ابن عباس سے جو اسوقت کمسن تھے فرمایا مجھے کنکریاں چنکر دو، آپ نے کنکریاں پھینکیں اور لوگوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا[3]،

ایاکم والغلو فی الدین فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین (ابن ماجہ ونسائی)	مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں،

اسی اثنا میں آپ یہ بھی فرماتے،

لتاخذوا مناسککم فانی لا ادری لعلی لا احج بعد حجتی ھذہ (مسلم وابوداؤد)	حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا، شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت آئے

یہاں سے فارغ ہوکر منٰی کے میدان میں تشریف لائے، داہنے بائیں آگے پیچھے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا مجمع تھا، مہاجرین قبلہ کے داہنے، انصار بائیں، اور بیچ میں عام مسلمانوں کی صفیں تھیں، آنحضرت صلعم ناقہ پر سوار تھے،

---

[1] صحیح بخاری وابوداؤد، [2] ابوداؤد، [3] نسائی

حضرت بلال کے ہاتھ میں ناقہ کی مہار تھی، حضرت اسامہ بن زید پیچھے بیٹھے کپڑا تان کر سایہ کیے ہوئے تھے، آپ نے نظر اُٹھا کر اس عظیم الشان مجمع کی طرف دیکھا تو فرائض نبوت کے ۲۳ سالہ نتائج نگاہوں کے سامنے تھے، زمین سے آسمان تک قبول و اعترافِ حق کا نور ضوفشاں تھا، دیوانِ قضا میں انبیائے سابقین کے فرائض تبلیغ کے کارنامے ختم رسالت کی مہر ثبت ہو رہی تھی، اور دنیا اپنی تخلیق کے لاکھوں برس کے بعد دینِ فطرت کی تکمیل کا مژدہ، کائنات کے ذرہ ذرہ کی زبان سے سن رہی تھی، عین اسی عالم میں زبانِ حق محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کام و دہن میں زمزمہ پرداز ہوئی،)

اب ایک نئی شریعت، ایک نئے نظام اور ایک نئے عالم کا آغاز تھا، اس بنا پر ارشاد فرمایا،

ان الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السموات والارض، (رواۃ ابو بکرہ)	اللہ نے جب آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا، زمانہ پھر پھرا کے آج پھر اسی نقطہ پر آگیا،

(ابراہیمؑ خلیل کے طریق عبادت (حج) کا موسم اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا، اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی قسم کی خونریزی جائز نہیں تھی[1] اس لیے عربوں کے خون آشام جذبات حملۂ جنگ کے لیے اسکو کبھی گھٹا کبھی بڑھا دیتے تھے، آج وہ دن آیا کہ اس اجتماعِ عظیم کے لیے اشہرِ حُرُم کی تعیین کردی جائے، آپ نے فرمایا،

السنة اثنا عشر شهرا منها اربعة حرم ثلاثة متواليات ذوالقعدة وذوالحجة والمحرم ورجب شهر مضر الذی بین جمادی وشعبان (رواۃ ابو بکرہ)	سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابل احترام ہیں تین متواتر مہینے ہیں، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔

(۱) حج کے ان مہینوں کے احترام اور بزرگی کا تخیل عرب میں نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا، اور عرب کے تمام فرقے خواہ یہودی یا عیسائی یا کسی اور مذہب کے پیرو ہوں سب ان ایام کی عزت کرتے تھے، ان مہینوں میں جنگ و جدال اور لڑائی بھڑائی حرام جانتے تھے، قدیم اشعار عرب میں اس کا بیان نہایت کثرت سے ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی عربوں کے اس عقیدہ کا ذکر ہے ۵۴۱ء میں رومیوں کو شام اور فلسطین میں کوئی جنگی کارروائی کرنی تھی اور ساتھ ہی عربوں کے حملہ کا خوف لگا تھا سپہ سالار روم جو عربوں کے اندرونی حالات سے واقف تھا اسے جواب دیا کہ اس زمانہ میں عربوں سے کوئی خوف نہیں کیونکہ عنقریب وہ دو مہینے آرہے ہیں جنہیں اہل عرب عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں اور کسی قسم کا ہتھیار نہیں لگاتے (نتائج الافہام محمود پاشا فلکی صفحہ ۲۵ بحوالۂ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل، اپریل ۱۸۴۳ء) میں

دنیا میں عدل و انصاف اور جور و ستم کا محور صرف تین چیزیں ہیں جان، مال، اور آبرو؛ آنحضرت صلعم کل کے خطبہ میں گو انکے متعلق ارشاد فرما چکے تھے، لیکن عرب کے صدیوں کے رنگ دور کرنے کے لیے مکرر تاکید کی ضرورت تھی، آج آپ نے اس کے لیے عجب بلیغ انداز اختیار فرمایا) لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا "کچھ معلوم ہے آج کونسا دن ہے؟" لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ دیر تک چپ رہے، لوگ سمجھے کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے، دیر تک سکوت کے بعد فرمایا "کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا، ہاں ٹھیک ہے، پھر ارشاد ہوا "یہ کونسا مہینہ ہے؟" لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا، آپ نے پھر دیر تک سکوت کیا اور فرمایا، کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا، ہاں ٹھیک ہے، پھر پوچھا یہ کون شہر ہے؟ لوگوں نے بدستور جواب دیا، آپ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا، کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ لوگوں نے عرض کی ہاں ٹھیک ہے، جب سامعین کے دل میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو چکا کہ آج کا دن بھی، مہینہ بھی، اور خود شہر بھی محترم ہے، یعنی اس دن، اس مقام میں جنگ اور خونریزی جائز نہیں، تب فرمایا

فان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا (روایت ابوبکرہ)	تو تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو، (تا قیامت) اسطرح محترم ہے جسطرح یہ دن، یہ مہینہ، اور یہ شہر محترم ہے،

(قوموں کی بربادی ہمیشہ آپس کے جنگ و جدال اور باہمی خونریزیوں کا نتیجہ رہی ہے وہ پیغمبر جو ایک لازوال قومیت کا بانی بنکر آیا تھا، اسے اپنے پیرؤوں سے آواز بلند کہا،

لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم (روایت ابوبکرہ)	ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، تمکو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑیگا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس کریگا،

ظلم و ستم کا ایک عالمگیر پہلو یہ تھا کہ اگر خاندان میں کسی ایک شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اس خاندان کا ہر شخص اس جرم کا قانونی مجرم سمجھا جاتا تھا، اور اکثر اصلی مجرم کے روپوش یا فرار ہو جانے کی صورت میں بادشاہ کا اس خاندان میں سے جسپر قابو چلتا تھا اسکو سزا دیتا تھا، باپ کے جرم کے بدلے بیٹے کو سولی دی جاتی تھی، اور بیٹے کے جرم کا

خمیازہ باپ کو اٹھانا پڑتا، یہ سخت ظالمانہ قانون تھا، جو مدت سے دنیا پر حکمران تھا، اگرچہ قرآن مجید نے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کے وسیع قانون کے رو سے اس ظلم کی ہمیشہ کے لیے بیخکنی کر دی تھی، لیکن اسوقت جب دنیا کا آخری پیغمبر ایک نیا نظام سیاست ترتیب دے رہا تھا، اس اصول کو فراموش نہیں کرسکتا تھا، آپ نے فرمایا،

الا لا یجنی جان الا علی نفسہ، الا لا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ (ابن ماجہ و ترمذی)

ہاں مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں،

عرب کی بدامنی اور نظام ملک کی بے ترتیبی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی خداوندی کا آپ مدعی تھا، اور دوسرے کی ماتحتی اور فرمانبرداری کو اپنے لیے ننگ اور عار جانتا تھا، ارشاد ہوا،

ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (صحیح مسلم)

اگر کوئی حبشی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تمکو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کرو،

ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اسوقت اسلام کے نور سے منوّر ہو چکا تھا، اور خانۂ کعبہ ہمیشہ کے لیے ملت ابراہیم کا مرکز بن چکا تھا، اور فتنہ پردازانہ قوتیں پامال ہو چکی تھیں، اس بنا پر آپ نے ارشاد فرمایا،

الا ان الشیطان قد ایس ان یعبد فی بلدکم هذا ابدا ولکن ستکون لہ طاعۃ فیما تحتقرون من اعمالکم فسیرضی بہ (ابن ماجہ و ترمذی)

ہاں شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمہارے اس شہر میں اسکی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں تم اسکی پیروی کروگے اور وہ اس پر خوش ہوگا۔

سب سے آخر میں آپ نے اسلام کے فرائض اولین یاد دلائے۔

اعبدوا ربکم وصلّوا خمسکم وصوموا شہرکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم (زاد المعاد)

اپنے پروردگار کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینہ کا روزہ رکھا کرو، اور میرے احکام کی اطاعت کرو، خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے،

یہ فرما کر آپ نے مجمع کی طرف اشارہ کیا، اور فرمایا

الا ہل بلغت

کیوں، میں نے پیغام خداوندی سنا دیا،

سب لوگ اُٹھے ہاں اقرار فرمایا،

اللّٰھم اشھد　　　اے خدا تو گواہ رہنا،

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا،

فلیبلغ الشاھد الغائب　　　تو جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو بتا دیں جو موجود نہیں،

(خطبہ[1] کے اختتام پر آپ نے تمام مسلمانوں کو الوداع کہا[2]،

اس کے بعد آپ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے، اور فرمایا کہ، قربانی کے لیے منیٰ کی کچھ تخصیص نہیں ہے، بلکہ منیٰ اور مکہ کی ایک ایک گلی میں قربانی ہو سکتی ہے" آپ کے ساتھ قربانی کے سو اونٹ تھے، کچھ تو آپ نے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور باقی حضرت علی کے سپرد کر دیئے، کہ وہ ذبح کریں، اور حکم دیا کہ گوشت پوست جو کچھ ہو، سب خیرات کر دیا جائے، یہاں تک کہ قصاب کی مزدوری بھی اِس سے ادا نہ کی جائے، الگ سے دی جائے،

قربانی سے فارغ ہو کر آپ نے معمر بن عبد اللہ کو بلوایا اور سر کے بال منڈوائے، اور فرط محبت سے کچھ بال خود اپنے دست مبارک سے ابوطلحہ انصاری اور ان کی بیوی ام سلیم اور بعض اُن لوگوں کو جو پاس بیٹھے تھے[3] عنایت فرمائے، اور باقی ابوطلحہ نے اپنے ہاتھ سے تمام مسلمانوں میں ایک ایک دو دو کر کے تقسیم کر دیے۔ اس کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لائے، خانہ کعبہ کا طواف کیا، اس سے فارغ ہو کر چاہِ زمزم کے پاس آئے چاہ زمزم سے حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت خاندان مُطّلب سے متعلق تھی، چنانچہ اس وقت اسی خاندان کے لوگ پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے آپ نے فرمایا،" بنی عبد المطلب اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھ کو ایسا کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی تمہارے ہاتھ سے ڈول چھین کر خود اپنے ہاتھ سے پانی نکالنے لگیں گے، تو میں خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کے پیتا" حضرت عباس نے ڈول میں پانی نکال کر پیش کیا، آپ نے قبلہ رُخ ہو کر کھڑے کھڑے پانی پیا۔ پھر یہاں سے منیٰ واپس تشریف لے گئے، اور وہیں نماز ظہر[4] ادا فرمائی۔

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بہت بڑا تھا صحیح مسلم (حج) میں روایت ہے کہ قال قولا کثیرا، آپ نے بہت سی باتیں فرمائیں" صحیح بخاری (حجۃ الوداع) میں ہے کہ آپ نے اس میں دجال کا بھی ذکر فرمایا تھا لیکن یہ تعیین نہیں کہ کس دن کے خطبہ میں یہ فرمایا)

[2] صحیح بخاری باب الخطبۃ ایام منیٰ [3] صحیح مسلم و ابو داؤد، [4] حضرت ابن عمر کی حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے کہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

بقیہ ایام التشریق یعنی ۱۲ ذی الحجہ تک آپ نے مستقل اقامت منیٰ ہی میں فرمائی، ہر روز زوال کے بعد رمی جمار کی غرض سے تشریف لے جاتے اور پھر واپس آجاتے **ابو داؤد** (باب الخطبۃ بمنیٰ) میں ایک حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۲ ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں ایک خطبہ دیا تھا جس کے الفاظ مختصراً وہی ہیں جو پہلے خطبوں میں گذر چکے، ۱۳ ذی الحجہ کو سہ شنبہ کے دن زوال کے بعد آپ نے یہاں سے نکل کر وادی محصبؔ[1] میں قیام کیا، اور رات کو اسی مقام پر آرام فرمایا، پچھلے پہر اُٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ کعبہ کا آخری طواف کرکے وہیں صبح کی نماز ادا کی، اسکے بعد قافلہ اسی وقت اپنے اپنے مقام کو روانہ ہوگیا، اور آپ نے مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی، راہ میں ایک مقام خُم پڑا، جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اور اس لیے اس مقام کا عام نام روایتوں میں غدیر خُم آتا ہے، آپ نے یہاں تمام صحابہ کو جمع کرکے ایک مختصر سا خطبہ دیا،

اما بعد الا ایها الناس فانما انا بشر	حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے کہ خدا کا فرستہ جلد آجائے
یوشک ان یاتی رسول ربی فاجیب، وانا	اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت) میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں
تارك فیكم الثقلین اولهما كتاب الله	چھوڑتا ہوں ایک خدا کی کتاب جسکے اندر ہدایت اور روشنی ہے خدا کی کتاب کو مضبوطی
فیه الهدى والنور فخذوا بكتاب الله	سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہلبیت ہیں میں اپنے اہلبیت کے بارہ
واستمسكوا به واهل بیتی اذكركم الله فی اهل بیتی،	میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔

آخری جملہ کو آپ نے تین دفعہ مکرر فرمایا، یہ صحیح مسلم (مناقب حضرت علی) کی روایت ہے نسائیؔ، مسند امام احمد ترمذیؔ، طبرانیؔ، طبریؔ، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں، جنمیں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے، ان فقروں

[1] (بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آپ نے ظہر کی نماز حسب دستور اس دن بھی منیٰ میں پڑھی، لیکن حضرت جابر کی جو طویل حدیث قصۂ حجۃ الوداع میں ہے اس میں تصریح ہے کہ آپ نے مکہ میں نماز ظہر پڑھی حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اس بنا پر محدثین میں اُن دونوں قولوں کی باہمی ترجیح، اور وجوہ ترجیح میں اختلاف ہے علامۂ ابن حزم نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے اور علامۂ ابن قیم نے زاد المعاد میں پہلے قول کو مرجح ثابت کیا ہے ورنعص کے موازنۂ دلائل کے بعد ہمنے اس قسم کا فیصلہ قول کیا ہے ـ س)

میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے،

من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللھم وال	جسکا میں محبوب ہوں علی بھی اسکو محبوب ہونا چاہیے، الٰہی جو علی
من والاہ وعاد من عاداہ،	سے محبت رکھے اُسے تو بھی محبت رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اسے تو بھی عداوت رکھ،

احادیث میں خاص یہ تصریح نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی، بخاری میں ہے کہ اسی زمانہ میں حضرت علی یمن بھیجے گئے تھے، جہاں سے واپس آکر وہ حج میں شامل ہوئے تھے یمن میں انھوں نے اپنے اختیار سے ایک ایسا واقعہ کیا تھا جسکو انکے بعض ہمراہیوں نے پسند نہیں کیا، ان میں سے ایک صاحب نے آکر رسول اللہ صلعم سے شکایت کی، آپ نے فرمایا "علی کو اس سے زیادہ کا حق تھا[1]" عجب نہیں کہ اسی قسم کے شکوک رفع کرنے کے لیے اس موقع پر آپ نے یہ الفاظ فرمائے،

مدینہ کو غرض ذوالحلیفہ میں شب بسر کی، صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا، اور دوسری طرف کوکبۂ نبوی مدینہ میں داخل ہوا سواد مدینہ پر نظر پڑی تو یہ الفاظ فرمائے[2]،

اللہ اکبر لا الہ الا اللہ وحدہ لا	خدا بزرگ و برتر ہے اسکے سوا کوئی خدا نہیں کوئی اس کا شریک
شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو	نہیں بس اُسی کی سلطنت ہے اسی کے لیے مدح و ستایش ہے وہ ہر شے
علی کل شیء قدیر، آئبون تائبون	پر قادر ہے، لوٹے آرہے ہیں توبہ کرتے ہوئے دربار دارانہ زمین پر
عابدون ساجدون لربنا حامدون، صدق	پیشانی رکھکر اپنے پروردگار کی مدح و ستایش میں مصروف ہوکر، خدا نے
اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ)	اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی نصرت کی اور تمام قبائل کو تنہا شکست دی)،

---

[1] صحیح بخاری بعث علی الی الیمن و فردی مناقب حضرت علی، [2] حجۃ الوداع کے واقعات تمام تر صحیح بخاری صحیح مسلم، سنن ابو داؤد اور نسائی سے لیے گئے ہیں، ہر واقعہ کے لیے ان کتابوں میں کتاب الحج کے مختلف ابواب دیکھو)

وفات

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ (زمر)

ربیع الاول سنہ ۱۱ھ

مطابق

مئی سنہ ۶۳۲ء

روح قدسی کو عالم جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی کہ تکمیل شریعت اور تزکیۂ نفوس کا عظیم الشان کام، درجۂ کمال تک پہنچ جائے، **حجۃ الوداع** میں یہ فرض اہم ادا ہو چکا، توحید کامل اور مکارم اخلاق کے اصول عملاً قائم کر کے **عرفات** کے مجمع عام میں اعلان کر دیا گیا کہ

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں،

(**سورۂ فتح** کا نزول خاص خاص صحابہ کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرب وفات کی اطلاع دے چکا تھا[۱]، اور آپ حکم ربانی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (فتح) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح و تہلیل میں بسر فرماتے تھے[۲]، آپ عموماً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے، لیکن رمضان سنہ ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے، سال میں ایک دفعہ ماہ رمضان میں آپ پورا قرآن ناموس اکبر کی زبانی سنتے تھے، لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا[۳]، حجۃ الوداع کے موقع پر مناسک حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ مجھے امید نہیں کہ آئندہ سال تم سے مل سکوں" بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں، "شاید میں اس کے بعد حج نہ کر سکوں[۴]"، غدیر خم کے خطبہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ ادا ہوئے،

غزوہ **احد** کے بیان میں گذر چکا ہے کہ شہدائے اُحد کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی، تمام غزوات میں صرف

۱؎ صحیح بخاری تفسیر اذا جاء ۲؎ اس قسم کی روایتیں گو طبری، ابن خزیمہ، اور ابن مردویہ میں ہیں، لیکن مختصراً صحیح بخاری تفسیر اذا جاء میں بھی مذکور ہیں ۳؎ صحیح بخاری باب الاعتکاف و باب تالیف القرآن، ۴؎ صحیح مسلم، ابو داؤد، و نسائی، کتاب الحج)

غزوۂ احد ہی ایک ایسا غزوہ ہے جسمیں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بیکسی کیساتھ جان دی، اسلیے انکی یاد آپکے دلمیں اسوقت بھی موجود تھی،

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیض دیدار سے مشرف فرمایا اور انکو حسرت کے ساتھ وداع کیا، شہدائے اُحد جو کُلٌّ ھُمْ اَحْیَاءٌ کے فردِ کامل اسے فیضیاب تھے، آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپنے اُنکو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اسی زمانہ میں اُنکی قبر پر تشریف لے گئے، اور اُنکے لیے دعائے خیر فرمائی، اور اس رقت انگیز طریقہ سے انکو وداع کیا کہ "جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزہ کو وداع کرتا[1] ہے" اس کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا "میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں، اسکی وسعت اتنی ہی جتنی ایلہ سے جحفہ تک، مجھکو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کروگے لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں نہ مبتلا ہو جاؤ، اور اس کے لیے آپس میں کشت و خون نہ کرو، تو پھر اُسی طرح ہلاک ہو جاؤ جسطرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں" راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو خطبہ دیتے ہوئے سنا،

غزوات میں گذر چکا ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حدود شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا، آنحضرت صلعم اُن سے انکا قصاص لینا چاہتے تھے آغاز علالت سے ایک روز پہلے آپ نے اُسامہؓ بن زید کو مامور کیا کہ وہ فوج لیکر جائیں اور اُن شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں[2]،

(۱۸ یا ۱۹) صفر[3] ۱۱ھ میں آدھی رات کو آپ جنۃ البقیع میں (جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا) تشریف لیگئے وہاں سے

(1) صحیح بخاری کتاب الجنائز، و صحیح مسلم باب اثبات الحوض، (2) واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں آنحضرت صلعم نے حضرت ابو بکر و عمرؓ کو بھی جانیکا حکم دیا تھا لیکن یہ روایتیں بے سند ہیں، اس لیے علامہ ابن تیمیہ نے اسی سند کے ساتھ انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کے متعلق تو نہیں کہا جاسکتا لیکن حضرت ابو بکر کو آپ نے ایام علالت میں امام نماز مقرر فرمایا اور یہ صحیح روایت سے ثابت ہے اس بنا پر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پہلے حضرت ابو بکر کو جانے کا حکم ہوا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آپ نے انکو مستثنی کر لیا، (3) آنحضرت صلعم کی ابتدائے مرض کے دن، مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، امر مختلف فیہ سے پہلے اُن امور کو بتا دیا جاتا ہے جن پر تمام روایات کا اتفاق ہے اور جن پر گویا تمام محدثین اور ارباب سیر کا اجماع عام ہے اور وہ یہ ہیں (۱) سال وفات ۱۱ھ ہے (۲) مہینہ ربیع الاول کا تھا (۳) یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی، (۴) دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات کتاب الجنائز) زیادہ تر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کل ۱۳ دن بیمار رہے، اس بنا پر اگر یہ تحقیقی طور سے متعین ہو جائے کہ آپ نے کس تاریخ کو وفات فرمائی، تو تاریخ آغاز مرض بھی متعین کی جاسکتی ہے حضرت عائشہ کے گھر بروایت صحیح ۸ روز (ایک دوشنبہ سے دوسرے دوشنبہ تک) بیمار رہے اور یہیں وفات فرمائی اس لیے (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ ہو)

واپس تشریف لائے تو مزاج ناساز ہوا (یہ حضرت میمونہ ؓ کی باری کا دن تھا، اور روز چہارشنبہ تھا، پانچ دن تک آپ اس حالت میں بھی از راہِ عدل وکرم باری باری ایک ایک بیوی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے، دوشنبہ کے دن) مرض میں شدت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایام علالت کی مدت آٹھ روز یقینی ہے، عام روایات کے رو سے پانچ دن اور چاہئیں، اور یہ قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے، اس لیے ۱۳ دن مدت علالت صحیح ہے، علالت کے پانچ دن آپ نے دوسری ازواج کے حجروں میں بسر فرمائے، اس حساب سے علالت کا آغاز چہارشنبہ سے ہوتا ہے۔

تاریخ وفات کی تعیین میں راویوں کا اختلاف ہے، کتب حدیث کا تمام دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی کوئی روایت محکوا حادیث میں نہیں ملسکی ارباب سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں یکم ربیع الاول دوم ربیع الاول، اور ۱۲ ربیع الاول، ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے لیے اصول روایت و درایت دونوں سے کام لیا ہے، روایۃ دوم ربیع الاول کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ابو مخنف کے واسطہ سے مروی ہے، (طبری صفحہ ۱۸۱۵) اس روایت کو گو اکثر قدیم مورخوں نے (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ نے) قبول کیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغگو اور غیر معتبر ہیں، یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد و طبری نے نقل کی ہے (جز وفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جسکو اُسنے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے البتہ بیہقی نے دلائل میں بسند صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے، (نور النبراس ابن سید الناس وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے، اور مشہور محدث امام لیث مصری سے مروی ہے (فتح الباری وفات) امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے (جلد دوم وفات) اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے درایۃ اس نکتہ کو دریافت کیا کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے، کیونکہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں، روز وفات دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ) اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا (صحاح قصۂ حجۃ الوداع صحیح بخاری تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم) ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک حساب لگاؤ، ذی الحجہ، محرم، صفر، ان تینوں مہینوں کو خواہ ۲۹، ۲۹ تو خواہ ۳۰، ۳۰، خواہ بعض ۲۹ بعض ۳۰ کسی حالت اور کسی شکل سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن نہیں پڑسکتا، اس لیے درایۃً بھی یہ تاریخ قطعاً غلط ہے دوم ربیع الاول کو حساب سے اسوقت دوشنبہ پڑسکتا ہے، جب تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں،

جب دو پہلی صورتیں صحیح نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ گئی جو کثیر الوقوع ہے، یعنی یہ کہ دو مہینے ۲۹ کے اور ایک مہینہ ۳۰ کا لیا جائے، اس حالت میں یکم ربیع الاول کو دوشنبہ کا روز واقع ہوگا اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے

دل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ اگر ۹ ذی الحجہ کو جمعہ ہو تو اوائل ربیع الاول میں اس حساب سے دوشنبہ کس کس دن واقع ہوسکتا ہے

نمبر شمار	صورت مفروضہ	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
۱	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ کے ہوں	۶	۱۳	
۲	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۲۹ کے ہوں	۲	۹	۱۶
۳	ذی الحجہ ۲۹، محرم ۲۹، اور صفر ۳۰ کا ہو	۱	۸	۱۵
۴	ذی الحجہ ۳۰، محرم ۲۹ اور صفر ۲۹ کا ہو	۱	۸	۱۵
۵	ذی الحجہ ۲۹، محرم ۳۰، اور صفر ۲۹ کا ہو	۱	۸	۱۵
۶	ذی الحجہ ۳۰، محرم ۲۹، اور صفر ۳۰ کا ہو	۷	۱۴	

لہ ابن سعد جلد ثانی [illegible]

ہوئی تو ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہ کے گھر قیام فرمائیں، خلق عظیم کی بنا پر اجازت بھی صاف اور علانیہ نہیں طلب کی بلکہ پوچھا کہ کل میں کس کے گھر رہونگا، دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہ کے یہاں قیام فرمانے کا تھا، ازواجِ مطہرات نے مرضیٔ اقدس سمجھکر عرض کی کہ آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں[۱]، ضعف اس قدر ہو گیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا، حضرت علی اور حضرت عباس دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہ کے حجرے میں لائے،

(آمد و رفت کی قوت جب تک رہی آپ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ نے پڑھائی وہ مغرب کی نماز تھی، سر میں درد تھا، اس لیے سر میں رومال باندھکر آپ تشریف لائے، اور نماز ادا کی جس میں سورۂ وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا قرأت فرمائی[۲]، عشا[۳] کی نماز کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضور کا انتظار ہے، لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، پھر اُٹھنا چاہا کہ غش آگیا، افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی، لوگوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۷	ذی الحجہ ۳، محرم ۳، اور صفر ۲۹ کا ہو	۷	۱۴
۸	ذی الحجہ ۲۹ کا اور محرم و صفر ۳ کے ہوں	۷	۱۴

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶، ۷، ۸، ۱۳، ۹، ۱۴، ۱۵، خارج از بحث ہیں کہ علاوہ اور وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں، رہ گئیں یکم اور دوم تاریخیں، دوم تاریخ صرف ایک صورت میں پڑ سکتی ہے جو خلاف اصول ہے، یکم تاریخ تین صورتوں میں واقع ہو سکتی ہے اور تینوں کثیر الوقوع ہیں اور روایات بھی اکی تائید میں ہیں اس لئے وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول سلہ ہجری ہے اس حساب میں مطلع پر ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے جس پر اسلامی قمری مہینوں کی بنیاد ہے، اصول فلکی سے ممکن ہے کہ اسپر خدشات وارد ہو سکتے ہوں،

کتب تفسیر میں تحت آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کے یوم نزول (۹ ذی الحجہ سلہ) سے روز وفات تک ۸۱ دن ہیں، (دیکھو ابن جریر، ابن کثیر و بغوی وغیرہ) ہمارے حساب سے ۹ ذی الحجہ سلہ سے لیکر یکم ربیع الاول تک دو ۲۹، اور ایک مہینہ ۳۰ لیکر جو ہماری مفروضہ صورت ہے پورے ۸۱ دن ہوتے ہیں، ابو نعیم نے بھی دلائل میں بسند یکم ربیع الاول تاریخ وفات نقل کی ہے صفحہ ۱۴۶-س)

[۱] صحیح بخاری ذکر وفات، ابن سعد نے بروایت صحیح نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کی طرف سے حضرت فاطمہ زہرا نے اجازت طلب کی تھی،

[۲] حدیث بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی باب القراءۃ میں مذکور ہے، آئندہ حضرت عائشہ کی روایت آئے گی جس میں مذکور ہوگا کہ آخری نماز مسجد میں ظہر کی آپ نے پڑھائی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں میں اسطرح تطبیق دی ہے کہ مغرب کا واقعہ اندرون حجرۂ نبوی کا واقعہ ہے جیسا کہ نسائی میں ہے (جلد ۲ ص ۱۴۵) لیکن آگے چلکر حافظ موصوف کی نظر ترمذی کی روایت پر پڑی جس میں مذکور ہے کہ "آنحضرت صلعم نے باہر نکل کر نماز پڑھائی"، اسکی تاویل انکو یہ کرنی پڑی کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ خواب گاہ سے باہر آکر، (جلد ۲، صفحہ ۴۲) لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں، کہ اولاً تو حجرۂ نبوی میں اتنی جگہ بھی کہ کوئی بڑی جماعت ہو سکے، دوسرے یہ کہ خوابگاہ کے علاوہ حجرۂ نبوی میں اور جگہ کہاں تھی، علاوہ ازیں احادیث میں صَلّٰی بِنَا کے یہی معنی ہر جگہ آئے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے امام بنکر نماز پڑھائی، گھر کی نماز پر یہ لفظ صادق نہیں آتا، اس لیے صحیح یہ ہے کہ یہ نماز مسجد نبوی میں پڑھی گئی جیسا کہ عام روایات کا اشارہ ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

پھر وہی پہلا جواب دیا، آپ نے پھر غسل فرمایا، اور پھر جب اُٹھنا چاہا تو غش آ گیا، افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا، اور لوگوں نے وہی جواب دیا، تیسری دفعہ جسم مبارک پر پانی ڈالا، پھر جب اُٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہو گئی، جب افاقہ ہوا تو ارشاد ہوا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں (حضرت عائشہؓ نے معذرت کی کہ یا رسول اللہ، ابوبکر نہایت رقیق القلب ہیں، آپ کی جگہ اُن سے کھڑا نہ ہوا جائے گا، آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں چنانچہ) کئی دن[1] تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی،

وفات سے چار دن پہلے (جمعرات کو) آپ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے، بعض صحابہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ "رسول اللہ صلعم کو مرض کی شدت ہے (غلبہ الوجع) اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے"، اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا، بعض کہتے تھے کہ تعمیل ارشاد کی جائے، بعض کچھ اور کہتے تھے، اختلاف اور شور و غل زیادہ ہوا تو بعض نے کہا "أهجر استفهموه"، خود آپ سے دریافت کر لو، لوگ جب پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا "مجھے چھوڑ دو، میں جس مقام میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو[2]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آخری نماز مغرب تھی، بظاہر اسکی تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی مسلسل امامت کا انقطاع مغرب کے نماز مذکورہ پر ہوا جیسا کہ آگے عشا کی نماز کے ذکر میں آئے گا، ظہر کی نماز جو آنحضرت صلعم نے مسجد میں آ کر ادا فرمائی وہ اتفاقی تھی، اصل میں امام پہلے سے حضرت ابوبکر تھے، آنحضرت صلعم آکر بعد کو شریک ہو گئے تھے، یہ نماز مسجد میں آپ کی آخری نماز تھی بعض صحابہ سے یہ مذکور ہے کہ آخری نماز صبح تھی، یہ درحقیقت ان کا اپنا واقعہ ہے یعنی اُنکو آخری بار یہی موقع ملا، س) (۳؎ صحیح بخاری اور مسلم میں روایت حضرت عائشہ سے مختص ہے دیکھو کتاب الصلوۃ اور وفات)

(۱؎ کسی صحیح روایت میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی زندگی میں کتنے دن تک نماز پڑھائی، ابن سعد نے واقدی سے دو روایتیں نقل کی ہیں ایک یہ ہے کہ ۱۷ وقتوں کی نماز پڑھائی، دوسری یہ کہ تین دن تک امامت کی، اس جمعہ کی عشاء سے دوشنبہ کی صبح تک جس دن آپ نے وفات فرمائی، حساب لگایا جائے تو ۱۷ نمازیں ہوتی ہیں، اور جمعہ، سنیچر، اور اتوار تین دن ہوتے ہیں لیکن اصولاً یہ دونوں روایتیں نہایت کمزور ہیں) ۲؎ یہ روایت صحیح بخاری موقع وفات کی ہے، صحیح بخاری میں یہ حدیث مختلف ابواب میں مذکور ہے اور ہر جگہ الفاظ میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے، (صحیح مسلم کتاب الوصیہ میں یہ روایتیں لکھی ہیں) جن صحابی نے قلم دوات لانے میں گفتگو کی، بخاری میں انکا نام نہیں، لیکن حدیث کی اور کتابوں میں (مثلاً صحیح مسلم) تصریح حضرت عمر کا نام ہے، صحیح مسلم میں (اسکے) یہ الفاظ ہیں

قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب اللہ، — آپ کو مرض کی شدت ہے، ہمارے پاس قرآن موجود ہے خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے،

(صحیح مسلم کی دوسری روایتوں کے یہ الفاظ ہیں)

۱ فقالوا ان رسول اللہ صلعم یهجر، — تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم بے حواسی (ہجر) کی باتیں کرتے ہیں

۲ (فقالوا اهجر استفهموه) — (تو لوگوں نے کہا کیا آپ بے حواسی کی باتیں کرتے ہیں؟ آپ سے خود پوچھ لو)

(اس کے بعد آپ نے تین) وصیتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے، دوسری یہ کہ سفرا کا اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح آپ کے زمانہ میں دستور تھا، تیسری وصیت راوی کو یاد نہیں رہی[1]،

(اسی دن[2] ظہر کی نماز کے وقت آپ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی) آپ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں، غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے، جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، آہٹ پا کر حضرت ابوبکر پیچھے ہٹے، آپ نے اشارہ سے روکا، اور اُن کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی، یعنی آپ کو دیکھ کر حضرت ابوبکر اور حضرت ابوبکر کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے،

(نماز کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک خطبہ دیا، جو آپ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا، آپ نے فرمایا

"خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت میں) جو کچھ ہے اسکو قبول کرے، لیکن اُس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں" یہ سن کر حضرت ابوبکر رو پڑے، لوگوں نے اُنکی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں، یہ رونے کی کون سی بات ہے لیکن راز دار نبوت سمجھ چکا تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس بنا پر یہ روایت شیعہ و سنی کا بڑا معرکہ آرا میدان بن گئی ہے شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم حضرت علی کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، سنی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کو واقعی تکلیف تھی اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہا خود قرآن مجید میں آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ نازل ہو چکی تھی اس لیے حضرت عمر نے آپکو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرت صلعم کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے، اس واقعہ کے بعد چار دن تک آپ زندہ رہے، اس وقت بھی بعد کو لکھوا دیا ہوتا، (اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے تھے، بخاری میں ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی بکر کو بلا کر حضرت ابوبکر کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ خود خدا اور اہل اسلام ابوبکر کے سوا کسی اور کو پسند نہ کریں گے" اس اختلاف کے بعد آپ نے لوگوں کو زبانی تین وصیتیں فرمائیں، جو ضروری بات آپ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے ممکن ہے کہ وہ یہی ہوں، یا اگر وہ ان کے علاوہ تھی تو آپ اسکو ان عام وصیتوں کے ساتھ زبانی بھی فرما سکتے تھے، اس کے بعد مجمع عام میں جو خطبہ دیا اس میں اسکا اظہار فرما سکتے تھے س)

مجھکو احتیاط کرنی چاہیے کہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے نکل کر علم کلام کے دائرہ میں نہ آجائے، تاہم جو سرسری سی بحث ہے میں الفاروق میں لکھ چکا ہوں،

[1] صحیح بخاری ذکر وفات، (و صحیح مسلم کتاب الوصیہ) [2] ان روایتوں میں بالتصریح یہ مذکور نہیں ہے کہ یہ کس دن کے ظہر کا واقعہ ہے لیکن صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں حضرت جندب کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر کی شان میں جو الفاظ آپ نے فرمائے تھے جنکا بیان آگے آتا ہے، وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے،" اور چونکہ مرض الموت کا خطبہ اسی نماز ظہر کے بعد آپ نے دیا تھا جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ کی روایت ہے اس لیے یہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کا واقعہ تھا، حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی فیصلہ کیا ہے (س)

کہ وہ بندہ خود محمدؐ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہیں، آپ نے اپنی تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا، اور فرمایا "سب سے زیادہ میں جسکی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں، وہ **ابوبکرؓ** ہیں، اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے، مسجد کے رُخ کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے، ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادتگاہ بنالیا ہے، دیکھو تم ایسا نہ کرنا میں منع کرتا ہوں[1]"

زمانۂ علالت میں انصار آپ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کرکے روتے تھے، ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گذر ہوا، انھوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی انھوں نے بیان کیا کہ "حضور کی صحبتیں یاد آتی ہیں" ان میں سے ایک صاحب نے جاکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ واقعہ بیان کیا، آج اسکی تلافی کا موقع تھا، اس لیے اس کے بعد آپ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کرکے فرمایا "یاأیها الناس انصار کے معاملہ میں تمکو وصیت کرتا ہوں، عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اسطرح کم ہوکر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک، وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کرچکے، اب تمھیں اُن کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے (جسم میں بمنزلہ) معدہ کے ہیں، جو تمہارے نفع ونقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اُس کو چاہیے کہ ان میں جو نکوکار ہوں ان کو قبول کرے، اور جن سے خطا ہوئی ہو اُن کو معاف کرے[2]"

اُوپر گذر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تجویز کیا تھا اسکی سرداری اسامہ بن زید کو تفویض فرمائی تھی، اسپر بعض لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے ہوئے نوجوانوں کو یہ منصب کیوں عطا ہوا، آنحضرت صلعم نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا

"اگر اسامہ کی سرداری پر تمکو اعتراض ہے تو اس کے باپ (زید) کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا، اور مجھے وہ سب سے زیادہ محبوب تھا، اور اب اُس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے[3]"

---

(1) صحیح بخاری ومسلم مناقب ابی بکرؓ اخیر ٹکڑہ صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علے القبور میں ہے (2) صحیح بخاری مناقب انصار (3) صحیح بخاری بعث اسامہ ومناقب زید بن حارثہ)

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام، شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے، پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک اور کفر تک منجر ہو چکی تھی، اور اسکے نتائج پیش نظر تھے اس لیے ارشاد فرمایا

' حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے، میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے، اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے"

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اُس کے ذاتی عمل پر ہے، آپ نے فرمایا:

" اے پیغمبرِ خدا کی بیٹی فاطمہؓ اور اے پیغمبرِ خدا کی پھوپھی صفیہؓ خدا کے ہاں کے لیے کچھ کر لو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا"[1]

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ حجرۂ عائشہؓ میں واپس تشریف لائے)

آپ کو حضرت **فاطمہ** زہراؓ سے شدید محبت تھی (اثنائے علالت میں) انکو بلا بھیجا، تشریف لائیں تو اُن سے کچھ کان میں باتیں کیں، وہ رونے لگیں، پھر بلا کر کچھ کان میں کہا، تو ہنس پڑیں، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا "پہلی دفعہ آپ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا، جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تمہیں مجھ سے آکر ملو گی، تو ہنسنے لگی"[2]

یہود و نصاریٰ نے انبیأ کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط کی تھی، وہ بت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی اسلام کا فرض اولین بت پرستی کی رگ و ریشہ کا استیصال کرنا تھا، اس لیے حالت مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپکے پیش نظر تھی یہی تھی، اتفاق سے بعض ازواج مطہرات نے جو حبشہ ہو آئی تھیں، اسی حالت میں وہاں کے عیسائی معبدوں[3] کا اور اسکے

(1) یہ اور اس کے اوپر کی حدیث مسند امام شافعی باب استقبال القبلہ کتاب الام امام شافعی اور ابن سعد جز الوفات میں بسند حسن مروی ہے، لیکن ان روایتوں میں مذکور ہے کہ صبح کی نماز کے بعد آپ نے یہ فرمایا، لیکن بخاری کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز میں شرکت فرمائی تھی اور اسکے بعد خطبہ دیا تھا، دوسری غلطی مسند اور ابن سعد کی روایتوں میں یہ ہے کہ وہ دوشنبہ کی صبح یعنی روز وفات کا واقعہ اسکو بیان کرتے ہیں حالانکہ روایات صحیحہ ثابت ہے کہ دوشنبہ کی صبح کو آپ نے صرف پردہ اُٹھا کر جھانکا تھا، نہ باہر تشریف لائے اور نہ نماز میں شرکت فرمائی (س)

(2) صحیح بخاری ذکر وفات، (3) کوئی رومن کیتھولک گرجا ہوگا جس میں حضرت عیسٰیؑ حضرت مریم اور ولیوں اور شہیدوں کے مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں)

مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی[1] مرجاتا ہے تو اس کے مقبرہ کو عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، اور اس کا بت بنا کر اس میں کھڑا کرتے ہیں، قیامت کے روز اللہ عزّ وجل کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق[2] ہوں گے،) غش کرب کی شدت میں جب کہ چادر کبھی منھ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر الٹ دیتے تھے، حضرت عائشہؓ نے زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سنے،

لعنۃ اللہ علی الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائہم مساجد[3] — یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

(اسی کرب اور بے چینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا کہ عائشہ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمد خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ ان کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو[4]،)

(وفات سے ایک دن[5] پہلے اتوار کو) لوگوں نے دوا پلانی چاہی چونکہ گوارا نہ تھی آپ نے انکار فرمایا، اسی حالت میں غشی طاری ہو گئی، لوگوں نے منھ کھول کر پلا دی، افاقہ کے بعد آپ کو احساس ہوا، تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے، معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی تھی، ان میں حضرت عباسؓ شامل نہ تھے، اس لیے وہ اس حکم سے[6] مستثنیٰ رہے، محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضا تھا یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے آپ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا، لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنک مزاجی نہیں، بلکہ لطف طبع تھا،

مرض میں اشتداد اور تخفیف ہوتی رہتی تھی جس دن وفات ہوئی (یعنی دوشنبہ کے روز) بظاہر طبیعت کو سکون تھا، حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا، آپ نے (صبح کے وقت) پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ (فجر کی) نماز میں مشغول تھے دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے آہٹ پا کر خیال کیا کہ آپ باہر آنا چاہتے ہیں، فرطِ مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہو گئے، اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں (حضرت ابوبکرؓ نے جو امام تھے چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں) آپ نے اشارہ سے روکا اور حجرۂ شریف

---

[1] جن کو عیسائی سینٹ کہتے ہیں، [2] صحیح بخاری وصحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور، [3] صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم باب مذکور بالا، [4] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۹ و ابن سعد جزء ۲ الوفات بروایات متعددہ [5] ابن سعد وفات،
[6] صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم (اللدادی باللدود)

میں داخل ہوکر پردے ڈال دیئے[1]، (صحیح مسلم میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے[2]، یہ سب سے آخری موقع تھا، کہ صحابہ نے جمالِ اقدس کی زیارت کی، حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ آپ کا چہرہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے[3]، یعنی سپید ہوگیا تھا،)

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا، آپؐ بار بار غشی طاری ہوتی تھی، اور پھر افاقہ ہوجاتا تھا، حضرت فاطمہ زہراؓ یہ دیکھکر بولیں، واکرب اباہ، ہائے میرے باپ کی بےچینی! آپ نے فرمایا "تمہارا باپ آج کے بعد بےچین نہ ہوگا،" حضرت عائشہ فرماتی ہیں آپ جب تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبروں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خواہ موت کو قبول کریں، یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں، اس حالت میں اکثر آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے،

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ — اُن لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا،

اور کبھی یہ فرماتے:

اللّٰھم فی الرفیق الاعلیٰ — خداوندا! بڑے رفیق میں،

وہ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقتِ الٰہی مطلوب ہے،)

وفات سے ذرا پہلے، حضرت ابوبکر کے صاحبزادے عبدالرحمٰن، خدمتِ اقدس میں آئے، آپ حضرت عائشہ کے سینہ پر ٹیک کر لیٹے تھے، عبدالرحمان کے ہاتھ میں مسواک تھی، مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، عبدالرحمان سے مسواک لیکر دانتوں سے نرم کی اور خدمتِ اقدس میں پیش کی، آپ نے بالکل تندرستوں کی طرح

1. صحیح بخاری ذکرِ وفات وکتب صحاح کتاب الصلوٰۃ، (2) صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ صفحہ ۱۶۷)
(3) صحیح مسلم باب الصلوٰۃ، حضرت انس بن مالک کی روایت میں جو صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ صفحہ ۱۶۷) میں ہے، بیان ہے کہ تین دن کے بعد آپ اسوقت صبح کی نماز کے وقت برآمد ہوئے تھے، لیکن جماعت میں شریک نہ ہوسکے، اور واپس گئے امام شافعی نے کتاب الام میں اور ابن سعد نے جزء الوفات میں ابن ابی سبرہ سے روایت کی ہے کہ آپ اس نماز میں شریک جماعت ہوئے لیکن یہ درحقیقت راوی کا سہو ہے صحیح بخاری ومسلم وغیرہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ آپ شریکِ جماعت نہ ہوسکے، اور واپس گئے، راوی کو گذشتہ نمازِ ظہر کی شرکت کا التباس ہوا تین دن کے بعد سے مراد جمعرات کے روز جس دن آپ نے خطبہ دیا تھا، اس کے بعد سے، جمعہ، سنیچر اور اتوار کے دن ہیں۔)

مسواک کی (اب وفات کا وقت قریب آرہا تھا[1] دوپہر تھی) سینہ میں سانس کی گھرگھراہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لب مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سنے[2]،

اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (نماز، اور غلام)

پاس پانی کی لگن تھی، اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر ملتے، (چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے اتنے میں) ہاتھ اٹھا کر (انگلی سے اشارہ کیا اور تین دفعہ) فرمایا،

بَلِ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی، اب اور کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے،

یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے، آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں[3]، اور روح پاک عالم قدس میں پہنچ گئی،

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ صَلٰوۃً کَثِیْرًا کَثِیْرًا

تجہیز و تکفین

(تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول کو شروع ہوا، اس تاخیر کے متعدد اسباب تھے،

(۱) عقیدت مندوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ حضور نے اس دنیا کو الوداع کہا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وفات پائی، اس کا سر اڑا دوں گا، لیکن جب حضرت **ابوبکرؓ** آئے، اور انھوں نے تمام صحابہ کے سامنے خطبہ دیا کہ حضور کا اس جہاں سے تشریف لے جانا یقینی تھا، اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا،

(۲) اس کے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین سے فراغت ہو سکے،

(۳) **قبر کنی** کا کام غسل و کفن کے بعد شروع ہوا، اس لیے دیر تک انتظار کرنا پڑا،

(۴) جس حجرہ میں آپ نے وفات پائی تھی، وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے اور نماز جنازہ

---

[1] ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ وفات دوپہر کو ہوئی، لیکن حضرت انس بن مالک سے بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آخر یوم یعنی دوشنبہ کے آخر وقت وفات فرمائی، حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اسی طرح تطبیق دی ہے کہ دوپہر ڈھل چکی تھی، اور سہ پہر کا وقت تھا،)

[2] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۴۳ مصر، سنن ابن ماجہ کتاب الوصایا اور ابن سعد جزء الوفات بسند صحیح)

[3] یہ تمام واقعات صحیح بخاری ذکر وفات کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں،

ادا کرتے تھے، اسلیے بھی بڑی دیر لگی، اور سہ شنبہ کا دن گذر کر رات کو فراغت ملی[1]،

تجہیز و تکفین کی خدمت خاص اعزہ و اقارب نے انجام دی فضل بن عباس اور اسامہ بن زید نے پردہ کیا، اور حضرت علی نے غسل دیا، حضرت عباس بھی موقع پر موجود تھے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہی نے پردہ بھی کیا تھا، چونکہ اس شرف میں ہر شخص شریک ہونا چاہتا تھا، اس لیے حضرت علی نے اندر سے کواڑ بند کر لیے تھے، انصار نے دروازہ پر آواز دی کہ خدا کے لیے ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھیے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت گذاری میں ہمارا بھی حصہ ہے، حضرت ابو بکرؓ نے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے فرمایا کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) میں کسی کا حق نہیں ہے اس لیے اگر سب کو اجازت دیدی گئی تو کام رہ جائیگا، لیکن (انصار کے اصرار پر) حضرت علی نے اوس بن خولی انصاری کو جو اصحاب بدر میں تھے اندر بلالیا وہ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے، حضرت علی نے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، حضرت عباس اور اُنکے دونوں صاحبزادے قثم اور فضل جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے، اور اسامہ بن زید اوپر سے پانی ڈالتے تھے[2]،

کفن کے لیے پہلے جو کپڑا انتخاب کیا گیا تھا وہ حضرت ابو بکر کے صاحبزادے عبد اللہ کی یمن کی سی ہوئی ایک چادر تھی، لیکن بعد کو اُتار لی گئی[3]، اور تین سوتی سفید کپڑے جو سحول کے بُنے ہوئے تھے کفن میں دیے گئے، ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا[4]،

غسل و کفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے، حضرت ابو بکرؓ نے کہا، نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے وہیں دفن بھی ہوتا ہے، چنانچہ نعش مبارک اُٹھا کر، اور بستر اُلٹ کر، حجرۂ عائشہ میں اسی مقام پر قبر کھودنا تجویز ہوا[5]، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپکو کسی میدان میں اس لیے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدت سے

---

[1] ابن سعد وغیرہ کی بعض روایتوں میں ہے کہ چہارشنبہ کو تدفین ہوئی، لیکن یہ تمام ترکذب اور جھوٹ ہے، خود ابن سعد میں صحیح روایتیں یہ ہیں کہ سہ شنبہ کو تدفین ہوئی، البتہ چہارشنبہ کی شام شروع ہوگئی تھی، ابن ماجہ کی روایت ہے (کتاب الجنائز) فلما فرغوا من جہازہ یوم الثلثاء [illegible] سہ شنبہ کے دن تجہیز و تکفین سے فرصت ہوئی "،

[2] طبقات ابن سعد صفحہ ۶۲ و ۶۳ جزء الوفات طبری (مختصراً) ابو داؤد کتاب الجنائز میں بھی ان صاحبوں کے نام ہیں نیز ابن ماجہ کتاب الجنائز)

[3] (صحیح مسلم صفحہ ۱۲ کتاب الجنائز) [4] صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد کتاب الجنائز،

[5] ابن سعد جزء الوفات صفحہ (و ابن ماجہ کتاب الجنائز ذکر وفات نبوی)

میری قبر کو بھی عبادت گاہ نہ بنالیں، میدان میں اس کی دار وگیر مشکل تھی[1] اس لیے حجرہ کے اندر دفن کیا گیا)

مدینہ میں دو صاحب قبر کھودنے میں ماہر تھے، حضرت ابو عبیدہ جراح اور ابو طلحہ (حضرت ابو عبیدہ اہل مکہ کے دستور کے مطابق بغلی قبر کھودتے تھے، اور ابو طلحہ مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی، لوگوں میں اختلاف پیش آیا، کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے، حضرت عمرؓ نے کہا اختلاف مناسب نہیں، دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجا جائے[2]، جو پہلے آجائے، لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا، چنانچہ) حضرت عباسؓ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے، اتفاق یہ کہ حضرت ابو عبیدہ گھر پر موجود نہ تھے ابو طلحہ آئے، اور انہی نے مدینہ کے رواج کے موافق قبر کھودی جو لحدی تھی یعنی بغلی نہ تھی، زمین چونکہ نم تھی اس لیے جس بستر پر آپ نے وفات پائی تھی وہ قبر میں بچھا دیا گیا،

جنازہ طیار ہو گیا تو لوگ نماز کے لیے ٹوٹے، (جنازہ حجرہ کے اندر تھا، باری باری سے لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے تھے) پہلے مردوں نے پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے نماز پڑھی لیکن کوئی امام نہ تھا[3]،

جسم مبارک کو حضرت علی، فضل بن عباس (اسامہ بن زید اور حضرت عبدالرحمان بن عوف) نے قبر میں اتارا[4]،

---

(1) صحیح بخاری کتاب الجنائز و باب الوفات (2) ابن ماجہ کتاب الجنائز (3) ابن سعد روایت صحیحہ جز الوفات،

(4) ابو داؤد کتاب الجنائز ابن ماجہ اور ابن سعد میں اسامہ بن زید اور حضرت عبدالرحمان بن عوف کے بجائے قثم بن عباس اور شقران (غلام خاص) کے نام ہیں، ارباب نظر جانتے ہیں کہ ان دو روایتوں میں کس کو ترجیح ہو سکتی ہے)

متروکات

(آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟

اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے، جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے اور اگر کچھ تھا بھی تو اُس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے،

لا نورث ما ترکنا صدقة[1]،	ہم (انبیا) کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ میرے وارث اشرفی بانٹ کر نہیں پائیں گے یعنی نہ ہوگی نہ پائیں گے، چنانچہ یاد ہوگا کہ وفات کے وقت چند دینار حضرت عایشہ کے پاس امانت تھے، آپ نے اسی وقت نکلوا کر خیرات کرا دیئے۔

عمرو بن حارث سے جو اُم المومنین جویریہؓ کے بھائی تھے بخاری میں روایت ہے،

ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم عند موته	آنحضرت صلعم نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا، نہ درہم، نہ دینار، نہ غلام
درهما ولا دينارا ولا عبدا ولا امة ولا شيئا	نہ لونڈی اور نہ اور کچھ، صرف ایک سفید خچر، اور ہتیار، اور کچھ زمین
الا بغلته البيضاء وسلاحه وارضا جعلها صدقة[2]	جو عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے،

ابوداؤد میں حضرت عایشہ کی روایت ہے،

ما ترك رسول الله صلعم دينارا ولا درهما ولا بعيرا ولا شاة	آنحضرت صلعم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم نہ اُونٹ نہ بکری،

بہرحال متروکات میں اگر تھیں تو یہی تین چیزیں تھیں، کچھ زمین، سواری کے جانور، اور ہتیار)

زمین (حضرت عمرو بن حارث نے جس زمین کا ذکر کیا ہے، وہ مدینہ، خیبر، اور فدک کے چند باغ تھے، مدینہ کی جائداد سے بنو نضیر کی جائداد مراد ہے، یا مخیریق، نام ایک یہودی نے ۳ھ میں (غزوۂ احد کے موقع پر) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

[1] یہ فقرہ تمام حدیث کی کتابوں میں ہے بخاری میں متعدد مقامات میں ہے، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض، باب فرض الخمس [2] صحیح بخاری کتاب الوصایا،

کو چند باغ وصیتہً ہبہ کئے تھے، وہ مراد ہیں لیکن صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ باغ اسی وقت مستحقین کو تقسیم کردیے[1] تھے،

فدک اور خیبر کی نسبت ابتدا ہی سے شیعہ اور اہل سنت میں اختلاف ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی جائداد تھی اور وراثت کے طور پر اہلبیت میں تقسیم ہونی چاہیے تھی، اہلسنت کہتے ہیں کہ یہ بطور ولایت اسلامی آپ کے قبضہ میں تھی اور ذاتی ہو بھی تو آپ نے خود فرما دیا تھا، کہ "ہمارا جو ترکہ ہو وہ صدقہ ہے"

اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف خود صحابہ کے وقت میں پیدا ہوچکا تھا، حضرت عباسؓ (آپ کے چچا) حضرت فاطمہؓ (صاحبزادی) اور اکثر ازواج مطہرات[2] مدعی تھیں کہ اس جائداد کو بطور وراثت تقسیم ہونا چاہیے، حضرت ابوبکرؓ عمرؓ اور دیگر اکابر صحابہ نے کہا کہ یہ وقف عام ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) خود اپنی زندگی میں جسطرح اور جن مصارف میں اس کی آمدنی صرف کرتے تھے، اس میں تغیر[3] نہ ہوگا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے زمانۂ حیات میں ان تینوں جائدادوں کی آمدنی مختلف مدوں میں متعین کردی تھی، بنو نضیر کی جائداد کی آمدنی ناگہانی ضروریات کے لیے مخصوص تھی، **فدک** کی آمدنی مسافروں کے لیے وقف تھی، خیبر کی آمدنی کو آپ تین حصوں میں منقسم فرماتے تھے، دو حصے عام مسلمانوں کے لیے تھے، اور ایک حصہ ازواج مطہرات کو سالانہ مصارف کے لیے ملتا تھا، اس میں سے بھی جو بچ جاتا وہ غریب مہاجرین کی اعانت میں کام[4] آتا، آخر میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے اصرار پر مدینہ کی جائداد ان دونوں کی تولیت میں دیدی تھی؛ لیکن حضرت علیؓ نے اس پر قبضہ کرلیا تھا، خیبر اور فدک بدستور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک خلفاء کے ہاتھ میں رہے[5])

جانور

ارباب سیر نے آپ کے اسپ خاصہ اور مویشی اور دواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے، جس سے ایک والی ملک کے اصطبل اور دواب خانہ کا دھوکا ہوتا ہے

(1) بخاری باب فرض الخمس میں ہے وصدقتہ بالمدینہ یہ انہیں باغوں کے متعلق ہے تفصیل کے لیے فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۴۴ دیکھو نیز صحیح بخاری میں کتاب المغازی ذکر نضیر، (2) صحیح بخاری کتاب الفرائض)

(3) یہ مکالمہ بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے دیکھو کتاب الفرائض، (4) سنن ابی داؤد، باب صفایا رسول اللہ صلعم،

(5) حوالہ مذکورہ، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باغ فدک سادات کو دیدیا تھا)

طبری نے ان تمام جانوروں کے نام اور حالات تفصیل سے لکھے ہیں، اور اگر وہ قابل اعتبار ہوتے تو حقیقت میں نہایت دلچسپ تھے، لیکن اس کے متعلق طبری کی جسقدر روایتیں ہیں، سب بلا استثنا، **واقدی** سے ماخوذ ہیں، پچھلے مصنفین جن میں بڑے بڑے محدثین ہیں مثلاً یعمری، مغلطائی، حافظ عراقی، وغیرہ نے بھی یہ تفصیل لکھی ہے اور چونکہ یہ مصنفین اکثر سلسلہ سند نہیں لکھتے اس لیے اکثر لوگ ان کے مستند ہونے کی بنا پر اس واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں لیکن جب تفتیش کیجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام روایتوں کا سلسلہ سند واقدی سے آگے نہیں بڑھتا،

حضرت عائشہ کی یہ روایت اوپر گذر چکی ہے،

مَا ترکَ رَسُوْلُ اللہ صلعم دینارا ولا درهما، ولا بعیرا ولا شاۃ

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری)

صحیح **بخاری** (باب الجہاد) میں عمرو بن حویرث (ام المومنین جویریہ کے بھائی تھے) سے روایت ہے،

مَا ترکَ النّبیّ صَلّی اللہ عَلَیْہ وَسَلَّمَ الا بغلته البیضاء وسلاحه وارضا ترکها صدقة،

آنحضرت صلعم نے کچھ نہیں چھوڑا بجز اپنے سفید خچر اور ہتھیار اور ایک زمین کے جو وقف عام ہوگئی

ان روایتوں سے معلوم ہوگا کہ سرکار خاصہ میں صرف ایک جانور تھا، ان صحیح اور مسلّم روایات کے ہوتے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسباب اور دواب کی اتنی بڑی فہرست جو **طبری** وغیرہ نے درج کی ہے اور جو ایک تاجدار سلطنت کے شایاں حال ہے کیونکر تسلیم کیجاسکتی ہے،

احادیث صحیحہ کے استقراء سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عمرو بن حویرث کی مختصر فہرست سے زاید چیزیں بھی آپ کے قبضہ میں آئیں لیکن اس سے عمرو کی روایت پر اثر نہیں پڑسکتا کیونکہ عمرو صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ وفات کے وقت یہی سرمایہ تھا، ممکن ہے کہ یہ چیزیں وفات سے پہلے آپ نے حسب عادت ہبہ یا خیرات کردی ہوں، بہرحال (از روے روایات صحیحہ مختلف اوقات میں) حسب ذیل جانور آپ کے دائرہ ملک میں آئے۔

لُحَیف، ایک گھوڑا تھا جو ابی بن عباس کے باغ میں بندھتا تھا، بخاری نے کتاب الجہاد میں اس کا

ذکر کیا ہے،

عُفَیر ایک گدھا تھا، حضرت معاذ کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجکو اسے ساتھ اس پر بٹھایا تھا،

(بخاری کتاب الجہاد)

عَضْباء و قَصواء، نہایت تیز اونٹنی تھی، قصواء بھی اسی کا نام ہے (طبری صفحہ ۱۴۸۰) اس میں ہے کہ اسی کو آپ نے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکر سے خریدا تھا، اور اسی پر سوار ہوکر آپ نے ہجرت فرمائی تھی، اور مدینہ پہنچکر حضرت ابو ایوب کے مکان کے پاس جاکر بیٹھ گئی تھی[۱]، حجۃ الوداع کا خطبہ بھی آپ نے اسی کی پشت پر دیا تھا[۲]) یہ ہر معرکہ میں بازی لیجاتی تھی، ایک دفعہ ایک بدو باہر سے آیا، اسکی سواری میں ایک اونٹ تھا، جو ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا، عضباء کا اس سے مقابلہ ہوا، اور وہ آگے نکل گیا، صحابہ کو ملال ہوا، آپ نے فرمایا یہ خدا کا فرض ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھائے تو اس کو پست کردے، (بخاری باب الجہاد)

تیسہ دلدل جس کا ذکر اکثر روایتوں میں ہے اسی خچر کا نام ہے جسکا ذکر عمرو بن حارث کی روایت میں ہے، چنانچہ بخاری کے شارحین نے تصریح کی ہے، یہ خچر مقوقس مصری نے آپ کو تحفہ میں بھیجا تھا،

صحیح بخاری میں ہے کہ ابن العلماء (رئیس ایلہ) نے بھی آپ کو ایک سفید خچر (غزوۂ تبوک کے موقع پر تحفۃً بھیجا تھا[۳]) غزوۂ حنین میں جس سفید خچر پر آپ سوار تھے، وہ فروہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیہ بھیجا تھا، ارباب سیر نے اس خچر کو دلدل سمجھا ہے لیکن یہ غلط ہے[۴] صحیح مسلم میں اسکی تصریح موجود ہے[۵]

اسلحہ اس زہد و قناعت کے ساتھ جہاد کی ضرورت سے توشہ خانۂ مبارک میں حسب ذیل سامان تھا،

نو عدد تلواریں تھیں جنکے یہ نام ہیں، ماثور، عضب، ذوالفقار، قلعی، بتار، حتف، مخذم، قضیب،

---

(۱) صحیح بخاری ذکر ہجرت، (۲) صحیح مسلم و ابوداؤد ذکر حجۃ الوداع، (۳) کتاب الجہاد باب بغلۃ النبی صلعم، (۴) فتح الباری ذکر غزوۂ حنین جلد ۸ صفحہ ۲۴، (۵) باب غزوۂ حنین)

ماثور، والد ماجد سے میراث میں ملی تھی، **ذوالفقار** بدر میں ہاتھ آئی تھی، تلوار کا قبضہ چاندی کا تھا، فتح مکہ میں جو تلوار آپ کے ہاتھ میں تھی اس کا قبضہ زریں تھا، سات زرہیں تھیں، ذات الفضول، ذات الوشاح، ذات الحواشی، سعدیہ، فضہ، بترا، خرنق، **ذات الفضول** وہی زرہ تھی جو تیس[3] صاع پر ایک یہودی کے ہاں سال بھر کے لیے آپ نے رہن[1] رکھی تھی، زرہیں سب لوہے کی تھیں، اگرچہ عرب میں چمڑے کی زرہیں بھی ہوتی تھیں،

چھ کمانیں تھیں، زوراء، روحاء، صفراء، بیضاء، کتوم، شداد، **کتوم** وہ کمان تھی، جو غزوۂ اُحد میں ٹوٹ گئی تھی اور آپ نے قتادہ کو دیدی تھی، ایک ترکش تھا جسکو کافور کہتے تھے، چمڑے کی ایک پیٹی تھی، جس میں چاندی کے تین حلقے تھے لیکن **ابن تیمیہ** نے لکھا ہے کہ کسی حدیث سے مجھکو یہ نہیں پتہ لگا کہ آپ نے کبھی پیٹی لگائی بھی تھی، ایک ڈھال تھی جس کا نام زلوق تھا، پانچ برچھیاں تھیں، لوہے کا ایک مغفر تھا، جسکا نام موشح تھا، ایک اور مغفر تھا جس کو سبوغ کہتے تھے،

تین جبّے تھے جنکو آپ لڑائی میں پہنتے تھے، کہتے ہیں کہ اُن میں سے ایک دیبائے سبز کا تھا، ایک سیاہ علم تھا، جس کا نام **عقاب** تھا، اور بھی سبز و سپید علم تھے،

آثار متبرکہ | ان متروکات کے علاوہ بعض یادگاریں بھی تھیں جو لوگوں نے تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑی تھیں، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے عقیدتمندوں کو موئے مبارک عطا فرمائے تھے، جو زیادہ تر حضرت ابوطلحہ انصاری کے ہاتھ آئے[2] تھے، حضرت انس بن مالک کے پاس بھی موئے مبارک[3] تھے، ان کے پاس دو جوتیاں اور تھیں، نعلین مبارک اور ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پیالہ، جو چاندی کے تاروں سے جوڑ دیا گیا تھا، **ذوالفقار** جو حضرت علی کے پاس تھی، ان کے بعد اُنکے خاندان میں یادگار رہی، امام حسین کی شہادت کے بعد وہ حضرت علی بن حسین کے ہاتھ آئی، بعض صحابہ نے آکر انکی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ڈر ہے، کہیں یہ یادگار آپ سے چھن نہ جائے، اگر مجھے عنایت ہو تو یہ میری جان کے ساتھ رہے لیکن اُنھوں نے یہ ایثار گوارا نہ کیا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع وکتاب الرہن [2] صحیح مسلم حجۃ الوداع [3] صحیح بخاری کتاب الطہارہ،

حضرت عائشہؓ کے پاس آپ کے وہ کپڑے تھے جن میں آپ نے انتقال فرمایا تھا[1]، استحقاق خلافت کی بنا پر خاتم (مہر) اور عصائے مبارک جن کا احادیث میں ذکر ہے، پہلے حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے حصہ میں آئے، لیکن انہیں کے عہد میں یہ دونوں چیزیں ضائع گئیں، انگوٹھی تو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے ایک کوئیں میں گر گئی اور عصائے مبارک کو جہجاہ غفاری[2] نے توڑ ڈالا،

امام بخاری نے ان آثار مبارکہ کے ذکر کے لیے ایک خاص باب باندھا ہے۔

مسکن مبارک (آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کمسن تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اپنے دادا، اور چچا کے گھروں میں پرورش پائی اور یہیں سن رشد کو پہنچے، پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، یہ تحقیقی طور پر نہیں معلوم کہ اس کے بعد آپ نے اپنے موروثی مکان میں اقامت فرمائی، یا حضرت خدیجہؓ ہی کے گھر رہے، لیکن آپ کے حصہ کا ایک پدری مکان مکہ میں موجود تھا، جس پر عقیل نے جو آنحضرت صلعم کے چچا زاد اور حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے، اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قبضہ کر لیا تھا، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ مکہ تشریف لائے تو لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ کیا اپنے دولتخانہ پر ٹھہریں گے؟ آپ نے فرمایا عقیل نے ہمارے لیے گھر کہاں چھوڑا؟[3]

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد چھ مہینے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر قیام فرما رہے، اس اثنا میں آپ تنہا تھے، اہل و عیال مکہ ہی میں تھے، جب آپ نے مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی تو اسی کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے حجرے تیار فرمائے، اور اس وقت آپ نے آدمی بھیج کر مکہ سے اہل و عیال کو بلوایا، اور ان ہی حجروں میں اتارا[4]،

آخر ایام میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نو بیویاں تھیں اور الگ الگ حجروں میں رہتی تھیں جن میں

---

(۱) ان تمام آثار مذکورہ بالا کا ذکر صحیح بخاری کتاب الخمس میں ہے، (۲) خاتم کا ذکر کتاب الخمس کے علاوہ بخاری کتاب اللباس میں ہے عصائے مبارک کا حال فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۴۸ سے ماخوذ ہے، (۳) بخاری فتح مکہ (۴) ابن سعد،

نہ صحن تھا، نہ دالان تھے، بہ ضرورت کے الگ الگ کمرے تھے، ہر حجرہ کی وسعت عموماً چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی، دیواریں مٹی کی تھیں، جو اس قدر کمزور تھیں کہ ان میں شگاف پڑ گیا تھا، اور اُن سے اندر دھوپ آتی تھی، چھت کھجور کی شاخوں اور پتیوں سے چھائی تھی، بارش سے بچنے کے لیے بال کے کمل لپیٹ دیئے جاتے تھے، بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا، گھر کے دروازوں پر پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا[۱]،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیشہ باری باری سے ایک ایک شب ایک ایک حجرے میں بسر فرماتے تھے، دن کو عموماً اصحاب کی مجلس میں مسجد میں تشریف رکھتے، جو گویا ان حجروں کا صحن یا گھر کی مردانہ نشستگاہ تھی،

ان حجروں کے علاوہ ایک بالاخانہ بھی تھا جس کو احادیث میں "مشربہ" کہا گیا ہے، ۹ھ میں جب آپ نے ایلا کیا تھا اور پھر گھوڑے پر سے گر کے چوٹ کھائی تھی، تو ایک مہینہ اُسی پر اقامت فرمائی تھی[۲]، اس بالاخانہ پر سامان آرائش کیا تھا، ایک چٹائی کا بستر، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، اور ادھر اُدھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں[۳]،

کاشانۂ نبوت گو انوار الٰہی کا مطہر تھا، تاہم اُس میں رات کو چراغ تک نہیں ہوتا تھا[۴]، گھر کی دنیاوی اور ظاہری آرائش بھی پسند خاطر نہ تھی، ایک بار حضرت عائشہ نے دیواروں پر دھاری دار رنگین کپڑے منڈھے تو آپ سخت ناراض ہوئے، اور فرمایا کہ ہم کو اینٹ اور پتھر کو لباس پہنانے کے لیے مال نہیں دیا گیا ہے[۵]،

یہ حُجرہ ہائے مبارک آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کے قبضہ میں رہے، ان میں جب کسی کا انتقال ہو جاتا تو وہ حجرہ اُنکے اعزہ کی ملکیت میں چلا جاتا، جس سے حضرت معاویہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اکثر حجروں کو خرید لیا تھا، حضرت عمر کے عہد تک یہ تمام حجرے اپنے حال پر قائم رہے، حضرت عثمان کے زمانہ میں بعض حُجرے توڑ کر مسجد نبوی میں داخل کر لیے گئے تاہم ولید بن عبد الملک کے زمانہ تک بہت سے حجرے باقی تھے، ۸۸ھ میں جب حضرت عمر

(۱ یہ پوری تفصیل ادب المفرد بخاری باب التطاول فی البنیان وباب البناء میں ہے، ۲ ابوداؤد وباب امامۃ القاعد، ۳ صحیح بخاری صفحہ ۸۶۹ باب ما کان رسول اللہ صلعم یتجوز من اللباس والبسط، ۴ صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۳۷، باب التطوع خلف المرأۃ، ۵ ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۱۹ کتاب اللباس باب فی الصور، ۶ ابن سعد جزء نساء،)

بن عبدالعزیز مدینہ کے والی تھے، تمام حجرے بجز حجرۂ عائشہ کے کہ وہ مدفنِ نبوی ہے، توڑ کر مسجدِ نبوی میں ملا دیے گئے، جس دن یہ حجرے ٹوٹے ہیں، تمام مدینہ میں کہرام مچا ہوا تھا، کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور یادگار مٹ گئی[1]،)

دایہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو ترکہ والد سے ملا تھا اس میں ایک حبشیہ کنیز بھی تھیں جن کا نام ام ایمن تھا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اصلی انا یا دایہ وہی تھیں[2]، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات تک زندہ رہیں، آنحضرت صلعم ہمیشہ اُنکو ماں کہکر پکارتے تھے، اور جب انکو دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ اب یہی میرے خاندان کی یادگار رہ گئی ہیں، جب آپ نے حضرت خدیجہ سے عقد کیا تو انکو آزاد کرکے حضرت زید سے جو آپکے متبنیٰ اور محبوب خاص اور حضرت خدیجہ کے غلام تھے، شادی کردی، اُسامہ اُنہی کے بطن سے ہیں،۔

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے مزاح کا یہ واقعہ جو کتابوں میں منقول ہے کہ ایک عورت نے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) سے ایک اونٹ مانگا، آپنے فرمایا کہ میں اونٹ کا بچہ دونگا، بولی کہ بچہ لیکر کیا کروں گی، آپ نے فرمایا کہ جتنے اونٹ ہیں اونٹ کے بچے ہی ہوتے ہیں، اِن ہی کا واقعہ ہے،

یہ اکثر غزوات میں شریک رہیں، جنگ احد میں پیاسوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، جنگ خیبر میں بھی شریک تھیں[3]،

خدام خاص صحابہ میں سے بعض عقیدت مند ایسے تھے جو دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ہمہ وقت خدمتِ اقدس میں حاضر رہتے، اور خاص خاص کام انجام دیتے، انکے نام حسب ذیل ہیں،

۱ حضرت عبداللہ بن مسعود، مشہور صحابی ہیں، فقہ حنفی کے بانی اول گویا وہی ہیں، امام ابوحنیفہ کی فقہ کا سلسلہ ان ہی کی روایات اور استنباطات پر منتہی ہوتا ہے، مکہ معظمہ میں قرآن مجید کی اشاعت آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ابتدائی زمانہ میں ان ہی نے کی، ستر سورتیں خود آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے سنکر یاد کی تھیں،

---

۱ ابن سعد جزء ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۲ صحیح مسلم باب رد المہاجرین الی الانصار منائحہم، ۳ یہ تمام حالات طبقات ابن سعد جزء ثامن، تذکرۂ ام ایمن سے ماخوذ ہیں

یہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے راز دار بھی تھے، اور جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) سفر میں جاتے تو جوا نگاہ، وضو، اور مسواک کا اہتمام انہی کے متعلق ہوتا، جب آپ مجلس سے اُٹھتے تو جوتیاں پہناتے، راہ میں آگے آگے عصالیکر چلتے، جب آپ کہیں کسی مجلس میں جاکر بیٹھتے، تو نعلین مبارک اُتار کر بغل میں رکھ لیتے، پھر اُٹھنے کے وقت سامنے لاکر رکھ دیتے، خلوت و جلوت میں ساتھ رہتے رہتے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و عادات کا نمونہ بن گئے[۱] تھے،

۲، **حضرت بلالؓ**، دنیا اُن کو مؤذنِ کے لقب سے جانتی ہے، یہ حبشی نژاد غلام تھے مکہ میں ایمان لائے تھے، اور جن جوش و خروش سے ایمان لائے تھے اس کا مختصر ذکر آغاز کتاب میں گزر چکا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے انکو خرید کر آزاد کر دیا تھا، اسوقت سے برابر آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں رہے،، آپکا خانگی انتظام ان ہی کے سپرد تھا، بازار سے سودا سلف لانا، قرض وام لینا، پھر ادا کرنا، مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا، یہ تمام باتیں ان ہی سے متعلق تھیں[۲]،

(۳) حضرت **انس**ؓ بن مالک بھی آپکے خادم خاص تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب **مدینہ** تشریف لائے تو وہ نہایت کمسن تھے، ان کی ماں خدمت اقدس میں انکو لائیں، اور عرض کی "یا رسول اللہ یہ میرا بیٹا ہے، لائی ہوں کہ خدمت گذاری کرے[۳]"،

حضرت انسؓ نے دس برس تک آپکی خدمت کی، لوگوں کے پاس آتا جاتا، چھوٹے چھوٹے کام کرنا، وضو کا پانی لانا، اُن کے فرائض تھے، چونکہ ابھی کمسن تھے، اُن سے کام بن نہیں آتے تھے، لیکن آپ نے اُن سے کبھی باز پرس نہ فرمائی[۴]"

۱؎ یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے (مجملاً صحیح بخاری باب مناقب عبداللہ بن مسعود میں بھی یہ مذکور ہے ۲؎ ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۷۲ باب قبول ہدایا المشرکین، ۳؎ صحیح مسلم فضائل انس ۴؎ ابوداؤد کتاب الادب)

شمائل

شکل ولباس وطعام ومذاق طبیعت

حلیۂ اقدس

حلیۂ اقدس | آپ میانہ قد اور موزوں اندام تھے، رنگ سفید سرخ تھا، پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے، بینیٔ مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا یعنی بہت پرگوشت نہ تھا، دہانہ کشادہ تھا، دندان مبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا، اور سینہ کشادہ تھا، اور فراخ تھا، سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے نہ بالکل سیدھے تھے، ریش مبارک گھنی تھی، چہرہ کھڑا کھڑا تھا، آنکھیں سیاہ و سرمگیں، اور پلکیں بڑی بڑی تھیں، شانے پرگوشت اور مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینۂ مبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے، ہتھیلیاں پرگوشت اور چوڑی کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں باریک اور ہلکی تھیں، پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے، نیچے سے پانی نکل جاتا تھا[1]،

(صحابہ پر آپ کے حسن وخوبروئی کا بہت اثر پڑتا تھا، حضرت عبد اللہ بن سلام جو پہلے یہودی تھے، پہلے پہل جب چہرۂ اقدس پر ان کی نظر پڑی ہی تو بولے "خدا کی قسم یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں"[2]، جابر بن سمرہ ایک صحابی ہیں ان سے کسی نے پوچھا آپ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا، بولے "نہیں ماہ وخورشید کی طرح"[3]، یہی صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک شب کو جب مطلق ابر نہ تھا، اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا تھا کبھی چاند کو دیکھتا تھا، تو آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے[4]، حضرت براء صحابی کہتے ہیں، میں نے کسی جوڑے والے کو سرخ (خط کے) لباس میں آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا[5]،

آپ کے پسینہ میں ایک قسم کی خوشبو تھی[6]، چہرۂ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے تھے[7]، جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ کا رنگ نہایت کھلتا تھا، آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا، میں نے

۱؎ (حلیہ تفصیل شمائل ترمذی و مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۱۱۶ و ۱۱۷ میں اور مختصراً بخاری و مسلم باب صفۃ النبی صلعم میں بھی ہے ۲؎ ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۹۴، ۳؎ مشکوٰۃ باب صفۃ النبی صلعم، بحوالہ مسلم، ۴؎ مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ ترمذی دارمی ۵؎ صحیح مسلم باب مذکو ۶؎ صحیح مسلم باب مذکور، ۷؎ بخاری، واقعۂ افک)

دیبا اور حریر بھی آپ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے، اور مشک و عنبر میں بھی آپکے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی[1]
عام طور سے مشہور ہے کہ آپ کے سایہ نہ تھا لیکن اسکی کوئی سند نہیں ہے،)

مہر نبوت

شانوں کے بیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر خاتم نبوت تھی، یہ بظاہر سُرخ اُبھرا ہوا گوشت سا تھا (صحیح مسلم اور شمائل ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے،

رأیت الخاتم بین کتفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدۃ حمراء مثل بیضة الحمامة،	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا تھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ تھا،

(لیکن ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے پاس چند مسّوں کی مجموعی ترکیب سے ایک مستدیر شکل پیدا ہوگئی تھی، اسی کو مُہر نبوت کہتے تھے[2]، تمام صحیح روایات کی تطبیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں شانوں کے درمیان ایک ذرا اُبھرا ہوا گوشت کا حصہ تھا جس پر تل تھے اور بال اُگے ہوئے تھے،)

موئے مبارک

سر کے بال اکثر شانے تک لٹکے رہتے تھے، فتح مکہ میں لوگوں نے دیکھا تو شانوں پر چار گیسو پڑے تھے، مشرکین عرب بالوں میں مانگ نکالتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) چونکہ کفار کے مقابلہ میں اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، ابتداء میں آپ بھی اہل کتاب کی طرح بال چھوٹے ہوئے رکھتے تھے، پھر مانگ نکالنے لگے، یہ شمائل ترمذی کی روایت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرکین کا وجود نہ رہا تو انکی مشابہت کا احتمال بھی جاتا رہا، اس لیے اخیر اخیر زمانہ میں مانگ نکالنے لگے،

(بالوں میں اکثر تیل ڈالتے تھے اور ایک دن بیچ کنگھی کرتے تھے، ریش مبارک میں گنتی کے چند بال سفید ہو پائے تھے)

رفتار

رفتار بہت تیز تھی، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ڈھلوان زمین میں اُتر رہے ہیں، ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلعم

(1) مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ بخاری و مسلم (2) صحیح مسلم (باب اثبات النبوۃ) مشہور ہے کہ نبوت پر جو خاتم نبوت تھی اس میں گویا قدرتی طور پر کلمۂ طیبہ تحریر تھا، یہ بالکل بے سند بات ہے، احادیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں، محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے بعض روایتیں باطل اور بعض بہت ہی ضعیف ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں لم یثبت منھا شیٔ (زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۱۵۴) البتہ کلمہ اس لئے خاتم میں منقوش تھا جو انگشت مبارک میں خطوط پر مُہر کرنے کی غرض سے آپ پہنا کرتے تھے بعض لوگوں نے غلطی سے اسکو خاتم نبوت کی طرف منسوب کر دیا۔)

سے کے سایہ نہ تھا یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور ناقابل اعتبار ہیں،

گفت گو

گفتگو اور خندہ وتبسم

گفتگو نہایت سبک اور دلآویز تھی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، ایک ایک فقرہ الگ ہوتا کہ سننے والوں کو یاد رہ جاتا، معمول تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین دفعہ فرماتے جس بات پر زور دینا ہوتا، بار بار اس کا اعادہ فرماتے، حالت گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی، آواز بلند تھی، حضرت ام ہانی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم کعبہ میں قرآن پڑھتے تھے، اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے[1]

حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ہند تھا، وہ نہایت خوش تقریر تھے، جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے ان سے پوچھا "آنحضرت صلعم کیونکر تقریر فرماتے تھے" انھوں نے کہا آپ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے، ایک ایک فقرہ الگ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا، ہاتھ سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے، کسی بات پر تعجب کرتے تو ہتھیلی کا رخ پلٹ دیتے، تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے، اور یہی آپ کی ہنسی تھی،

خندہ وتبسم

جریر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ کو دیکھا ہو، اور مسکرا نہ دیا ہو، روایتوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ کو زیادہ ہنسی آتی تو ڈاڑھ کے دانت (نواجذ) نظر آنے لگتے، لیکن ابن القیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے ورنہ کبھی آپ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں،

لباس

عام لباس

لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا، عام لباس چادر قمیص اور تہمد تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا،

پاجامہ

لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا، حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا، موزوں کی عادت نہ تھی لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے

موزہ

[1] ابن ماجہ باب ماجاء فی القراءۃ فی صلوۃ اللیل، [2] شمائل ترمذی،

آپ نے استعمال فرمائے، بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حبری تھے، عمامہ کا شملہ کبھی دوش مبارک پر کبھی دونوں

عمامہ شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا، کبھی تحت الحنک کی طور پر لپیٹ لیتے تھے، عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، عمامہ کے

نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی، اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی، (عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے

ٹوپی کہ ہم میں اور مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں[1]،)

چادر لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں[2] پسند تھیں جسکو عربی میں حبرہ کہتے ہیں،

عبا بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہے جسکی آستینیں اِسقدر تنگ تھی کہ جب وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی، اور ہاتھ کو آستین

سے نکالنا پڑا، تو تیر والی قبا بھی جسکی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی استعمال کی ہے،

کمبل جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے، اور گاڑھے کی ایک تہمد نکال کر دکھائی

کہ انہی کپڑوں میں آپ نے وفات پائی،

حلۂ حمرا روایتوں میں آیا ہے کہ آپ نے حُلّۂ حمرا بھی استعمال کیا ہے، حمرا کی معنی سرخ کے ہیں اس لیے اکثر محدثین

نے وہی عام معنی لیے ہیں لیکن ابن القیم نے اصرار کے ساتھ دعوی کیا ہے کہ سرخ لباس آپ نے کبھی نہیں پہنا، اور نہ

آپ مردوں کے لیے اس کو جائز رکھتے تھے، حلّۂ حمرا ایک قسم کی یمنی چادر تھی جس میں سرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں

اس بنا پر اس کو حمرا کہتے تھے، اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے، عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت

نہیں، زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے، مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے سیاہ

سرخ، سبز، زعفرانی، ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں، لیکن سفید رنگ بہت مرغوب[3] تھا، (بعض اوقات اس قسم

کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوئی تھی[4]) نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس

نعلین ملک میں چپّل کہتے ہیں، یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے، بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا

جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے ہوتے تھے، چارپائی بان کی سی ہوتی تھی جس سے اکثر جسم پر بدھیاں

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس [2] صحیح بخاری باب اللباس [3] (ابوداؤد کتاب اللباس) مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۴۴ [4] ابوداؤد جلد ۲ کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر)

پڑھاتی تھیں،

انگوٹھی

جب آپ نے نجاشی اور قیصر روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مُہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا، بعض صحابہ سے روایت ہے کہ آپ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال کرتے تھے، پہنتے نہ تھے، لیکن شمائل ترمذی میں متعدد صحابہ سے روایت ہے کہ آپ یوں بھی استعمال فرماتے تھے اور داہنے ہات کی انگلی میں پہنتے تھے،

خود و زرہ

لڑائیوں میں زرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے، احد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو دو زرہیں تھیں، تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا،

عام غذا

غذا اور طریقۂ طعام | اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پرتکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے، یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے) تمام عمر آپ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی، تاہم بعض کھانے آپکو نہایت مرغوب تھے، سرکہ، شہد، حلوا، روغن زیتون، کدو، خصوصیت کے ساتھ پسند تھے، سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اسکی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈھتے، ایک دفعہ حضرت ام ہانی کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کچھ کھانے کو ہے،

مرغوب کھانے

بولیں کہ سرکہ ہے، فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو، اُس کو نادار نہیں کہہ سکتے، عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈالکر پکایا جاتا ہے، آپ کو یہ بہت مرغوب تھا،

ایک دفعہ حضرت امام حسن علیہ السلام، اور عبد اللہ بن عباس سلمیٰ کے پاس گئے اور کہا کہ آج ہمکو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ، جو آنحضرت صلعم کو بہت مرغوب تھا، بولیں تم کو وہ کیا پسند آئے گا؟ لوگوں نے اصرار کیا تو انھوں نے جَو کا آٹا پیسکر ہانڈی میں چڑھا دیا، اوپر سے روغن زیتون، اور زیرہ، اور کالی مرچیں ڈال دیں، پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا اور کہا کہ یہ آپ کی مرغوب ترین غذا تھی،

گوشت کے اقسام میں سے آپ نے دنبہ، مرغ، بٹیر (حباری) اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے، دست کا گوشت بہت پسند تھا، شمائل ترمذی میں حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت

فی نفسہ آپ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لیے جب کبھی ملتا تو آپ چاہتے تھے کہ جلد پک کر طیار ہو جائے، دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لیے آپ اسی کی فرمایش کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپ کو یہ گوشت پسند تھا،

حضرت صفیہ کے نکاح میں جب آپ نے ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا تو صرف کھجور، اور ستو تھا، تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے، پتلی ککڑیاں پسند تھیں، ایک دفعہ معوذ بن عفراء کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی ککڑیاں خدمت میں پیش کیں (بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے)

پانی دودھ شربت

ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا، دودھ کبھی خالص نوش فرماتے کبھی اس میں پانی ملا دیتے، کشمش، کھجور، انگور، پانی میں بھگو دیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جان فرماتے، کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا، روایت میں اسیقدر ہے، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا اسلیے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا،

معمولات طعام

دسترخوان پر جو کھانا آتا اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے، لیکن اسکو بُرا نہ کہتے، جو سالن سامنے ہوتا اُسی میں ہاتھ ڈالتے، ادھر اُدھر ہات نہ بڑھاتے، اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے، کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک کر نہ کھاتے، اور اس کو ناپسند فرماتے، میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا، خوان زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی، عجم اُسی پر کھانا رکھکر کھاتے تھے، چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی، یعنی امرا اور اہل جاہ کے ساتھ مخصوص تھی، اس لیے آپ نے اُس پر کھانا پسند نہیں فرمایا، کھانا صرف تین انگلیوں سے کھاتے[1]، گوشت کو کبھی کبھی چُھری سے کاٹ کر بھی کھاتے، صحیح بخاری میں یہ روایت موجود[2] ہے، ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت کو چھری سے نہ کاٹو، کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے، لیکن ابوداؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، اس حدیث کے ایک راوی ابومعشر نجیح ہیں جن کے نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں، اور انہی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے[3]،

---

[1] غذا کے متعلق تمام روایات شمائل ترمذی اور زاد المعاد ابن قیم سے ماخوذ ہیں، [2] کتاب الاطعمہ باب قطع اللحم بالسکین، [3] قسطلانی شرح صحیح بخاری (جلد ۸ صفحہ ۲۵ مصر

خوش لباسی

خوش لباسی گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ کو نفرت تھی، لیکن کبھی کبھی نہایت قیمتی اور خوش نما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس جب خوارج کے پاس سفیر ہو کر گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے، خوارج نے کہا، کیوں ابن عباس! یہ کیا لباس ہے، بولے کہ تم اس پر معترض ہو، میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے[1]،

حضرت عبداللہ بن عمر نہایت متقشف تھے، ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلہ مول لیا، گھر پر آکر دیکھا تو اس میں سرخ دھاریاں تھیں، جاکر واپس کر آئے، کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماءؓ (حضرت عائشہ کی بہن) سے کہا، انھوں نے آنحضرت صلعم کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جسکی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی[2]،

(بعض امراء وسلاطین نے آنحضرت صلعم کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ بھیجے، آپ نے قبول فرمایا، اور کبھی کبھی زیب تن کئے،)

مرغوب رنگ

مرغوب رنگ رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا، حدیثوں میں ہے کہ کبھی کبھی آپ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے[3]، (سفید رنگ بھی بہت پسند تھا، فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے،)

نامرغوب رنگ

نامرغوب رنگ سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ عبداللہ بن عمرو سرخ کپڑے پہن کر آئے تو فرمایا یہ کیا لباس ہے، عبداللہ نے جاکر آگ میں ڈال دیا، آپ نے سنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی، کسی عورت کو دیدیا ہوتا[4]،

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے، جس کو مغرہ کہتے ہیں، اُس سے کپڑے رنگا کرتے تھے، یہ رنگ آپکو نہایت ناپسند تھا، ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں آپ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے گئے، حضرت زینب سمجھ گئیں، کپڑے دھو ڈالے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا[5]،

ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہنکر آیا تو آپ نے اُسکے سلام کا جواب نہیں دیا، ایک دفعہ صحابہ نے

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر، [2] ابوداؤد باب الرخصة فی العلم وخط الحریر، [3] ابوداؤد باب فی المصبوغ، [4] ابوداؤد باب فی الحمرة، [5] ابوداؤد

سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈال دی تھیں، آپ نے فرمایا میں یہ دیکھتا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے، فوراً صحابہ نہایت تیزی[1] سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینک دیں،

خوشبو

خوشبو کا استعمال خوشبو آپ کو بہت پسند تھی، کوئی شخص خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے، ایک خاص قسم کی خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سُکّہ کہتے ہیں، یہ ہمیشہ آپکے استعمال میں رہتا تھا، صحابہ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا، اکثر فرمایا کرتے کہ مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے کہ خوشبو پھیلے، اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے[2]،

لطافت پسندی

لطافت پسندی مزاج میں لطافت تھی، ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا[3] کرے،

ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے پوچھا تم کو کچھ مقدور ہے؟ بولا ہاں، ارشاد ہوا کہ خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے[4]

عرب تہذیب و تمدن سے کم آشنا تھے، مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے آپ اس کو نہایت ناپسند فرماتے، دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے، ایکدفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا اور اس جگہ خوشبو لاکر ملی، آپ نہایت خوش ہوئے اور اُسکی تحسین[5] کی،

کبھی کبھی مجلسِ عالی میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور[6] ہوتا،

ایک دفعہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ خضاب لگانا کیسا ہے بولیں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن میں اسلیے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب (رسول اللہ صلعم) کو حنا کی بو ناگوار تھی[7]۔

---

[1] یہ تمام روایتیں ابو داؤد کتاب اللباس میں ہیں، [2] شمائل ترمذی، [3] ابو داؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی غسل الثوب، [4] ابو داؤد کتاب اللباس، [5] نسائی کتاب المساجد، [6] نسائی صفحہ ۲۶۴، مطبوعہ نظامی باب البخور، [7] نسائی صفحہ ۹۵۷، باب کراہیۃ ریح الحناء۔

اکثر مشک اور عنبر کا استعمال فرماتے،

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ بالوں کو درست کرلے[1]، ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی، پسینہ آیا تو اُتار کر رکھ دی[2]،

ایک دن لوگ مسجد نبوی میں آئے، چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آئے تھے، پسینہ آیا تو تمام مسجد میں بو پھیل گئی، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا[3]، اُسی دن سے غسل جمعہ ایک شرعی حکم بن گیا،

مسجد نبوی میں جھاڑو دینے کا التزام تھا، ام محجن نام ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی، ابن ماجہ میں روایت ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ مساجد میں بچے اور مجنوں نہ جانے پائیں اور خرید وفروخت نہ ہونے پائے، یہ بھی حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے دن خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں

اہل عرب بدویت کے اثر سے لطافت اور صفائی کا نام نہیں جانتے تھے، اس بناپر اس خاص بات میں آپ کو نہایت اہتمام کرنا پڑتا تھا

عرب کی عادت تھی (اور آج بھی بدویوں میں عموماً پائی جاتی ہے) کہ راستہ میں بول وبراز کرتے تھے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) اس کو نہایت ناپسند فرماتے، اور اس سے منع کرتے تھے، احادیث میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں، کہ آپ نے اُن لوگوں پر لعنت کی ہے جو راستہ میں یا درختوں کے سایہ میں بول وبراز کرتے ہیں، امراء کا دستور ہے کہ کاہلی کی وجہ سے کسی برتن میں پیشاب کرلیا کرتے ہیں، اس سے بھی منع فرماتے تھے[4]،

عرب میں پیشاب کے بعد استنجا کرنے یا پیشاب سے کپڑوں کے بچانے کا مطلق دستور نہ تھا، آپ ایک دفعہ راہ میں جارہے تھے، دو قبریں نظر آئیں، فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہورہا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو پیشاب سے محفوظ نہیں رکھتا تھا[5]،

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس [2] ابوداؤد کتاب اللباس [3] اس مضمون کی متعدد حدیثیں بخاری شریف (غسل جمعہ) میں بہ اختلاف الفاظ وواقعات مذکور ہیں۔ [4] ترغیب وترہیب کتاب الطہارہ [5] صحیح بخاری عذاب القبر

ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے، دیواروں پر جابجا تھوک کے دھبے تھے، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی تھی، اُس سے کھرچ کھرچ کر تمام دھبے مٹائے، پھر لوگوں کی طرف خطاب کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ کوئی شخص تمہارے سامنے آکر تمہارے مونھہ پر تھوک دے، جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے اور فرشتے اُس کے داہنے جانب ہوتے ہیں، اس لیے انسان کو سامنے یا داہنے جانب تھوکنا نہیں چاہیے[۱]،

ایک صحابی نے عین نماز میں (جبکہ وہ امام نماز تھے) تھوک دیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھ رہے تھے، فرمایا کہ یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے، نماز کے بعد یہ صاحب خدمت اقدس میں آئے اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حکم دیا ہے، فرمایا، ہاں تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی[۲]،

بودار چیزوں مثلاً پیاز لہسن اور مولی سے سخت نفرت تھی، حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں، بخاری میں حدیث ہے کہ جو شخص پیاز لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے، اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے، زمانہ خلافت میں حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو، حالانکہ میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیتے کہ مسجد سے نکال کر بقیع بھیج دیا جائے[۳]،

سواری کا شوق | گھوڑے کی سواری آپ کو نہایت مرغوب تھی، آپ فرمایا کرتے الخیل معقود فی نواصیها الخیر[۴]،
گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اور اونٹ پر آپ نے سواری فرمائی ہے آپکے خاص سواری کے گھوڑے کا نام **لُحَیف** تھا، گدھے کا نام **عُفَیر**، خچر کا نام **دلدل** اور ناقہ اور اونٹنیوں کا نام **قصوا** اور **عضبا** تھا)،

اسپ دوانی | مدینہ سے باہر ایک میدان تھا جسکی سرحد حفیا سے ثنیۃ الوداع تک ۶ میل تھی، یہاں گھڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی،

گھوڑے جو مشق کے لیے طیار کرائے جاتے تھے ان کی تیاری کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے ان کو خوب دانہ

۱؎ ترغیب و ترہیب، ۲؎ ترغیب و ترہیب باب البصاق فی المسجد، ۳؎ مسلم و نسائی و ابن ماجہ، ۴؎ نسائی صفحہ ۵۶۷ باب حب الخیل

گھاس کھلاتے تھے، جب وہ موٹے تازے ہو جاتے تو اُن کی غذا کم کر دی شروع کرتے اور گھر میں باندھ کر جار جامہ کستے، پسینہ آتا اور جسم تک ہوتا، روز انہ یہ عمل جاری رہتا، رفتہ رفتہ جس قدر گوشت چڑھ گیا تھا، چھٹ کر ہلکا پھلکا چھریرا بدن نکل آتا، یہ مشق چالیس دن میں ختم ہوتی،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سواری کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام سبحہ تھا، ایک دفعہ اس کو آپ نے بازی میں دوڑایا، اُس نے بازی جیتی تو آپ کو خاص مسرت ہوئی،[1]

گھوڑ دوڑ کا اہتمام حضرت علیؓ کے سپرد تھا، اُنھوں نے اپنی طرف سے سراقہ بن مالک کو یہ خدمت سپرد کی اور اس کے چند قاعدے مقرر کئے جنکی تفصیل حسب[2] ذیل ہے،

۱ گھوڑوں کی صفیں قائم کیجائیں اور تین دفعہ پکار دیا جائے کہ جسکو لگام درست کرنی، یا بچّہ کو ساتھ رکھنا، یا زین الگ کر دینی ہو الگ کرلے۔

۲ جب کوئی آواز نہ آئے تو تین دفعہ تکبیریں کہی جائیں، تیسری تکبیر پر گھوڑے میدان میں ڈال دیئے جائیں،

۳ گھوڑے کے کان آگے نکل جائیں تو سمجھ لیا جائیگا کہ وہ آگے نکل گیا،

حضرت علیؓ خود میدان کے انتہائی سرے پر بیٹھ جاتے اور ایک خط کھینچ کر دو آدمیوں کو دونوں کناروں پر کھڑا کر دیتے، گھوڑے انہی دونوں کے درمیان سے ہو کر نکلتے۔

اونٹوں کی دوڑ بھی ہوتی، آنحضرت صلعم کی خاص سواری کا ناقہ عضباء ہمیشہ بازی لیجاتا، ایک دفعہ ایک بدو اونٹ پر سوار آیا، اور مسابقت میں عضباء سے آگے نکل گیا، تمام مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا، آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ خدا پر حق ہے کہ دنیا کی جو چیز گردن اُٹھائے اس کو نیچا دکھائے،[3]

رنگوں میں صندلی، مشکی اور کمیت بہت پسند[4] تھا، گھوڑوں کی دُم کاٹنے سے منع فرمایا کہ مکھی ہانکنے کا مورچھل ہے،[5]

---

[1] دار قطنی جلد ۲ صفحہ ۵۵۲ (کتاب السبق بین الخیل مسند احمد اور بیہقی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے) [2] یہ پوری تفصیل دار قطنی صفحہ ۵۵۳ و ۵۵۴ و کتاب السبق بین الخیل میں ہے لیکن محمد بن حبیب سے یہ روایت ضعیف ہے) [3] (صحیح بخاری ونسائی و دار قطنی و مسند احمد عن انس باب الرہان والسبق) [4] نسائی مطبوعہ نظامی صفحہ ۵۶ (باب ما یستحب من شیمۃ الخیل) (5 کتب سنن کتاب الادب)

معمولات

(ترمذی نے شمائل میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیے تھے، ایک عبادت الٰہی کے لیے، دوسرا عام خلق کے لیے، اور تیسرا اپنی ذات کے لیے"[1])

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر (جا نماز پر) آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا (اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا، لوگ پاس آ آ کر بیٹھتے اور آپ اُن کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے[2])

(اکثر صحابہ سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے، کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے، آپ اس کی تعبیر بیان فرماتے[3]، کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے[4]، اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی، لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے، شعر پڑھتے، ہنسی خوشی کی باتیں کرتے، آنحضرت صلعم صرف مسکرا دیتے[5]، اکثر اسی وقت مالِ غنیمت اور وظائف و خراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے[6]،

بعض روایتوں میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے، گھر جا کر گھر کے دھندے میں مشغول رہتے، پھٹے کپڑوں کو سیتے، جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لگاتے، دودھ دوہتے[7])

نماز عصر پڑھ کر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جاتے، اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے، پھر جس کی باری ہوتی، وہیں رات بسر فرماتے، تمام ازواج مُطہرات وہیں جمع ہو جاتیں، عشا تک صحبت[8] رہتی، پھر نماز عشا کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے اور واپس آکر سو رہتے، ازواج رخصت ہو جاتیں، نمازِ عشا کے بعد بات چیت کرنی ناپسند فرماتے[9]،

خواب

عام معمول یہ تھا کہ آپ اوّل وقت نماز عشا پڑھ کر آرام فرماتے تھے، سوتے وقت التزاماً قرآن مجید

(1) صحیح مسلم باب تسمیہ صلعم و ابوداؤد صفحہ ۱۳۱، (2) جامع ترمذی، (3) صحیح مسلم کتاب التعبیر، (4) صحیح بخاری کتاب التعبیر، (5) نسائی باب قعود الامام فی مصلاہ، (6) بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں۔ (7) صحیح بخاری باب ما یکون الرجل فی مہنۃ اہلہ و مسند ابن حنبل و مسند عائشہؓ، (8) صحیح مسلم باب القسم بین الزوجات، (9) بخاری صلوٰۃ العشاء۔

کی کوئی سورہ (بنی اسرائیل، زمر، حدید، حشر، صف، تغابن، جمعہ) پڑھکر سوتے، شمائل ترمذی میں ہے کہ آرام فرماتے وقت یہ الفاظ فرماتے،

اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی — خدایا تیرا نام لیکر مرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں،

جاگتے تو فرماتے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ — اس خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندہ کیا

اِلَیْہِ النُّشُوْرُ — اور اسی کی طرف حشر ہوگا،

آدھی رات یا پھر رات رہے جاگ اٹھتے، مسواک ہمیشہ سرہانے رہتی تھی، اٹھکر پہلے مسواک فرماتے پھر وضو کرتے، اور عبادت میں مشغول ہوتے، آپ کی سجدہ گاہ آپ کے سرہانے ہوتی تھی،

ہمیشہ داہنی کروٹ اور دایاں ہات رخسارے کے نیچے رکھکر سوتے، لیکن جب کبھی سفر میں پچھلے پہر منزل پر اُترکر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ دایاں ہات اونچا کرکے چہرہ اُس پر ٹیک کر سوتے کہ گہری نیند آجائے نیند میں کسیقدر خراٹے کی آواز آتی تھی،

بچھونے میں کوئی التزام نہ تھا، کبھی معمولی بستر پر کبھی، کبھی کھال پر کبھی چٹائی پر، اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے،

عبادت شبانہ | آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خانگی معمولات اور اوراد سے حضرت عائشہ کے برابر کوئی واقف نہ تھا، اُن سے مروی ہے کہ جب سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپ نے اس قدر نمازیں پڑھیں کہ پاؤں پر ورم آگیا، بارہ مہینے تک باقی آیتیں رُکی رہیں، سال بھر کے بعد جب بقیہ آیتیں اُتریں تو قیام لیل جواب تک فرض تھا نفل رہ گیا،

شب کو آٹھ رکعت متصل پڑھتے، جس میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ کرتے، پھر ایک اور رکعت پڑھتے،

لہ یہ پوری تفصیل زرقانی میں حدیث کی متعدد کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے۔

اور اس میں بھی جلسہ کرتے، پھر دو رکعتیں وتر ادا کرتے، اس طرح ۱۱ رکعتیں ہو جاتیں، لیکن جب عمر زیادہ ہو گئی، اور جسم ذرا بھاری ہو گیا تو سات رکعتیں پڑھتے، جس کے بعد دو رکعتیں اور ادا کرتے، کبھی کبھی رات کو اتفاقاً نیند کا غلبہ ہوتا اور اس معمول میں فرق آتا تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے تھے[1]

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے ایک اور روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں،

عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کر گھر میں چلے آتے اور یہاں چار رکعتیں پڑھ کر خواب راحت فرماتے وضو کا پانی اور مسواک، سرہانے، رکھ دی جاتی، سو کر اٹھتے پہلے مسواک فرماتے، پھر وضو کرتے اور جائے نماز پر آٹھ رکعتیں ادا کرتے،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنی خالہ میمونہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں تھیں) کے یہاں خاص اس غرض سے رات کو رہا کہ دیکھوں آپ رات کو کس طرح نماز پڑھتے ہیں، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، آپ نے اس پر آرام فرمایا، میں سامنے آڑا سویا، قریبا رات ڈھلے آپ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے، **آل عمران** کی اخیر کی دس آیتیں پڑھیں، پانی کی مشک لٹکی ہوئی تھی، اس سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی، میں بھی وضو کر کے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا، آپ نے ہات پکڑ کر داہنی جانب پھیر دیا، ۱۳ رکعتیں پڑھ کر آپ سو رہے، یہاں تک سانس کی آواز آنے لگی، صبح ہوتے حضرت بلالؓ نے اذان دی آپ اٹھے، فجر کی سنتیں ادا کیں، پھر مسجد میں تشریف لے گئے،

معمولات نماز ابتداء میں آپ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے، لیکن جب یہ گراں گزرنے لگا تو صرف پنج وقتہ مسواک رہ گئی، فتح مکہ میں آپ نے سب سے پہلے، ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں[2] تاہم عادۃً آپ اکثر نئے وضو کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے، وضو میں عام معمول یہ تھا کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوتے، پھر کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے اس کے بعد تین تین بار منہ ہات دھوتے، سر کا مسح کرتے، اور تین بار پاؤں کو دھوتے[3]، بعض اوقات کسی عضو کو تین

---

[1] سنن ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل [2] صحیح مسلم و مسند جلد ۵ صفحہ ۲۲۵، [3] مسلم جلد ا صفحہ باب صفۃ الوضوء واکمالہ

بار، اور کسی عضو کو دو بار اور کسی عضو کو ایک بار دہوتے،[1]

سنن و نوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے، اذان صبح ہی کے ساتھ اُٹھتے اور فجر کی دو رکعت سنت نہایت اختصار کے ساتھ ادا کرتے، یہاں تک کہ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ مجھے بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھی یا نہیں[2]، لیکن فرض کی دو رکعتوں میں عموماً طویل سورتیں پڑھتے، حضرت عبداللہ بن سائب سے مروی ہے کہ ایک بار آپ نے مکہ میں نماز فجر میں سورۂ مومنین پڑھی اسی طرح کبھی وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ، اور کبھی سورۂ قٓ پڑھتے، صحابہ کا اندازہ ہے کہ آپ صبح کی نماز میں ساٹھ سے لیکر سو آیتوں تک پڑھتے تھے،

ظہر و عصر میں اگرچہ بہ نسبت فجر کے تخفیف فرماتے تھے، تاہم ابتدا کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اتنی بڑی سورہ پڑھتے کہ آدمی بقیع تک جاتا تھا اور وہاں اپنا کام کرتا تھا، پھر پلٹ کر گھر آتا تھا، اور وضو کرتا تھا اور پہلی رکعت میں جاکر شامل ہو جاتا تھا، صحابہ نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ظہر کی اوّل دو رکعتوں میں آپ اس قدر قیام فرماتے ہیں جس میں الٓمٓ تَنْزِيْلُ السَّجْدَة کے برابر سورہ پڑھی جاسکتی ہے، اخیر کی دو رکعتوں میں یہ مقدار نصف رہجاتی تھی، عصر کی دونوں پہلی رکعتوں میں ظہر کی آخری رکعتوں کے برابر قیام فرماتے تھے، اور اخیر کی دو رکعتوں میں پہلی رکعتوں کی نصف مقدار رہجاتی تھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم ظہر کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر اور دوسری رکعت میں پندرہ آیتوں کے یا اس کے نصف کے برابر، اور عصر میں پندرہ آیتوں کے برابر پڑھا کرتے تھے، جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ ظہر میں آپ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى پڑھتے تھے،

مغرب کی نماز میں وَالْمُرْسَلٰتِ اور سورۂ طور پڑھتے تھے،

عشا کی نماز میں وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ اور اسی کے برابر کی سورتیں پڑھتے تھے،

تہجد کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، مثلاً سورۂ **بقرہ**، سورۂ **آل عمران**، سورۂ **نساء**،

---

[1] مسلم جلد ا صفحہ ۱۱ باب آخری صفۃ الوضوء [2] مسلم جلد ا صفحہ ۲۷۰ باب رکعتی سنۃ الفجر والحث علیہا [3] مسلم جلد ا صفحہ ۱۸۷ باب القراءۃ فی الظہر والعصر، وغیرہا،

جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ اور دوسری رکعت میں اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ، اور کبھی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ۔

عیدین میں بھی دو پچھلی سورتیں یعنی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور ھَلْ اَتٰکَ پڑھتے تھے، اور اتفاق سے اگر عید اور جمعہ ایک ساتھ پڑجاتا تو دونوں نمازوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے، جمعہ کے دن کی نماز صبح میں الٓمّٓ تَنْزِیْلُ السَّجْدَۃِ، اور ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ، پڑھنے کا معمول تھا[1]،)

معمولات خطبہ (وعظ و پند اور ارشاد و ہدایت کے لیے آپ اکثر خطبہ دیا کرتے تھے، بالخصوص جمعہ کے لیے تو خطبہ لازمی تھا، جمعہ کے خطبات میں معمول یہ تھا کہ جب لوگ جمع ہوجاتے تو آپ نہایت سادگی کے ساتھ گھر سے نکلتے، مسجد میں داخل ہوتے، تو لوگوں کو سلام کرتے، پھر منبر پر تشریف لیجاتے تو لوگوں کی طرف رُخ کرکے سلام کرتے، اور اذان کے بعد فوراً خطبہ شروع کردیتے، پہلے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا، لیکن جب منبر بن گیا تو ہاتھ میں عصا لینا چھوڑ دیا، خطبہ ہمیشہ نہایت مختصر اور جامع ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے، جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورۂ قٓ، پڑھتے تھے[2]، اس میں قیامت اور حشر و نشر کا تفصیل ذکر ہے،

خطبہ ہمیشہ حمد خدا وندی کی ساتھ شروع کرتے تھے، اگر اثنائے خطبہ میں کوئی کام پیش آجاتا تو منبر سے اُتر کر اس کو کرلیتے، پھر منبر پر جاکر خطبہ کو پورا فرماتے، ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے، اسی حالت میں ایک آدمی نے آکر کہا کہ "یا رسول اللہ میں مسافر آدمی ہوں اپنے دین کی حقیقت سے ناواقف ہوں اس کے متعلق پوچھنے آیا ہوں" آپ منبر سے اُتر آئے، ایک کرسی رکھ دی گئی، اس پر بیٹھ گئے اور اس کو تعلیم و تلقین کی، پھر جاکر خطبہ کو پورا کیا[3]، ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے، امام حسین علیہ السلام سرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آگئے، چونکہ کمسنی کی وجہ سے لڑکھڑاتے آتے تھے، آنحضرت صلعم نے دیکھا تو ضبط نہ ہوسکا، منبر سے اُتر آئے اور گود میں اُٹھالیا اور

[1] یہ تمام روایتیں صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ والعیدین میں مذکور ہیں۔ [2] صحیح مسلم [3] ادب المفرد مطبوعہ مصر صفحہ ۱۸۲ باب الجلوس علی السریر

یہ آیت پڑھی[1] اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ،

خطبہ کی حالت میں لوگوں کو بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیتے تھے، چنانچہ عین خطبہ کی حالت میں ایک شخص مسجد میں آیا، آپ نے پوچھا کیا تم نے نماز پڑھی؟ اُس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا اٹھو اور پڑھو[2]"

میدان جہاد میں جب خطبہ دیتے تھے تو کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہاتھ میں تلوار لیکر کھڑے ہوتے تھے، لیکن ابن قیّم نے لکھا ہے کہ آپ نے خطبہ کی حالت میں کبھی ہاتھ میں تلوار نہیں لی[3]، وعظ و ارشاد کے لیے عمومًا ناغہ دے دیکر خطبہ دیا کرتے تھے، تاکہ لوگ گھبرا نہ جائیں[4]،

معمولاتِ سفر | (حج، عمرہ، اور زیادہ تر جہاد کی وجہ سے آپ کو اکثر سفر کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی، سفر میں معمول تھا کہ پہلے ازواج مطہرات پر قرعہ ڈالتے جس کے نام قرعہ پڑتا وہ ہمسفر ہوتیں[5]، جمعرات کے دن سفر کرنا پسند فرماتے تھے، اور صبح سے تڑکے روانہ ہو جاتے تھے، افواج کو بھی جب کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اُسی وقت روانہ فرماتے[6] جب سواری سامنے آتی اور رکاب میں قدم مبارک کو رکھتے تو بسم اللہ کہتے اور جب زین پر سوار ہو جاتے تو تین بار تکبیر کہتے، اس کے بعد یہ آیت پڑھتے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ	سب تعریف اُس خدا کی جسنے اس جانور کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا حالانکہ
وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ	ہم خود اسکو مطیع نہیں کر سکتے تھے اور ہم اپنے خدا کیطرف پلٹنے والے ہیں،

پھر یہ دعا کرتے،

اللّٰھم انا نسألک فی سفرنا ھذا البرّ والتقوی	خداوندا! اس سفر میں ہم تجھسے نیکی، پرہیزگاری اور عمل پسندیدہ کی
ومن العمل ما ترضی اللّٰھم ھوّن علینا سفرنا	درخواست کرتے ہیں، خداوندا ہمارے اس سفر کو آسان
واطوِ عنّا بعدہ اللّٰھم انت الصاحب فی السفر	اور اسکی مسافت کو طے کر دے، خداوندا سفر میں تو رفیق ہے،

ترمذی و ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا سافر

---

[1] جامع ترمذی مناقب حسنین [2] بخاری جلد ا صفحہ ۱۲۷، باب اذا رأی الامام رجلاً جاء وہو یخطب امرہ ان یصلی رکعتین [3] زاد المعاد جلد اول صفحہ ۱۲۱ فصل فی ہدیہ فی خطبہ۔ [4] بخاری جلد ا صفحہ ۱۶ باب ما کان النبی صلعم یتخولہم بالموعظۃ [5] بخاری جلد ۲ باب حدیث الافک کتاب المغازی [6] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای یوم یستحب السفر و باب فی الابتکار فی السفر [7] ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ سوار ہو جانے کے بعد تین بار تکبیر و تحمید کرتے پھر یہ دعا پڑھتے، سبحانک انی ظلمت

والخليفة في الاهل، اللهم اني اعوذ بك من وعثاء	مال بچوں کے لیے تو ہمارا قائم مقام ہے، خداوندا! میں سفر
السفر وكآبة المنقلب وسوء المنظر في الاهل	اور واپسی کے آلام مصائب، اور گھر بار کی مناظر قبیحہ سے
والمال،	تیری پناہ مانگتا ہوں،

جب واپس ہوتے تو اس میں اسقدر اور اضافہ کر دیتے، آئبون، تائبون، عابدون لربنا حامدون، راستے میں جب کسی چوٹی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے، اور جب اس سے نیچے اترتے تو ترنم زیر تسبیح ہوتے، صحابہ بھی آپ کے ہم آواز ہو کر تکبیر و تسبیح کا غلغلہ بلند کرتے، جب کسی منزل پر اترتے تو یہ دعا فرماتے،

يا ارض ربي وربك الله اعوذ بالله من شرك	اے زمین میرا اور تیرا پروردگار خدا ہے، میں تیری برائی سے اور اس چیز کی
وشر ما فيك وشر ما خلق فيك وشر ما يدب	برائی سے جو تیرے اندر ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر پیدا کی گئی ہے
عليك واعوذ بك من اسد واسود ومن الحية	اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ پر چلتی ہے، پناہ مانگتا ہوں، خداوندا تجھ سے شیر
والعقرب ومن ساكن البلد ومن والد وما ولد،[2]	سانپ، بچھو، اور اس گاؤں کے رہنے والوں اور آدمیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

جب کسی آبادی میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے،

اللهم رب السماوات السبع وما اظللن و	خداوندا اے ساتوں آسمان اور ان تمام چیزوں کے پروردگار جن پر وہ سایہ
رب الارضين السبع وما اقللن ورب	افگن ہیں، اے ساتوں زمینوں اور ان تمام مخلوقات کے پروردگار جو ان پر موجود
الشياطين وما اضللن ورب الرياح وما ذرين	ہیں، اے شیاطین اور ان تمام لوگوں کے پروردگار جن کو وہ گمراہ کرتے ہیں، اے ہوا اور
اسألك خير هذه القرية وخير اهلها و	ان تمام اشیاء کے پروردگار جن کو وہ اڑاتی ہیں، میں تجھ سے اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے
اعوذ بك من شرها وشر اهلها و	والوں کی بھلائی کی درخواست کرتا ہوں، اور اس گاؤں اور اس گاؤں کے
شر ما فيها،[3]	رہنے والوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا سافر، [2] زاد المعاد فصل فی ہدیہ فی السفر، [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا نزل المنزل،

مدینہ پہنچتے تو پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نماز ادا فرماتے[1] پھر مکان کے اندر تشریف لیجاتے، تمام لوگوں کو حکم تھا کہ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر کے اندر نہ چلے جائیں، تاکہ عورتیں اطمینان کے ساتھ سامان درست کرلیں[2]،

معمولات جہاد جہاد میں معمول یہ تھا کہ جب فوج کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو امیر العسکر کو خاص طور پر پرہیز گاری اختیار کرنے اور اپنے رفقاء کے ساتھ نیکی کرنے کی ہدایت فرماتے، پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہوکر فرماتے،

اغزوا باسم اللّٰہ فی سبیل اللّٰہ قاتلوا من کفر باللّٰہ اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدًا،	خدا کے نام پر خدا کی راہ میں کفار سے لڑو، خیانت اور بدعہدی نہ کرنا، مُردوں کے ناک کان نہ کاٹنا، بچوں کو قتل نہ کرنا،

اُس کے بعد شرائط جہاد کی تلقین کرتے[3]،

جب فوج کو رخصت کرتے تو یہ الفاظ فرماتے،

استودع اللّٰہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم[4]	میں تمہارے دین کو، امانت کو اور تمہارے اعمال کے نتائج کو خدا کے حوالے کرتا ہوں

جب خود شریک جہاد ہوتے اور حملہ کے مقام پر شب کو پہنچتے تو صبح کا انتظار کرتے، صبح ہو جاتی تو حملہ کرتے[5] اگر صبح کے وقت حملہ کرنے کا اتفاق نہ ہوتا تو دوپہر کے ڈھلنے کے بعد حملہ کرتے[6]، جب کوئی مقام فتح ہو جاتا تو اقامت عدل و انصاف کے لیے وہاں تین دن تک قیام فرماتے[7]، جب فتح و ظفر کی خبر آتی تو سجدۂ شکرانہ بجالاتے[8]، جب میدان جہاد میں شریک کارزار ہوتے تو یہ دعا فرماتے،

اللھم انت عضدی ونصیری بک احول وبک اصول وبک اقاتل[9]	خداوندا تو میرا دست و بازو ہے، تو میرا مددگار ہے، تیرے سہارے پر میں مدافعت کرتا ہوں، حملہ کرتا ہوں، اور لڑتا ہوں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی اعطاء البشیر [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔ [3] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث ووصیۃ ایاہم بآداب الغزو وغیرہا [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء عند الوداع [5] بخاری کتاب المغازی ذکر غزوۂ خیبر [6] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای وقت یستحب اللقاء [7] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الامام یقیم عند الظہور علی العدو بعرصتہم۔ [8] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر [9] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یدعی عند اللقاء۔

معمولات عیادت و تعزیت (بیمارون کی عیادت وغمخواری آپ ضرور فرماتے تھے اور صحابہ کو ارشاد ہوتا تھا، کہ عیادت بھی ایک مسلمان کا فرض ہے[1]، ہجرت کے ابتدائی زمانہ مین معمول شریف یہ تھا کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت قریب آجاتا تو صحابہ آپ کو اسکی اطلاع دیتے، آپ اُس کے مرنے سے پہلے تشریف لاتے، اس کے لیے دعاے مغفرت فرماتے، اور اخیر دم تک اس کے پاس بیٹھے رہتے، یہان تک کہ دم واپسین کے انتظار مین آپکو اس قدر دیر ہوجاتی کہ آپکو تکلیف ہونے لگتی، صحابہ نے تکلیف کا احساس کیا، اور اب اونکا یہ معمول ہوگیا کہ جب کوئی شخص مرچکتا تو آپ کو اسکی موت کی خبر دیتے، آپ اس کے مکان پر تشریف لیجاتے، اُس کے لیے استغفار فرماتے، جنازہ کی نماز پڑھتے، اس کے بعد اگر مٹی دینا چاہتے تو ٹھہر جاتے، ورنہ واپس چلے آتے، لیکن صحابہ کو آخر آپکی یہ تکلیف بھی گوارا نہ ہوئی، اس لیے خود جنازہ آپ کے مکان تک لانے لگے اور یہی عام معمول ہوگیا[2]،

عیادت کے لیے جب کسی بیمار کے پاس تشریف لیجاتے، تو اُس کو تسکین دیتے پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے[3] اُسکی صحت کے لیے دعا فرماتے[4]، اور کہتے ان شاءاللہ طهور، خدا نے چاہا تو خیریت ہے، کوئی بدفالی کے فقرے کہتا تو ناپسند فرماتے، ایک بار ایک اعرابی مدینہ مین آکر بیمار پڑگیا، آپ اسکی عیادت کو تشریف لے گئے اور کلمات تسکین ادا فرمائے، اس نے کہا تم نے خیریت کہا، شدید تپ ہے، جو قبر ہی مین ملا کر چھوڑے گی، آپ نے فرمایا ہان! اب یہی ہو[5]،)

معمولات ملاقات معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ کرتے، کوئی شخص اگر جھک کر آپ کے کان مین کچھ بات کہتا تو اسوقت تک اسکی طرف سے رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے، مصافحہ مین بھی یہی معمول تھا، یعنی کسی سے ہات ملاتے تو جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے اس کا ہات نہ چھوڑتے، مجلس مین بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہمنشینون سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے[6]،

([1] صحیح بخاری باب وجوب عیادۃ المریض، [2] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۶۶، [3] صحیح بخاری باب وضع الید علی المریض، [4] باب دعاء العائد للمریض۔ [5] باب عیادۃ الاعراب) [6] ابوداؤد و ترمذی،

جو شخص حاضر ہونا چاہتا، دروازہ پر کھڑا ہو کر پہلے "السلام علیکم" کہتا، پھر پوچھتا کہ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ (خود بھی آپ کسی سے ملنے جاتے تو اسی طرح اجازت مانگتے) کوئی شخص اس طریقہ کے خلاف کرتا تو آپ اس کو واپس کر دیتے، ایک دفعہ بنو عامر کا ایک شخص آیا اور دروازہ پر کھڑا ہو کر پکارا کہ اندر آسکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ جاکر اس کو اجازت طلبی کا طریقہ سکھا دو، یعنی پہلے سلام کرلے، تب اجازت مانگے،

ایک دفعہ صفوان بن امیہ نے جو قریش کے رئیس اعظم تھے، آنحضرت صلعم کے پاس اپنے بھائی کلدہ کے ہات، دودھ، ہرن کا بچہ، اور لکڑیاں بھیجیں، کلدہ یوں ہی بے اجازت چلے آئے، آپ نے فرمایا کہ واپس جاؤ اور سلام کرکے اندر آؤ[1]

ایک دفعہ حضرت جابرؓ زیارت کو آئے اور دروازہ پر دستک دی، آپ نے پوچھا کون ہے، بولے "میں" آپ نے فرمایا، میں، میں "یعنی یہ کیا طریقہ ہے نام بتانا چاہیے،

جب آپ خود کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور "السلام علیکم" کہکر اذن طلب فرماتے، (راوی کا بیان ہے کہ آپ عین دروازہ کے سامنے اس وجہ سے نہ کھڑے ہوتے کہ اس وقت تک دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا،) اگر صاحب خانہ اذن نہ دیتا تو پلٹ آتے،

چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم **سعد بن عبادہ** کے گھر تشریف لائے، اور باہر کھڑے ہو کر اذن طلبی کے لیے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا، **سعد** نے اسطرح آہستہ سلام کا جواب دیا کہ آنحضرت صلعم نے نہیں سنا، حضرت سعد کے فرزند **قیس بن سعد** نے کہا آپ رسول اللہ کو اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے، حضرت سعد نے کہا چپ رہو، رسول اللہ بار بار سلام کریں گے جو ہمارے لیے برکت کا سبب ہوگا آنحضرت صلعم نے دوبارہ السلام علیکم کہا، اور سعد نے پھر اسیطرح جواب دیا، آنحضرت صلعم نے تیسری دفعہ پھر اسی طریقہ سے اذن طلب کیا اور جب کوئی جواب نہ ملا تو آپ واپس چلے، حضرت سعد نے جب آپ کو جاتے دیکھا تو دوڑ کر گئے اور عرض کی کہ

---

[1] دونوں روایتیں ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ میں ہیں۔

میں آپ کا سلام سن رہا تھا، لیکن آہستہ جواب دیتا تھا کہ آپ بار بار سلام فرماویں[1]۔)

(کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو ممتاز مقام پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے، ایک بار آپ حضرت عبداللہ بن عمر کے مکان پر تشریف لے گئے انھوں نے آپ کے بیٹھنے کے لیے چمڑے کا ایک گدّا ڈال دیا، لیکن آپ زمین پر بیٹھ گئے، اور گدّا آنحضرت صلعم اور حضرت عبداللہ بن عمر کے درمیاں آگیا[2]۔)

معمولات عامہ (تیمّن یعنی داہنی طرف سے یا داہنے ہاتھ سے کام کرنا آپ کو محبوب تھا، جوتا پہلے داہنے پاؤں میں پہنتے، مسجد میں پہلے داہنا پاؤں رکھتے، مجلس میں کوئی چیز تقسیم فرماتے تو داہنی طرف سے، اسی طرح کسی کام کو شروع کرنا چاہتے تو پہلے بسم اللہ کہہ لیتے۔)

---

[1] (ابوداؤد کتاب الادب، [2] ادب المفرد صفحہ ۲۱۹)

مجالسِ نبوی

دربارِ نبوت | شہنشاہِ کونین کا دربار نقیب و چاؤش اور خیل و حشم کا دربار نہ تھا، دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا، حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں یعنی کوئی شخص ذرا جنبش بھی نہیں کرتا تھا، گفتگو کی اجازت میں ترتیب کا لحاظ رہتا تھا لیکن یہ امتیاز مراتب نسب و نام یا دولت و مال کی بنا پر نہیں، بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر ہوتا تھا، سب سے پہلے آپ اہلِ حاجت کی طرف متوجہ ہوتے، اور اُنکے معروضات سنکر اُنکی حاجت برآری فرماتے،

تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے، خود بھی آپ مؤدب ہوکر بیٹھتے، جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا، کوئی شخص بولتا تو جب تک وہ چُپ نہ ہو جائے، دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا، اہلِ حاجت عرض مدعا میں ادب کی حد سے بڑھجاتے، تو آپ کمال حلم کے ساتھ برداشت فرماتے،

آپ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے، جو بات ناپسند ہوتی اُس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے، کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپ نے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہوتا تو شکریہ قبول فرماتے، مجلس میں جس قسم کا ذکر چھڑ جاتا، آپ بھی اس میں شامل ہو جاتے ہنسی اور مہذب ظرافت میں بھی شریک ہوتے، خود بھی مذاقیہ باتیں فرماتے، کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آجاتا تو حسبِ رتبہ اُسکی تعظیم کرتے، اور فرماتے اکرموا کریم کل قوم مزاج پرسی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے، یہ بھی فرماتے کہ جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک نہیں پہنچا سکتے، مجھکو اُن کے حالات اور ضروریات کی خبر دو،

ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آجاتا تھا تو سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے، یہ بھی قاعدہ تھا کہ رؤسا، اور امراجب دربار جماتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھکر کھڑے رہتے، آپ نے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ جسکو یہ پسند آتا ہو کہ اُس کے سامنے لوگ تعظیم سے کھڑے رہیں، اُس کو اپنی جگہ دوزخ میں

ڈھونڈھنا چاہیئے[1]، البتہ جوشِ محبت میں آپ کسی کسی کے لیے کھڑے ہوجاتے، چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا جب کبھی آجاتیں تو اکثر کھڑے ہوجاتے اور فرطِ محبت سے انکی پیشانی چومتے، حضرت حلیمہ سعدیہ کے لیے بھی آپ نے اُٹھکر چادر بچھادی تھی، اسی طرح ایک دفعہ آپ کے رضاعی بھائی آئے تو ان کے لیے بھی محبت سے کھڑے ہوگئے، اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا[2]،

ہر شخص کو اُس کے رتبہ کے مناسب جگہ ملتی، کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہیں آنے پاتا کہ دوسرا شخص اُس سے زیادہ عزت یاب ہے، جب کوئی شخص کوئی اچھی بات کہتا تو آپ تحسین فرماتے، اور نامناسب گفتگو کرتا تو اسکو مطلع فرما دیتے[3]

ایک دفعہ دو شخص مجلس اقدس میں حاضر تھے، ان میں ایک معزز اور دوسرا کم رتبہ تھا، معزز صاحب کو چھینک آئی، لیکن انھوں نے اسلامی شعار کے موافق الحمدللہ نہیں کہا، دوسرے صاحب کو بھی چھینک آئی، انھوں نے الحمدللہ کہا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حسب معمول یرحمک اللہ کہا، معزز صاحب نے شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ انھوں نے خدا کو یاد کیا تو میں نے بھی کیا، تم نے خدا کو بھلادیا، تو میں نے بھی تم کو بھلادیا[4]،

صحابہ کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ کسی کی شکایت یا عیوب آپ تک نہ پہنچائیں آپ فرماتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے صاف جاؤں[5]،

مجالس ارشاد آنحضرت[6] (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و تلقین کا فیض اگرچہ سفر، حضر، جلوت، خلوت، نشست، برخاست غرض ہر وقت جاری رہتا تھا، تاہم اس سے وہی لوگ مستفیض ہوسکتے تھے، جو اتفاق سے موقع پر ہوتے تھے اس بنا پر آپ نے تعلیم و ارشاد کے لیے بعض اوقات خاص کردیئے تھے، کہ لوگ پہلے سے مطلع رہیں اور جن کو استفاضہ منظور ہو، وہ آسکیں۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [2] ابوداؤد، کتاب الادب بر الوالدین۔
[3] یہ تمام تفصیل شمائل ترمذی، کی دو مفصل روایتوں سے ماخوذ ہے جس میں آنحضرت صلعم کے عام اخلاق کا ذکر ہے۔
[4] ادب المفرد امام بخاری، [5] ابوداؤد کتاب الادب، [6] اصابہ ناصحہ

یہ صحبتیں عموماً مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھیں، مسجد نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، کبھی آپ وہاں نشست فرماتے

ابتداءً آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی نشست کے لیے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی، باہر سے اجنبی لوگ آتے تو آپ کے پہچاننے میں دقت ہوتی، صحابہ نے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا، آپ اس پر تشریف رکھتے، باقی دونوں طرف صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے[1]،)

آداب مجلس

(ان مجالس میں آنے والوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی عموماً بدو اپنے اُسی وحشیانہ طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے،

خلق نبوی کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز نظر آتا ہے، آپ پیغمبرِ خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمت اقدس میں حاضر ہیں، ایک شخص آتا ہے، اور اُسکو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) میں، اور حاشیہ نشینوں میں کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا، لوگوں سے پوچھتا ہے، محمدؐ کون ہیں؟ صحابہ بتاتے ہیں کہ یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں، وہ کہتا ہے، اے ابن عبدالمطلب! میں تم سے نہایت سختی کے ساتھ سوال کروں گا، خفا نہ ہونا، آپ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں[2]،

بایں ہمہ سادگی و تواضع، یہ مجالس رعب و وقار اور آداب نبوت کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ اخلاق، مذہب، اور تزکیۂ نفوس تک محدود تھا، اس کے علاوہ اور باتیں منصب نبوت سے خارج تھیں، لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے، مثلاً یا رسول اللہ میرے باپ کا نام کیا ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے وہ کہاں ہے؟ آپ اس قسم کے سوالات کو ناپسند فرماتے تھے،

ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کئے گئے تو آپ نے برہم ہو کر فرمایا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو، میں سب کا جواب دوں گا، حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرے کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا دست[3]،

کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا، ایک شخص نے اسطرح سوال کیا تو آپ نے اس کی طرف

---

[1] ابوداؤد باب القدر [2] بخاری جلد ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان، [3] بخاری کتاب العلم،

تفحص سے دیکھا، اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہوجاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا، بعض اوقات آپ گفتگو کرتے ہوتے، کوئی صحرائیں بدو جو آداب مجلس سے ناواقف ہوتا، دفعۃً آجاتا، اور عین سلسلۂ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا، آپ سلسلۂ تقریر کو قائم رکھتے اور فارغ ہوکر اسکی طرف متوجہ ہوتے، اور جواب دیتے، ایک دفعہ آپ تقریر فرما رہے تھے، ایک بدو آیا اور آپ کے ساتھ اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ تقریر کرتے رہے حاضرین سمجھے کہ آپ نے نہیں سنا، کسی کسی نے کہا "سنا" لیکن آپ کو ناگوار ہوا، آپ گفتگو سے فارغ ہوچکے تو دریافت فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے؟ بدو نے کہا: میں یہ حاضر ہوں" آپ نے فرمایا جب لوگ امانت کو ضائع کرنے لگیں گے بولا کہ امانت کیونکر ضائع ہوگی" فرمایا جب نااہلوں کے ہات میں کام آئے گا[1]

اوقاتِ مجلس | (اس قسم کی مجالس کے لیے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا، نماز فجر کے بعد آپ بیٹھ جاتے، اور فیوض روحانی کا چشمہ جاری ہوجاتا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپ ٹھہر جاتے اور مجلس قایم ہوجاتی چنانچہ کعب بن مالک پر جب غزوۂ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو وہ انہی مجالس میں آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خوشنودی مزاج کا پتہ لگاتے، جو اُس کے یہ الفاظ ہیں۔

وآتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسلم علیہ و	میں رسول اللہ کے پاس آتا تھا اور سلام کرتا، اور آپ بعد نماز
هو فی مجلسه بعد الصلوٰة فاقول فی نفسی هل	کے اپنی مجلس میں ہوتے تھے تو میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ
حرّك شفتيه برد السلام ام لا[2]	آپ نے جواب سلام میں اپنے لب ہلائے یا نہیں۔

صبح کی مجلسوں میں کبھی کبھی آپ وعظ فرماتے، ترمذی اور ابوداؤد میں عرباض بن ساریہ سے روایت ہے؛

وعظنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما بعد	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد
صلوٰة الغداة موعظة بليغة ذرفت منها	ایک بلیغ وعظ کہا، جس سے آنکھیں اشک ریز ہوگئیں اور
العيون ووجلت منها القلوب[3]	دل کانپ اُٹھے

[1] صحیح بخاری کتاب العلم صفحہ ۱۴ [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۳۲ حدیث کعب بن مالک، [3] ترمذی صفحہ ۴۴

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی، اُس میں وعظ و نصیحت اور اس قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ خاص طور پر حقایق و معارف کے اظہار کے لیے مجالس منعقد فرماتے تھے، یہی مجالس ہیں جن کی نسبت احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں،

کان یوماً بارزاً للناس[1]، آنحضرت صلعم ایکدن عام طور پر لوگوں کے لیے باہر نکلے تھے،

چونکہ افادہ عام ہوتا تھا، اس لیے آپ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے اس بنا پر جو لوگ ان مجالس میں آکر واپس چلے جاتے، اُن پر آپ نہایت ناراض ہوتے تھے، آپ ایک مرتبہ صحابہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ تین شخص آئے، ایک صاحب حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی وہیں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہیں ملا، اس لیے سب کے پیچھے بیٹھے، لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی، خدا نے اُس کو بھی پناہ دی، ایک نے حیا کی، خدا بھی اُس سے شرمایا، ایک نے خدا سے مُنھ پھیرا خدا نے اس سے بھی مُنھ پھیر لیا[2]،

پند و نصائح کتنے ہی موثر طریقہ سے بیان کیے جائیں لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اکتا جاتا ہے، اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دیکر منعقد فرماتے تھے، بخاری میں ابن مسعود سے روایت ہے،

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بالموعظۃ فی الایام کراھۃ السآمۃ علینا، آنحضرت صلعم ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں،

عورتوں کے لیے مخصوص مجلس | ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا، اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا اس بنا پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لیے خاص دن مقرر فرمایا جائے، آنحضرت صلعم نے یہ درخواست منظور کی اور اُن کے وعظ و ارشاد کے لیے ایک خاص دن مقرر ہو گیا[3]،

---

[1] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۲ [2] بخاری جلد اصفحہ ۲ کتاب العلم، [3] بخاری کتاب العلم،

اگرچہ مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی، اور خواتین تک جو وہ مسائل دریافت کرتی تھیں جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلس عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا تو فرطِ حیا سے آپ کو ناگوار ہوتا،

اس قسم کی پردے کی بات مرد بھی مجمعِ عام میں پوچھتے تو آپ کو تکدّر ہوتا، ایک دفعہ ایک انصاری نے (جنکا نام عاصم تھا) مجلسِ عام میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو غیر کے ساتھ دیکھ لے تو کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلعم کو ناگوار ہوا، اور آپ نے انکو ملامت کی[۱])

طریقۂ ارشاد | (کبھی کبھی آپ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے، اس سے لوگوں کی جودتِ فکر اور اصابتِ رائے کا اندازہ ہوتا، حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ نے پوچھا، وہ کونسا درخت ہے جسکے پتے جھڑتے نہیں، اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے، لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا، میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہوگا، لیکن میں کمسن تھا اس لیے جرأت نہ کر سکا، بالآخر لوگوں نے عرض کی کہ حضور بتائیں، ارشاد فرمایا "کھجور"، عبداللہ بن عمر کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کرکے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا[۲]،

ایک روز آپ مسجد میں تشریف لائے، صحابہ کے دو حلقے قائم تھے، ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا، اور دوسرے حلقہ میں علمی باتیں ہو رہی تھیں، آپ نے فرمایا دونوں عمل خیر کر رہے ہیں، لیکن خدا نے مجکو صرف معلّم بنا کر مبعوث کیا ہے، یہ کہکر علمی حلقہ میں بیٹھ گئے[۳]،

اِن مجالس میں دقیق مباحث کو جنکی تہ تک عوام نہیں پہنچ سکتے ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ صحابہ کی مجلس میں مسئلہ تقدیر پر گفتگو ہو رہی تھی، آپ نے ساتو حجرے سے نکل آئے، آپ کا چہرہ اس قدر سُرخ ہو گیا تھا گویا عارض مبارک پر کسی نے انار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں، آپ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کیا تم اسی لیے پیدا کیے گئے ہو؟ قرآن کو باہم ٹکرا رہے ہو، گذشتہ اُمتیں انہی باتوں سے برباد ہوئیں[۳]،

---

[۱] بخاری کتاب العلم، [۲] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۱ باب فضل العلماء، [۳] سنن ابن ماجہ صفحہ ۹ باب القدر،

اِن مجالس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صحابہ جن مسائل میں باہم اختلاف کرتے آنحضرت صلعم ان کا صحیح فیصلہ کر دیتے، مثلاً شہرت طلبی، اور جاہ پرستی خلوص عمل کے منافی سمجھی جاتی ہے، اور خود صحابہ کے زمانے میں بھی سمجھی جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلعم کی مجلس میں دو شخصوں نے اس مسئلہ میں گفتگو کی، ایک نے کہا اگر ہم نے دشمن سے مقابلہ کیا، اور ایک شخص نے فخریہ یہ کہکے سر مارا کہ "میرا وار لیجیو میں غفاری جوان ہوں"، تو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مخاطب نے جواب دیا میری رائے میں کچھ ثواب نہ ملے گا، تیسرے آدمی نے یہ گفتگو سنکر کہا میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں، اس پر دونوں میں اختلاف ہوا، آنحضرت صلعم نے انکی گفتگو سنی تو فرمایا، ثواب اور شہرت دونوں میں کوئی مخالفت نہیں[1]۔

عام خیال یہ تھا کہ قوائے عملیہ کے بیکار کر دینے کا نام تقدیر ہے، تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوگا اس کو کوئی عملی طاقت مٹا نہیں سکتی، لیکن آنحضرت صلعم نے ایک مجلس میں جو اتفاقاً منعقد ہو گئی تھی، اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں، انسان کو خدا جن اعمال کی توفیق دیتا ہے وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں، اس لیے توکل قوتِ عمل کے بیکار کر دینے کا نام نہیں، چنانچہ صحابہ ایک جنازہ میں شریک تھے، آنحضرت صلعم تشریف لائے اور صحابہ جمع ہو گئے آپکے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس سے زمین کریدنے لگے، پھر فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جسکی جگہ جنت یا دوزخ میں لکھی نہ جا چکی ہو، ایک شخص نے کہا تو ہم اپنی تقدیر پر توکل کر کے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں، جو شخص سعادت مند ہوگا، وہ خود بخود سعادتمندوں میں داخل ہو جائے گا، اور جو شخص بدبخت ہوگا وہ بدبختوں سے ملجائے گا، آپ نے فرمایا سعادتمند وہ لوگ ہیں جنکو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دیجاتی ہے، اور بدبخت وہ ہیں جنکے لیے شقاوت کے کام کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں[2])

مجالس میں شگفتہ مزاجی باوجود اس کے کہ اِن مجالس میں صرف ہدایت، ارشاد، اخلاق اور تزکیہ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں، اور صحابہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں اسطرح بیٹھتے تھے، کَاَنَّ الطَّیْرَ فَوْقَ رُؤُسِهِمْ تاہم یہ مجلسیں شگفتہ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں، ایک دن آپ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۱۳، [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۳۰۸، تفسیر وکذب بالحسنیٰ،

شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا کیا تمہاری خواہش پوری نہیں ہوئی ہے، اس نے کہا ہاں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی طیار ہو جائے، چنانچہ اُس نے بیج ڈالے، فوراً دانہ اُگا، بڑھا، اور کاٹنے کے قابل ہو گیا، ایک بدّو بیٹھا ہوا تھا، اُس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہوگی جو زراعت پیشہ ہیں، لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپ ہنس پڑے[1]،

ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ میں تباہ ہو گیا، ارشاد ہوا کیوں، بولے میں نے رمضان میں بیوی سے ہمبستری کی، آپ نے فرمایا ایک غلام آزاد کرو، بولے غریب ہوں غلام کہاں سے لاؤں، ارشاد ہوا دو مہینے کے روزے رکھو، بولے، یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا، فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، بولے اتنا مقدور نہیں، اتفاق سے کہیں سے زنبیل بھر کر کھجوریں آگئیں، آپ نے فرمایا لو غریبوں کو خیرات کر آؤ، عرض کی اُس خدا کی قسم جسنے آپ کو پیغمبر بنایا، سارے مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں، آپ بیساختہ ہنس پڑے، اور فرمایا اچھا تم خود ہی کھالو[2])

فیض صحبت (ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے، آپ نے فرمایا اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے[3]

ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمت اقدس میں آئے اور کہا یا رسول اللہ میں منافق ہو گیا، میں جب خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور آپ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن بال بچوں میں آکر سب بھول جاتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے[4])

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۱ باب کلام الرب مع اہل الجنۃ [2] بخاری صفحہ ۸ باب نفقۃ المعسر علی اہلہ۔ [3] ترمذی شریف باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ ونعیمہا، امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث قوی نہیں۔ [4] ترمذی ابواب الزہد۔

خطابتِ نبوی

(خطابت[۱] اور تقریر، نبوت کا نہایت ضروری عنصر ہے، اسی بنا پر جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا تو ان کو یہ دعا مانگنی پڑی،

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي خداوندا میری زبان کی گرہ کھول کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

لیکن سید الانبیاء کو خود بارگاہ الٰہی سے یہ وصف کامل عطا کیا گیا تھا، چنانچہ آپ نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا،

انا افصح العرب، میں فصیح ترین عرب ہوں،

بُعثتُ بجوامع الکلم میں کلمات جامعہ لیکر مبعوث ہوا ہوں،

عرب میں اگرچہ ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت کا مدعی تھا، تاہم تمام عرب میں دو قبیلے اس وصف میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، قریش اور ہوازن، قریش خود آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا قبیلہ تھا، اور ہوازن کے قبیلہ میں آپ نے پرورش پائی تھی، اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا ہے،

انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر[۲] میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں، اور میری زبان بنو سعد[۳] کی زبان ہے،

طرز بیان آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے، آپ جب اپنے حجرے سے خطبہ دینے کے لیے نکلتے تھے، تو سلاطین کی طرح نہ آپ کے ساتھ حاشیہ نشین ہوتے تھے، نہ آپ خطباء کا لباس پہنتے تھے، ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا، اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے[۴] اس بنا پر کہ مسجد میں جب آپ خطبہ دیتے تو دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا، اور میدان جنگ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے،

۱؎ اصابہ باحم باب، ۲؎ طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۱، ۳؎ بنو سعد قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے ۴؎ ابوداؤد جلد اول کتاب الصلوٰۃ ابواب الجمعۃ والخطبۃ علی قوس

جمعہ اور عید کا خطبہ تو متعین تھا لیکن اسکے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، جب ضرورت پیش آتی، آپ فی البدیہہ خطبہ کے لیے تیار ہو جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے زمین پر منبر پر، اونٹ پر جس جگہ جیسا موقع پیش آیا ہے خطبہ دیا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپ کو کبھی کبھی طویل خطبہ بھی دینا پڑتا تھا تاہم آپکے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے، عام نصائح اور پند کی باتیں گو آپ اخباری فقروں میں بیان فرماتے لیکن جب کلام کو خاص طور پر مؤثر بنانا ہوتا تھا تو خطبہ کو عموماً سوال کی صورت میں شروع فرماتے تھے، غزوہ حنین میں آپ نے انصار کے سامنے جو خطبہ دیا وہ اول سے آخر تک سوال وجواب ہے، خطبۂ حجۃ الوداع وغیرہ اور تمام خطبات میں جیسا کہ آگے آتا ہے یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ جوشِ بیان کا یہ حال تھا کہ آنکھیں سرخ اور آواز نہایت بلند ہو جاتی تھی غصہ بڑھ جاتا تھا، انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی فوج کو جنگ کے لیے ابھار رہے ہیں[1]، جوش بیان میں جسد مبارک جھوم جھوم جاتا تھا[2]، ہاتوں کو حرکت دینے سے پٹھوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی[3]، کبھی مٹھی بند کر لیتے تھے، کبھی کھول دیتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر نے اس قسم کی یہ جوش حالت کی نہایت صحیح تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

سمعت رسول اللہ صلعم علی المنبر یقول یأخذ الجبار سمواتہ وارضہ بیدہ وقبض یدہ فجعل یقبضہا ویبسطہا قال ویتمایل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن یمینہ وعن شمالہ حتی نظرت الی المنبر یتحرک من اسفل شیء منہ حتی انی لاقول اساقط ہو برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن ماجہ ذکر البعث)

آنحضرت کو منبر پر خطبہ دیتے سنا، فرما رہے تھے کہ خداوند صاحب جبروت آسمان و زمین کو اپنے ہاتھ میں لے لیگا، یہ بیان کرتے ہوئے آپ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے آپ کا جسم مبارک کبھی دائیں کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو اس کا سب سے نچلا حصہ بھی اس قدر ہل رہا تھا کہ میں نے خیال کیا کہ آپ کو لے کر گر تو نہیں پڑے گا

آنحضرت کی خطابت کی نوعیت احادیث کی کتابوں میں آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے خطبات اور اُسکے جستہ جستہ

---

[1] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوۃ والخطبہ صفحہ ۳۱۹ جلد اول [2] ابن ماجہ ذکر البعث [3] مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲ ۸ ،

فقرے بغیر کسی خاص ترتیب کے جمع کردیئے گئے ہیں لیکن آنحضرت صلعم کی مختلف حیثیتیں تھیں، اور اس کا اثر آپ کے طرز بیان پر پڑتا تھا، آپ داعی مذہب تھے، فاتح تھے، واعظ تھے، امیر الجیش تھے، قاضی تھے، پیغمبر تھے، اِس اختلافِ حیثیت نے آپ کے خطبات اور طرز بیان میں نہایت اختلاف پیدا کردیا ہے، اور بلاغت کا اقتضا بھی یہی ہے، آپ بحیثیت داعی مذہب ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے اُس میں نہایت زور اور جوش پیدا ہوجاتا تھا، اور اُسوقت آپ کی حیثیت بالکل ایک امیر الجیش کی ہوتی تھی، چنانچہ جسوقت یہ آیت نازل ہوئی،

وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ — اپنے اقربا کو ڈراؤ،

آپ نے تمام قریش کو جمع کرکے ایک خطبہ دینا چاہا، **ابولہب** کی شقاوت نے اگرچہ اس خطبہ کو پورا نہیں ہونے دیا، تاہم آپ کی زبان سے اس موقع پر جو چند جملے نکل گئے اُس سے آپ کے زور بیان کا اندازہ ہوسکتا ہے، آپ نے صفا پر چڑھ کر پہلے پکارا "یا صباحاہ" یہ وہ لفظ ہے جو عرب میں اُسوقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ کسی قبیلہ پر دفعۃً غارتگری کے لیے ٹوٹ پڑتا ہے، تمام لوگ یہ لفظ سنکر چونک اُٹھے اور آپ کے گرد جمع ہوگئے، آپ نے فرمایا،

أرأيتم إن أخبرتكم أن خيلا تخرج من سفح هذا الجبل أكنتم مصدّقيّ — بتاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو کیا تم میری تصدیق کروگے،

سب نے جواب دیا، اب تک آپ کی نسبت ہمکو کسی قسم کی دروغگوئی کا تجربہ نہیں ہوا ہے، جب آپ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا،

إِنِّي نَذِيرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ — میں تمہیں ایک ایسے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے،

ابولہب نے نہایت استخفاف کے ساتھ کہا، کیا ہم سبھوں کو اسی لیے جمع کیا تھا، یہ کہکر چل کھڑا ہوا،[1]

غزوۂ حنین میں آپ نے تمام مال غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دیدیا اور انصار بالکل محروم رہ گئے، تو چند نوجوانوں کو

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۴۳ تفسیر سورۂ تبت،

یہ نہایت ناگوار ہوا، اور انھوں نے کہا "خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، قریش کو دیتا ہے اور ہمکو چھوڑ دیتا ہے، حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے" آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو تمام انصار کو ایک خیمہ میں جمع کرکے اصل حقیقت دریافت فرمائی لوگوں نے کہا "چند نوجوانوں نے یہ کہا ہے، لیکن ہم میں جو لوگ صاحب الرائے اور سردار ہیں انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا" اب آپ نے اس موقع پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا،

یا معشر الانصار الم اجدکم ضلالا فهداکم	اے گروہ انصار کیا میں نے تمکو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے میری
الله بی وکنتم متفرقین فالفکم الله بی وعالة	وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم متفرق تھے، خدا نے میری
فاغناکم الله بی،	وجہ سے تمکو مجتمع کردیا، تم محتاج تھے خدا نے میری وجہ سے تمکو غنی کردیا

انصار ہر بات پر کہتے جاتے تھے، خدا اور اُس کا رسول بہت امین ہے" آپ نے فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمد! تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمہاری تکذیب کرتے تھے، ہم نے تمہاری تصدیق کی، تمہارا کوئی مددگار نہ تھا ہم نے تمہاری مدد کی، تم گھر سے نکالے ہوئے تھے، ہم نے تمکو گھر دیا، تم محتاج تھے، ہم نے تمہاری غمخواری کی" اِسکے بعد آپ نے اصل اعتراض کا جواب دیا،

اترضون ان یذهب الناس بالشاة والبعیر	کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لیکے جائیں اور
وتذهبون بالنبی الی رحالکم والله	تم اپنے گھروں میں خود پیغمبر کو لیکر جاؤ، خدا کی قسم تم لوگ جو لیکر واپس
لما تنقلبون به خیر مما ینقلبون	جاتے ہو وہ اُس سے بہتر ہے جسکو تمام لوگ لیکر جاتے ہیں

اِس پر تمام انصار پکار اُٹھے "رضینا" یعنی ہم سب راضی ہیں[1]۔

اس خطبہ کے وجوہِ بلاغت پر اگر غور کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ طیار ہو سکتا ہے،

فاتحانہ حیثیت سے آپ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کے جستہ جستہ فقرے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، مکہ عرب کے نزدیک نہایت مقدس شہر تھا حرم ایک دار الامان تھا جس میں کبھی خونریزی

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین۔

نہیں ہوسکتی تھی، فتح مکہ میں سب سے پہلے اُسکے دامنِ عظمت پر خون کا دھبّہ لگایا گیا، اور چونکہ مذہب کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا، اس لیے خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس کا یہ احترام نہ مٹ جائے، آنحضرت صلعم کو انہی دونوں پہلوؤں پر اپنی تقریر میں زور دینا تھا، چنانچہ آپ نے ترتیباً انہی کی طرف توجہ کی، سب سے پہلے آپ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا،

ان اللہ حرم مکۃ یوم خلق السموات والارض فھی حرام بحرام اللہ الی یوم القیمۃ لم تحل لاحد قبلی ولا تحل لاحد بعدی ولم تحلل لی قط الا ساعۃ من الدھر لا ینفر صیدھا ولا یعضد شوکھا ولا یختلی خلاھا ولا تحل لقطتھا الا لمنشد۔

خدا نے جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اُسی دن مکہ کو حرام کردیا، پس وہ بہ حرمت خدا حرام ہے، وہ مجھ سے پہلے نہ کسی پر حلال ہوا، اور نہ میرے بعد حلال ہوگا، اور میرے لیے بھی بجز چند گھنٹوں کے ہرگز حلال نہیں ہوا، نہ اسکے شکار کو بدکایا جاسکتا، نہ اسکا کانٹا کاٹا جاسکتا نہ اسکی گھاس کاٹی جاسکتی نہ اسکی گم شدہ چیز حلال ہوسکتی بجز اس شخص کے جو اس کو ڈھونڈھ رہا ہے،

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا سب سے مہتم بالشان خطبہ وہ ہے جو آپ نے حجۃ الوداع میں دیا تھا، یہ خطبہ صرف احکام کا ایک سادہ مجموعہ ہے، جس کو قدرۃً خشک اور رُوکھا پھیکا ہونا چاہیے، تاہم سلاست، روانی، اور شستگی الفاظ کے لحاظ سے یہ خطبہ بھی اور خطبوں سے کم نہیں آپ نے حمد و نعت کے بعد اس خطبہ کی اہمیت اس طرح ظاہر کی،

ایھا الناس اسمعوا فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا فی موقفی ھذا، فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا،

لوگو سنو! کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ، اس مہینہ میں اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں۔

سادہ سا جملہ یہ تھا کہ ’غالباً یہ میری عمر کا آخری سال ہے‘ لیکن اس تفصیل اور اس پیرایۂ بیان نے اس مفہوم کو اور بھی زوردار بنادیا ہے، آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عزت، آبرو، جان، مال، سب مسلمانوں پر حرام ہے، اس مطلب کو اس بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے،

اتدرون ای یوم ھذا؟ قالوا اللہ ورسولہ	کیا جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور
اعلم قال فان ھذا یوم حرام افتدرون	رسول کو اس کا علم ہے آپ نے فرمایا یہ یوم الحرام ہے،
ای بلد ھذا، قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال	کیا جانتے ہو یہ کونسا شہر ہے لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو
بلد حرام قال اتدرون ای شہر ھذا قالوا	اسکا علم ہے آپ نے فرمایا بلد الحرام ہے، کیا جانتے ہو یہ کونسا مہینہ ہے؟ لوگوں
اللہ ورسولہ اعلم قال شہر حرام،	نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپ نے فرمایا شہر حرام ہے،

اِس طرح جب لوگوں کے دل میں اس دن، اس مہینہ اور اس شہر کی حرمت کا خیال تازہ ہوگیا تو آپ نے اصل مقصود کو بیان فرمایا،

ان اللہ حرم علیکم دماءکم واموالکم واعراضکم	خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو تم پر اس
کحرمۃ یومکم ھذا فی شہرکم ھذا فی بلدکم	مہینہ میں اس شہر میں اس دن کی حرمت کی
ھذا، لا ترجعوا بعدی کفارًا یضرب بعضکم	طرح حرام کیا میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ تم میں
رقاب بعض،	ہر ایک دوسرے کی گردن مارے۔

آپ نے ان الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہے۔

ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم من آدم	تمہارا خدا ایک، تمہارا باپ ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم
وآدم من تراب اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِندَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ	مٹی کے تھے خدا کے نزدیک تم میں شریف تر وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

عرب کا عام ذریعۂ معاش غارت گری تھی، لیکن شہر حرم کے چار مہینے تک وہ لوگ بیکار نہیں رہ سکتے تھے اسلیے ان مہینوں کو ادل بدل کیا کرتے تھے جسکو نسئی کہتے ہیں، قرآن مجید نے اسکی ممانعت کی،

اِنَّمَا النَّسِیْءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ	نسئی کفر میں اضافہ کرتی ہے

آپ نے اپنے خطبہ میں اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا۔

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ	زمانہ پھر پھر کے پھر اسی مرکز پر آگیا جیسا کہ اس دن تھا

السمٰوات والارض	جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا،

ان حیثیتوں کے علاوہ آپ کی حیثیت ایک معلم اور واعظ کی تھی، آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیے ہیں وہ اگرچہ نہایت سادہ ہیں تاہم اُن میں بھی بلاغت کا اسلوب موجود ہے، ایک اخلاقی واعظ کے لیے پیچدار ترکیب، تہ دار الفاظ، اور تشبیہ و استعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اُسکو صرف سادہ الفاظ، واضح جملے اور مختصر ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں، وہ تمامتر اسی قسم کے ہیں، مدینہ آکر سب سے پہلا فقرہ جو زبانِ مبارک سے نکلا، یہ تھا،

یا ایھا الناس، افشوا السلام، واطعموا الطعام، و	لوگو! سلام پھیلاؤ، کھانا کھلایا کرو، نماز پڑھا کرو، جب اور لوگ
صلوا والناس نیام، تدخلوا الجنۃ بسلام،	سوتے ہوں، جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے،

مدینہ میں جو سب سے پہلا جمعہ آپ نے پڑھا ہے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حمد و ثنا کے بعد اُس میں آپ نے یہ خطبہ دیا تھا،

اما بعد ایھا الناس فقدموا لانفسکم تعلمنّ واللہ	حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! اپنے لیے پہلے سے سامان کر لو، تم کو معلوم
لیصعقن احدکم ثم لیدعن غنمہ لیس لھا	ہو جائیگا، کہ خدا کی قسم تم میں سے ایک ایک بے ہوش و حواس کھو چکے گا، اور اپنی
راع ثم لیقولن لہ ربّہ لیس لہ ترجمان ولا	بکریوں (مال و دولت) کو چھوڑ جائیگا، جن کا کوئی نگہبان نہ ہوگا۔ پھر خدا
حاجب یحجبہ دونہ الم یاتک رسولی فبلغک	اُس کے لیے جس میں نہ کوئی ترجمان ہے نہ دربان ہے خود روکے گا، اس سے
وآتیتک مالا وافضلت علیک فما قدمت	کہیگا کہ کیا میرے پاس میرا فرستادہ نہیں آیا، اور میرا پیغام نہیں
لنفسک، فلینظرنّ یمینا وشمالا فلا یری	پہنچایا، اور میں نے تجھکو دولت نہیں دی اور حاجت سے
شیئا ثم لینظرنّ قدامہ فلا یری غیر	زیادہ نہیں عطا کیا، تو تو نے اپنے لیے پہلے سے کیا سامان کیا
جھنّم فمن استطاع ان یقی وجھہ من النار	اُس وقت وہ داہنے بائیں دیکھیگا تو اسکو کچھ نظر نہیں آئیگا پھر سامنے دیکھے گا
ولو بشقٍ من تمرۃٍ فلیفعل ومن لم یجد فبکلمۃٍ	تو جہنم کے سوا اسکو کوئی چیز نظر نہیں آئیگی پس جسکو قدرت ہو وہ اپنے کو اس
طیبۃٍ فانھا تجزی الحسنۃ بعشر امثالھا الی	آگ سے بچائے گو چھوہارے کے ایک ٹکڑہ ہی سے کیوں نہ ہو کسی کے پاس یہ بھی نہ ہو

سبعمائة ضعف، والسلام عليكم ورحمة الله	وایک اچھی اور حسن اخلاق کی بات ہی سے کیونکہ ایک نیکی کا بدلہ دہ گونہ بلکہ
وبركاته،	ہفتصد گونہ دیا جائیگا، تم پر خدا کی سلامتی اور اُسکی رحمت و برکت نازل ہو،

اسکے بعد دوسری دفعہ آپ نے فرمایا،

الحمد لله أحمده وأستعينه ونعوذ بالله من شرور	خدا کی حمد ہو، میں خدا کی حمد کرتا ہوں اور اس کے دامن میں اپنے نفس
أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا	کی بُرائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں جسکو خدا
مضلّ له ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا	ہدایت دے اسکو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور جسکو وہ ہدایت نہ کرے اُسکی
إله إلا الله وحده لا شريك له، إن أحسن	کوئی رہنمائی کر سکتا نہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود
الحديث كتاب الله قد أفلح من زيّنه الله في	نہیں، وہی تنہا ہے کوئی اس کا شریک نہیں بہترین کلام خدا کی کتاب
قلبه وأدخله في الإسلام بعد الكفر واختاره	ہے، کامیاب ہوا وہ جسکے دلکو خدا نے اس سے آراستہ کیا، اور اس کو کفر کے
على ما سواه من أحاديث الناس إنه أحسن	بعد اسلام میں داخل کیا انسانوں کی باتوں کو چھوڑ کر خدا کے کلام کو پسند
الحديث وأبلغه، أحبّوا ما أحبّ الله، أحبّوا الله	کیا، کیونکہ خدا کا کلام سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ پُر اثر ہے جسکو
من كل قلوبكم ولا تملّوا كلام الله وذكره	خدا دوست رکھتا ہے تم بھی دوست رکھو، اور خدا کو دل سے پیار کرو، اور اُسکے
ولا تقس عنه قلوبكم فاعبدوا الله ولا تشركوا به	کلام اور ذکر سے کبھی نہ تھکو، اور تمہارے دل اُسکی طرف سے سخت نہوں،
شيئاً واتقوه حق تقاته وصدقوا الله صالح ما	بس خدا ہی کو پوجو اور کسی کو اسکا ساجھی نہ بناؤ، اور اُس سے ڈرو جیسا کہ
تقولون بأفواهكم وتحابّوا بروح الله بينكم إن	ڈرنے کا حق ہے، اور خدا سے سچی بات کہو، اور آپس میں ایک دوسرے کو ذات الٰہی
الله يغضب أن ينكث عهده، والسلام عليكم	کے واسطہ سے پیار کرو، خدا اس سے ناراض ہوتا ہے کہ کوئی اسکے عہد کو توڑا
ورحمة الله وبركاته،	کرے تم پر خدا کی سلامتی اور رحمت اور برکت نازل ہو۔

ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے خطبہ دیا جس میں صرف پانچ باتیں بیان کیں۔

إن الله لا ينام ولا ينبغي له أن ينام، يخفض القسط	ہاں خدا سوتا نہیں اور نہ سونا اسکی ذات کے شایاں شان ہے

ويرفعه، يرفع إليه عمل الليل قبل عمل النهار
وعمل النهار قبل عمل الليل، حجابه النور (صحیح مسلم روایۃ ابو موسیٰ)

وہی پست کو پست و بلند کرتا ہے رات کے اعمال اسکو دن سے پہلے پہنچ
جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات سے پہلے خدا کا پردہ نور ہے۔

جمعہ کے خطبہ میں عموماً زہد و رقاق، حسنِ اخلاق، خوفِ قیامت، عذابِ قبر، توحید و صفاتِ الٰہی بیان کرتے تھے، ہفتہ میں کوئی مہتم بالشان واقعہ پیش آتا تھا تو اُسکے متعلق ہدایات فرماتے تھے، اکثر ایسا بھی کرتے کہ خطبہ کے بجائے قرآن مجید کی کوئی انہیں مضامین کی سورتیں سورت **ق** وغیرہ پڑھ دیا کرتے، یہ سورہ آپ جمعہ کے خطبہ میں اکثر اور بیشتر پڑھا کرتے تھے، عید کے خطبہ میں ان مضامین کے علاوہ **صدقہ** پر خاص طور پر زور دیتے تھے، اتفاقی خطبے ضرورت کے موقعوں پر دیا کرتے تھے اور ان میں مقتضائے وقت کے مناسب مطالب بیان فرماتے تھے، ایک دفعہ آفتاب میں گہن لگا، اتفاق سے اسی دن آپکے کمسن فرزند حضرت ابراہیم نے وفات پائی تھی، مزعومات عرب کے مطابق لوگوں نے کہا کہ یہ گہن اسی لیے لگا ہے، آپ نے اس موقع پر حسب ذیل خطبہ دیا

أما بعد يا أيها الناس إنما الشمس والقمر آيتان من
آيات الله وإنهما لا ينكسفان لموت أحد من الناس،
ما من شيء لم أكن رأيته إلا قد رأيته في مقامي
هذا حتى الجنة والنار، وإنه قد أوحي إلي أنكم
تفتنون في القبور مثل فتنة الدجال فيؤتى
أحدكم فيقال ما علمك بهذا الرجل فأما المؤمن
فيقول هو محمد هو رسول الله جاء بالبينات
والهدى فأجبنا وأطعنا، أما المرتاب فيقول
لا أدري سمعت الناس يقولون شيئا فقلت،
إنه عرض علي كل شيء تولجونه فعرضت علي
الجنة حتى لو تناولت منها قطفا أخذته فقصرت

حمد و ثنا کے بعد، لوگو! آفتاب و ماہتاب خدا کی دو نشانیاں ہیں وہ
کسی کے مرنے سے تاریک نہیں ہوتے،
جن چیزوں کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، اسکو یہیں دیکھ لیا یہاں تک
کہ جنت و دوزخ کو بھی، اور ہاں مجھے وحی کی گئی ہے کہ تم قبروں میں
آزمائے جاؤگے جس طرح دجال سے آزمائے جاؤگے، تم میں سے ہر شخص
کے پاس ایک آنیوالا آئیگا اور پوچھے گا کہ اس شخص (یعنی خود آنحضرت
صلعم) کی نسبت کیا جانتے ہو، یقین والے کہیں گے یہ محمد ہیں یہ خدا کے رسول
ہیں جو نشانیاں اور ہدایتیں لیکر آئے، تو ہم نے انکو قبول کیا اور انکی پیروی
کی اور مشکک کہیں گے میں نہیں جانتا لوگوں کو جو کہتے سنا وہ کہدیا،
میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جنمیں تم داخل ہوگے، تا آنکہ اگر
میں چاہتا تو اسکا پھل توڑ لیتا لیکن میرے ہاتھ رک گئے دوزخ میرے سامنے روکا

...لذي عنه وعرضت علي النار فرأيت فيها امرأة تعذب في هرة لها ربطتها فلم تطعمها ولم تدعها تأكل من خشاش الأرض، ورأيت أبا ثمامة عمرو بن مالك يجر قصبه في النار وإنهم كانوا يقولون إن الشمس والقمر لا يخسفان إلا لموت عظيم وإنهما آيتان من آيات الله يريكموهما فإذا خسفا فصلوا حتى تنجلي[1]،

کی گئی میں نے اس میں ایک عورت کو دیکھا جسکو صرف اس لیے سزا دی جارہی تھی کہ اُسنے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، نہ اسکو خود کھلاتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین کی گری پڑی کوئی چیز کھائے میں نے دوزخ میں ابوثمامہ عمرو بن مالک کو دیکھا یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب و ماہتاب میں کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے حالانکہ وہ تو خدا کی دو نشانیاں ہیں جب تم گہن دیکھو نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ، تا آنکہ وہ صاف ہو جائے

ردّ بدعت اور اعتصام بالسنة میں آپکا یہ مختصر خطبہ بتغیر الفاظ حدیث کی اکثر کتابوں میں منقول ہے۔

أما بعد فإن خير الكلام كلام الله وأحسن الهدي هدي محمد ألا وإياكم ومحدثات الأمور فإن شر الأمور محدثاتها وكل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة ألا لا يطولن عليكم الأمد فتقسو قلوبكم ألا إن ما هو آت قريب وإن البعيد ما ليس بآت ألا إنما الشقي من شقي في بطن أمه والسعيد من وعظ بغيره ألا إن قتال المؤمن كفر وسبابه فسوق ولا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث ألا وإياكم والكذب۔ (ابن ماجه باب اجتناب البدع)

صرف دو باتیں ہیں، قول اور عملی طریقہ، تو عمدہ کلام خدا کا کلام ہے اور عمدہ طریقہ محمد کا طریقہ ہے، خبردار (مذہب میں) نئی باتوں سے بچو، نئی باتیں بدترین شر ہیں، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، تمکو درازیٔ عمر کا خیال نہ پیدا ہو کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں، جو چیز آنیوالی ہے وہ قریب ہے، دور وہ چیز ہے جو آنیوالی نہیں ہے، بدبخت ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت ہو جاتا ہے خوش نصیب وہ ہے جو غیر سے موعظت حاصل کرے خبردار مسلمان سے لڑنا کفر اور اس سے گالی گلوچ کرنا فسق ہے، مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے رنجیدہ رہے، ہاں خبردار جھوٹ سے پرہیز کرنا،

اثر انگیزی (خطبات نبوی تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزۂ الٰہی تھے، پتھر سے پتھر دل بھی ان کو سنکر چند لمحوں میں موم ہو جاتے تھے مکہ میں ایک دفعہ آپ نے سورۂ النجم کی آیتیں تلاوت کر کے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ آپ کے ساتھ مسلمان تو مسلمان بڑے بڑے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے[2]،

[1] صحیح مسلم روایات مختلفہ۔
[2] صحیح بخاری تفسیر والنجم

آنحضرت صلعم کے زمانۂ جاہلیت کے ایک دوست جو جھاڑ پھونک کرجانتے تھے یہ سنکر کہ نعوذ باللہ آپ کو جنون ہے بغرض علاج آئے، آپ نے اُن کے سامنے مختصر سی تقریر کی، انھوں نے کہا کہ محمد ذرا اس کو پھر تو دُہرانا، غرض آپ نے کئی بار تقریر دُہرائی تو اخیر میں انھوں نے کہا میں نے شاعروں کے قصیدے اور کاہنوں کے کلام سنے ہیں لیکن یہ تو چیز ہی اور ہے[1]

ایک دفعہ ایک نومسلم قبیلہ ہجرت کرکے مدینہ آیا، آپ نے انکی امداد کی ضرورت سمجھی، مسجد نبوی میں تمام مسلمان جمع ہوئے، تو آپ نے ایک خطبہ دیا، جس میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں یعنی

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ، — اے لوگو اُس خدا سے ڈرو جس نے ایک ہستی سے پیدا کیا۔

پھر سورۂ حشر کی یہ آیت تلاوت کی، وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ،

اسکے بعد فرمایا ”درہم، کپڑا، غلّہ، بلکہ چھوہارہ کا ایک ٹکڑا، جو ہو، راہ خدا میں دو“، مدینہ کے مسلمانوں کی مالی حالت جیسی کچھ تھی وہ سیرت کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے، لیکن با ایں ہمہ آپ کی رقت انگیز اور موثر تقریر سے یہ عالم پیدا ہوگیا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا اس نے سامنے رکھدیا، بعضوں نے اپنے کپڑے اُتار دیے، کسی نے گھر کا غلہ لاکر دیدیا، ایک انصاری گئے اور گھر سے اشرفیوں کا ایک توڑا اُٹھا لائے، جو اس قدر بھاری تھا کہ مشکل اُس سے اُٹھ سکتا تھا راوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کے سامنے غلہ، اور کپڑے کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے، اور خوشی سے آپکا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا[2]،

سخت سے سخت اشتعال انگیز اوقات میں آپکے چند فقرے معاملہ کو رفع دفع کرکے جوش محبت کا دریا بہا دیتے تھے، **اوس** و **خزرج** کی سالہا سال کی عداوتیں اسی اعجاز کی بدولت مبدل بہ محبت ہوگئیں، غزوہ بدر سے پہلے ایک دفعہ آپ سوار ہوکر نکلے، مسلمان اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے، مسلمانوں نے تو ادب سے سلام کیا لیکن منافقین نے ایک گستاخانہ فقرہ استعمال کیا، یہ چنگاری تھی جس نے حرمن میں آگ لگا دی، قریب تھا کہ جنگ وجدل

[1] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ وقصر الخطبہ، [2] صحیح مسلم باب الصدقہ،

برپا ہوجائے، لیکن آپ کے چند فقروں نے اس آگ پر پانی ڈال دیا[1]

غزوۂ مصطلق سے واپسی میں ایک واقعہ پر بعض منافقین نے اشتعال پیدا کیا اور بہت ممکن تھا کہ مہاجرین و انصار باہم دست و گریباں ہوجائیں، کہ عین وقت پر آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی، آپ تشریف لائے تو اس طرح تقریر فرمائی کہ چند لمحوں میں مہاجرین و انصار[2] پھر شیر و شکر تھے، واقعۂ افک میں اوس و خزرج میں اسقدر اختلاف پیدا ہوا کہ خاص مسجد نبوی میں شاید تلواریں نیام سے نکل پڑتیں آپ منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھا، اور اثر یہ تھا کہ برادرانہ محبت کی لہریں پھر جاری[3] ہوگئیں۔

غزوۂ حنین میں مال غنیمت کی تقسیم پر جب انصار میں آزردگی پیدا ہوگئی تھی، اس وقت آپ نے جس بلیغانہ انداز میں تقریر فرمائی ہے اس کا مختصر ذکر اوپر گذر چکا ہے، اس تقریر کا اثر کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ وہی انصار جو چند لمحے پہلے کبیدہ خاطر ہورہے تھے، اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں تر ہوگئیں، اور دل کا سارا غبار آنسو کے ان قطروں سے دفعۃً دھل گیا[4]۔

فتح مکہ کے موقع پر انصار کی توقع کے خلاف، جب آپ نے رؤسائے قریش کی جاں بخشی فرمائی تو ان میں سے وہ لوگ جنکی آنکھوں میں **خلق محمدی** کا جلوہ نہ تھا، معترض ہوئے کہ "آخر آپ کو اپنے وطن و خاندان کی محبت آہی گئی،" آپ کو یہ معلوم ہوا تو تمام انصار کو جمع کرکے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا ہے؟ عرض کی ہاں یا رسول اللہ" فرمایا "وطن و خاندان کی پاسداری میرے مد نظر نہ تھی، میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں، میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی، اور تمہاری طرف اب میرا جینا تمہارا جینا ہے، اور میرا مرنا تمہارا مرنا ہے،" یہ سنکر انصار پر رقت طاری ہوگئی، اور رونے لگے

وعظ و نصیحت میں جو خطبات آپ ارشاد فرماتے تھے، وہ بھی اسی قدر موثر ہوتے تھے، ایک صحابی اس

---

[1] صحیح بخاری السلام علی جماعۃ فیہا المسلم والکافر، [2] صحیح بخاری تفسیر منافقین، وابن سعد غزوۂ مذکور [3] صحیح بخاری قصۂ افک
[4] صحیح مسلم فتح مکہ،

موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

وعظنا رسول اللہ صلعم یوماً بعد الصلوٰۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منھا العیون ووجلت منھا القلوب (ترمذی وابوداؤد)

صبح کی نماز کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دل ایسا موثر وعظ کہا کہ آنکھیں اشک ریز ہوگئیں، اور دل کانپ اُٹھے،

ایک اور مجلس وعظ کے تاثیر کی کیفیت حضرت اسماء بنت ابی بکر بیان کرتی ہیں

قام رسول اللہ صلعم خطیباً فذکر فتنۃ القبر التی یفتتن بھا المرء فلما ذکر ذلک ضج المسلمون ضجۃ[۱]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں فتنۂ قبر کو بیان کیا جس میں انسان کی آزمائش کی جائے گی جب یہ بیان کیا تو مسلمان چیخ اُٹھے

حضرت ابوہریرہ اور ابوسعید سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے، وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ "قسم ہے اُس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے" یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے، اور پھر جھک گئے، لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں سر جھکا کر رونے لگا، راوی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی ہوش نہ رہا کہ آپ قسم کس بات پر کھا رہے[۲] ہیں۔

---

[۱] صحیح بخاری باب ماجاء فی عذاب القبر [۲] نسائی کتاب الزکوٰۃ

عباداتِ نبوی

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

اے محمدؐ جب تجھے فرصت ملے عبادت کے لیے کھڑا ہوجا اور اپنے رب سے دل لگا،

(دنیا[1] میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں گذرا جس کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہوسکے کہ اُس کا طریقہ عبادت کیا تھا؟ اُس کے کون کون سے اوقات اس کے لیے مخصوص تھے؟ اور اُس کی عبادتوں کی نوعیت کیا تھی؟ گذشتہ انبیاءؑ میں حضرت نوحؑ، بلکہ آدمؑ سے لیکر حضرت موسیٰؑ تک جن کے حالات **توراۃ** میں مذکور ہیں ان کی رہ گئی کا یہ باب صحائف بنی اسرائیل سے قطعاً مفقود ہے، **انجیل** میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہیں کہیں صرف اس قدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے، لیکن جب کہ اِن مذاہب کے پیروؤں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی برتی ہے کہ یہ ضروری امور بھی جو دین و شریعت کا دارومدار ہیں وہ محفوظ نہیں رکھ سکے، پیروانِ اسلام کو یہ فخر ہے کہ اُنھوں نے اوّل سے آخر تک اپنے پیغمبر کے اوقاتِ عبادت، اُس کے طریقے، اُس کے انواع، اُسکی کیفیات، غرض اسکے ایک ایک جزئیات کو محفوظ رکھا ہے)

دعا اور نماز | (آنحضرت صلعم نبوت سے پہلے بھی عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے، اور غارِ حرا میں جاکر مہینوں قیام اور مراقبہ کرتے[2] تھے، نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کو نماز کا طریقہ بھی بتایا گیا، لیکن چونکہ کفارِ قریش کا ڈر تھا، اس لیے چھپکر نماز ادا کرتے تھے، نماز کا وقت جب آتا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے، اور وہاں نماز پڑھ لیتے، ایک دفعہ آپ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے ابو طالب آنکلے، انھوں نے دیکھا تو پوچھا "بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے ہو، آپ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی[3]۔

چاشت کی نماز آپ سب کے سامنے حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں[4] بھی جائز تھی

[1] اصابہ ناجم باب [2] صحیح بخاری باب بدء الوحی [3] مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۹۹، [4] ابن اثیر

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، اور رؤسائے قریش بیٹھے تمسخر کر رہے تھے، ابوجہل نے کہا کاش اسوقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا، اور محمدؐ جب سجدہ میں جاتے، تو وہ انکی گردن پر ڈال دیتا، چنانچہ اس تجویز کے مطابق یہ فرض عقبہ نے انجام دیا[1]، نماز میں جب آپ جہر سے قراءت فرماتے تو کفار بُرا بھلا کہتے[2]،

ایک دفعہ اور آپ حرم میں نماز ادا کر رہے تھے، بعض اشقیا نے چاہا کہ آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں[3]، ایک دفعہ ایک شقی نے گلے میں پھانسی[4] ڈال دی، لیکن با ایں ہمہ مزاحمت، لذت شناس یادِ الٰہی اپنے فرض سے باز نہیں آتا تھا،

راتوں کو اُٹھ اٹھ کر آپ نمازیں پڑھا کرتے تھے، اس عبادت شبانہ کے متعلق مختلف صحابہ سے مختلف روایتیں ہیں ایک راوی کا بیان ہے کہ آپ رات بھر نماز میں کھڑے رہے، ام سلمہ کہتی ہیں کہ آپ کچھ دیر سوتے پھر کچھ دیر اُٹھکر نماز میں مصروف ہوتے، پھر سو جاتے پھر اُٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے، غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی ابن عباس کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپ اُٹھتے تھے، اور ۱۳ رکعتیں ادا کرتے تھے، حضرت عائشہ کی روایت ۹ رکعت کی ہے، محدثین نے ان سب میں یہ تطبیق دی ہے کہ آپ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ سے نماز ادا کرتے تھے، ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا[5] ہے، عام طور پر آخر میں آپ کا طرز عمل وہی تھا جو حضرت عائشہ اور ابن عباس کی زبانی، عبادت شبانہ کے عنوان میں گذر چکا ہے،

فرائض پنجگانہ کے علاوہ آپ کم از کم سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے، دو صبح، چار چاشت چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز، (حسب روایت حضرت عائشہ) دو مغرب، چھ عشاء، تیرہ تہجد، دو وتر ان کے علاوہ صلوۃ الاوّابین، سنت تحیتِ مسجد وغیرہ الگ تھیں، تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپ سختی سے

---

[1] صحیح بخاری باب الطہارۃ والصلوۃ [2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ بنی اسرائیل [3] ابن ہشام، ذکر قبل ہجرت، [4] صحیح بخاری باب ما لقی النبیؐ بمکۃ
[5] اس بحث کو زرقانی نے شرح مواہب میں مفصل لکھا ہے، جلد، صفحہ ۴۵۵۔

پابند[1] تھے، کسی وقت کی سنت خلاف معمول اگر چھوٹ جاتی تو اس کی قضا پڑھتے، حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اسکی ضرورت عام امت کے لیے نہیں، ایسا واقعہ حضر میں صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا ہے، ظہر و عصر کے درمیان ایک وفد خدمت اقدس میں باریاب ہوا جسکی وجہ سے آپ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے، نماز عصر کے بعد آپ نے بعض ازواج مطہرات کے حجروں میں جاکر دو رکعت نماز ادا کی، چونکہ یہ نماز بالکل خلاف معمول تھی، اس لیے ازواج مطہرات نے استفسار کیا، آپ نے واقعہ بیان فرمایا، عام امت کے لیے ایک نماز کی قضا ایک دفعہ کافی ہے لیکن چونکہ آپ جس خیر کو شروع کرتے تھے پھر اُس کو ترک کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے ام المومنین حضرت عائشہ اور ام سلمہ کا بیان ہے کہ آپ نے اس "قضا" کو تمام عمر ادا کیا[2]

رمضان کا مہینہ آپ کی عبادتوں کے لیے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا، حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ "آپ فیاض تو تھے ہی، لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا، اور جبرئیل قرآن سنانے آتے تو آپ کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہتی، آپ کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی[3]"، رمضان کے آخری عشرہ میں آپ اور زیادہ عبادت گذار ہو جاتے حضرت عائشہ کہتی ہیں، کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپ رات رات بھر بیدار رہتے تھے، ازواج سے بے تعلق ہو جاتے تھے، اہلبیت کو نماز کے لیے جگاتے تھے[4]، اس اخیر عشرہ میں آپ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے یعنی ہمہ وقت مسجد میں بیٹھکر یاد الٰہی اور عبادت گذاری میں مصروف[5] رہتے تھے،

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے، **ابو داؤد** کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشا کے بعد[6] تھا، روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی اُسی تعداد کے موافق آپ تلاوت کرلیا کرتے تھے، رمضان میں پورے قرآن کا دورہ کرتے[7] تھے پچھلی رات کو اٹھکر کوئی موثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے، حضرت **ابن عباس** کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپ پچھلے پہر بیدار ہوئے، آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے، رات کے سناٹے میں

---

[1] صحیح بخاری ابواب نوافل وسنن، [2] مسند احمد و ابو داود، وصحیح مسلم الرکعتان بعد العصر، [3] صحیح بخاری کتاب الصوم [4] ابو داؤد باب الصوم [5] صحیح بخاری باب الاعتکاف، [6] ابو داؤد ابواب شہر رمضان [7] صحیح بخاری بدء الوحی

ستارے جھلملا رہے تھے، آپ نے نظر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، اور یہ آیتیں پڑھیں[1]،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ
وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ
اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ
فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا
بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ
مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۖ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ
مِنْ أَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ
أَنْ اٰمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا
سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ
وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ
لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ
أَوْ أُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ
وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقٰتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝
(آل عمران)

آسمان اور زمین کی پیدائش، اور رات اور دن کے اختلاف میں اُن عقلمندوں
کے لیے نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کیا کرتے
ہیں اور آسمان زمین میں غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ (نظام عالم) بے نتیجہ
نہیں پیدا کیا تو پاک ہے بس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، خدایا، جس کو تو دوزخ
میں داخل کرے، اُسکو تو نے رسوا کر دیا، گناہگاروں کا کوئی مددگار نہیں
خداوندا ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی، جو پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے
پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے، خداوندا تو ہمارے گناہ بخش دے ہماری
بُرائیوں پر پردہ ڈال، اور نیکوں کے ساتھ ہم کو دنیا سے اُٹھا، خداوندا تو نے اپنے
رسولوں کے ذریعہ ہم سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے، وہ ہم کو عنایت کر اور قیامت کے دن
ہم کو رسوا نہ کرنا، تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، پروردگار نے پکار سن لی
اور دعا قبول کرلی کہ میں کسی کام کرنیوالے کے کام کو ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا
عورت تم ایک دوسرے سے ہو، جنھوں نے ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے اور میری
راہ میں ستائے گئے ہیں اور وہ لڑے ہیں اور مارے گئے ہیں، میں
اُن کے گناہوں کو مٹا دوں گا اور اُن کو جنت میں جگہ دوں گا،
جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اللہ کی طرف سے اُن کو یہ جزا ملے گی
اور اللہ ہی کے پاس اچھی جزا ہے۔

اسی موقع پر آپ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے جو سرتاپا اثر اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم صلوٰۃ اللیل۔

اللھم لک الحمد، انت نور السموات والارض ولک الحمد انت قیام السموات والارض ولک الحمد انت رب السموات والارض ومن فیھن انت الحق ووعدک الحق وقولک الحق ولقاءک حق والجنۃ حق، والنار حق، والساعۃ حق، اللھم لک اسلمتُ وبک آمنت وعلیک توکلت والیک انبت، وبک خاصمت و الیک حاکمت، فاغفر لی ما قدمت واخرت واسررت واعلنت انت الٰھی لا الٰہ الا انت،

(صحیح مسلم باب الدعاء فی صلوۃ اللیل)

خداوندا! تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین کا نور ہے، تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین کا وجود ہے، تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے، سب کا پروردگار ہے، تو حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت حق ہے، خداوندا میں نے تیرے ہی آستانے پر سر جھکایا ہے، تجھی پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، تیرے ہی زور سے جھگڑتا ہوں، تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور پچھلا، کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف کر، تو ہی میرا معبود ہے تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے، آپ چپ چاپ بستر سے اُٹھتے اور دعا ومناجات الٰہی میں مصروف ہو جاتے حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپ کو بستر پر نہ پایا سمجھی کہ آپ کسی اور بیوی کے حجرہ میں تشریف لے گئے، اندھیرے میں ہاتھ سے اِدھر اُدھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے، اور آپ سر بسجود دعا میں مصروف ہیں، یہ دیکھکر حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ مجھکو اپنے شبہ پر ندامت ہوئی، اور دل میں کہا، سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں اور آپ کس عالم میں[1]، کبھی کبھی راتوں کو اُٹھکر آپ تن تنہا قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے اور دعا وزاری کرتے تھے، ایک دفعہ آپ کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہ گئیں تو دیکھا کہ آپ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور دعا مانگی[2]

دُعا اور نماز کے بعد آپ سو جاتے یہاں تک خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعۃً سپیدۂ صبح نمودار ہوتا آپ بیدار ہوتے، صبح کی سنت ادا کر کے مسجد کو تشریف لے جاتے اور اسوقت یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے،

---

[1] سنن نسائی باب الغیرۃ [2] سنن نسائی باب الاستغفار للمؤمنین،

اللھم اجعل فی قلبی نوراً و فی لسانی نوراً و اجعل فی	خدایا میرے دل میں نور پیدا کر، اور میری زبان میں اور میری
سمعی نوراً و اجعل فی بصری نوراً، و اجعل فی خلفی	قوت سامعہ میں نور پیدا کر، آنکھوں میں نور پیدا کر، اور میرے پیچھے
نوراً و من امامی نوراً و اجعل من فوقی نوراً و تحتی نوراً	اور میرے آگے نور پیدا کر میرے اوپر اور میرے نیچے نور پیدا
و اعطنی نوراً (صحیح مسلم باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل)	کر اور مجھے نور عطا کر،

ارکان نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے لیکن حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم رکوع کے بعد اتنی دیر تک کھڑے رہتے تھے، کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ آپ سجدہ میں جانا بھول گئے ہیں[1]،

جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی، اُس سے احتراز فرماتے تھے، ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی جس میں دونوں طرف حاشیے تھے، نماز میں اتفاق سے حاشیوں پر نظر پڑ گئی نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ لیجا کر فلاں شخص (ابوجہم) کو دے آؤ، اور اُس سے انجانی مانگ لاؤ حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا[2]

ایک دفعہ دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں اُس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا اس کو ہٹا دو، اس کے نقش و نگار حضور قلب میں خلل انداز ہوئے[3]،

روزہ | (انبیاء اور داعیان مذاہب نے تکمیل روحانیت کے لیے تقلیل غذا بلکہ ترک غذا، (روزہ) کو اساسِ ضروری میں شمار کیا ہے ہندوستان کے ریاضت کش اور مرتاض داعیان مذاہب تو اس راہ میں حدِّ افراط سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن داعی اسلام کا طرزِ عمل اس باب میں افراط و تفریط کے بیچ میں تھا،

اسلام سے پہلے اہل عرب عاشورا کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، آنحضرت صلعم بھی معمولاً اس دن روزہ رکھتے تھے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں آپ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے، لیکن مدینہ آکر اس معمول میں فرق آگیا، مدینہ میں یہود بھی عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، آپ نے بھی رکھا، بلکہ تمام مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی، لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ نفل رکھا گیا

[1] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۷۲، [2] صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۵۴ کتاب الصلوٰۃ انجانی ایک کپڑے کا نام ہے، [3] صحیح بخاری کتاب اللباس والصلوٰۃ،

رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ مدینہ میں آپ نے کبھی نہیں رکھا، صرف ایک شعبان مستثنیٰ ہے اس میں قریب قریب پورے مہینہ بھر آپ روزہ سے رہتے تھے، اس طرح سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان تو پورے روزوں میں گذرتے تھے، سال کے بقیہ مہینوں میں یہ کیفیت رہتی تھی کہ روزہ رکھنے پر آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ کبھی روزہ نہ توڑیں گے، پھر روزہ توڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے، مہینہ کے نصف اول میں جنکو ایام بیض کہتے ہیں۔ آپ اکثر روزوں سے رہتے تھے، مہینہ میں تین دن دو دو شنبہ اور ایک جمعرات کو آپ معمولاً روزے رکھا کرتے تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کا روزہ بھی معمولات میں سے تھا ان کے علاوہ محرم کے دس دن یکم سے عاشوراء تک اور شوال کے آغاز میں ۶ دن دوسری سے ساتویں تک آپ روزوں میں گذارتے[1] تھے۔

اتفاقی روزے ان کے علاوہ تھے، آپ کبھی گھر میں تشریف لا کر پوچھتے تھے کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب ملتا "کچھ نہیں"، آپ فرماتے تو میں آج روزہ سے ہوں[2]، کبھی کبھی آپ صوم وصال بھی رکھتے تھے، یعنی متواتر کئی کئی دن تک ایک روزہ رکھتے تھے، بیچ میں مطلق افطار نہیں کرتے تھے، یا برائے نام کچھ کھا لیتے تھے، لیکن جب صحابہ نے اس میں آپ کی تقلید کرنی چاہی تو آپ نے منع فرمایا بعض لوگوں نے اس ممانعت کو صرف اس معنی پر محمول کیا کہ آپ حکماً نہیں بلکہ شفقت سے منع فرماتے ہیں اس لیے اس ممانعت کے باوجود آپ کے ساتھ انہوں نے بھی اس قسم کے روزے رکھنے شروع کئے، آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو دو دن متصل روزہ رکھا، تیسرے دن اتفاق سے چاند ہو گیا، آپ نے فرمایا "اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے دن تک افطار نہ کرتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو جاتا رہتا" صحابہ نے عرض کی "یا رسول اللہ پھر حضور کیوں کئی کئی دن تک افطار نہیں کرتے؟" ارشاد ہوا "تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھکو تو ایک کھلانے والا ہے جو کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا ہے جو پلاتا ہے" بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں "تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ میں شب بسر کرتا ہوں تو میرا خدا مجھکو کھلا اور پلا دیتا ہے"[3]

[1] روزہ کے متعلق یہ حدیثیں تمام کتب حدیث میں ہیں اسوقت ابوداؤد اور صحیح مسلم کتاب الصوم میں نظر ہیں۔ [2] ابوداؤد باب النیۃ فی الصیام
[3] صوم وصال کی یہ حدیثیں صحیح مسلم سے لی گئی ہیں۔

عام مسلمانوں کیلئے آپ اس قسم کی مذہبی سختیوں کو ناپسند فرماتے تھے، اور عام طور پر خود بھی ان چیزوں سے احتراز کرتے تھے تفصیلی واقعات آگے آتے ہیں،)

زکوٰۃ (آنحضرت صلعم، اسلام سے پہلے بھی بہت کچھ خیرات و مبرّات کیا کرتے تھے، جیسا کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہ نے شہادت دی[1] ہے، اسلام کے بعد آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی چیز نقد اپنے پاس رہنے نہیں دیتے تھے جو کچھ آتا مستحقین میں تقسیم فرما دیتے، لیکن با ایں ہمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا آپ سے ثابت نہیں اس سے بعض فقہائے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، لیکن اصل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے دو مفہوم ہیں، ایک مطلق صدقہ و خیرات اور اس باب میں جو آپ کی کیفیت تھی وہ کس سے مخفی ہے؟ دوسرا یہ کہ چاندی سونے یا جانور وغیرہ کی مخصوص مقدار و تعداد پر جو حاجت اصلیہ سے زیادہ ہو اور سال بھر تک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، ایک خاص شرح رقم ادا کی جائے یہ مصطلحہ زکوٰۃ کبھی آپ پر فرض ہی نہیں ہوئی کاشانہ نبوت میں کوئی قابل زکوٰۃ چیز سال بھر تک تو کیا رہتی یہ بھی ناپسند خاطر تھا کہ شب گذر جائے اور مال و دولت کا کوئی نشان گھر کے اندر رہ جائے ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خراج کی رقم اس قدر زیادہ آگئی کہ وہ شام تک ختم نہ ہو سکی آپ نے رات بھر مسجد میں آرام فرمایا، اور کاشانۂ اقدس میں اسوقت تک قدم نہیں رکھا جب تک حضرت بلال نے آکر یہ اطلاع نہ دی کہ "یا رسول اللہ خدا نے آپ کو سبکدوش کیا[2]"

حج (اسلام سے پہلے آپ نے جسقدر حج کیے، ان کی صحیح تعداد متعین نہیں کی جاسکتی، ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ چونکہ قریش معمولاً ہر سال حج ادا کیا کرتے تھے، اس لیے قرینہ غالب یہی ہے کہ آنحضرت صلعم بھی ہر سال حج ادا کرتے ہونگے، ترمذی[3] میں ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ میں آپ نے دو حج کیے تھے، اور ابن ماجہ اور حاکم میں ہے کہ تین حج کیے تھے، لیکن یہ سب[4] روایتیں مرسل ہیں مدینہ کے زمانہ قیام میں متفقاً ثابت ہے کہ صرف ایک حج سنہ ۱۰ھ میں کیا[5] یہ وہی حجۃ الوداع ہے جسکا ذکر تفصیل پہلے گذر چکا ہے،

[1] صحیح بخاری بدء الوحی [2] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین [3] باب کم حج النبی صلعم [4] زرقانی جلد ۸ صفحہ ۱۶۴، [5] صحیح مسلم و ابوداؤد حجۃ الوداع و ترمذی باب کم حج النبی صلعم،

حج کے علاوہ آپ نے عمرے بھی ادا کیے ہیں، ہجرت کے بعد چار عمرے ثابت ہیں، ایک عمرہ ذیقعدہ کے مہینہ میں، ایک حدیبیہ کے سال ایک عمرۂ حنین کے بعد اور چوتھا حجۃ الوداع[1] کے ساتھ، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع والے عمرہ کے سوا تمام عمرے آپ نے ذیقعدہ کے مہینہ میں ادا کیے، ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت صلعم نے کے عمرے کیے تھے؟ انھوں نے جواب دیا "چار عمرے ان میں سے ایک ماہ رجب میں" حضرت عائشہ نے یہ سنا تو کہا "خدا ابوعبدالرحمن (ابن عمر کی کنیت) پر رحم فرمائے آپ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، آنحضرت صلعم نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا[2]"

سال حدیبیہ میں سب سے پہلی دفعہ جب آپ عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو کفار قریش نے قدم قدم پر روکنے کی کوشش کی، صحابہ ان کی مدافعت میں آپ سے پیچھے رہ گئے لیکن آپ کو خانہ کعبہ کی زیارت کا یہ ذوق و شوق تھا کہ اپنے ہمراہیوں کا انتظار کیے بغیر آپ سب سے آگے بڑھے چلے جارہے تھے، آخر جاں نثاروں نے ابوقتادہ انصاری کو بھیجا کہ وہ جا کر ہماری جانب سے سلام عرض کریں اور یہ درخواست کریں کہ "آپ ذرا توقف فرمائیں ہمیں یہ ڈر ہے کہ دشمن کہیں ہمارے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہو جائیں" چنانچہ آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی[3]۔

دوام ذکر الٰہی قرآن مجید نے اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ — جو خدا کو اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے یاد کرتے ہیں (آل عمران)

لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ — جن کو اشتغال دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے

اور قرآن کا مبلغ ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلعم ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے[4]، ربیعہ بن کعب اسلمی، رات کو آپ کے آستانے پر پہرہ دیتے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا، اور مجھے نیند آجاتی تھی[5] اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے گھر میں

[1] جامع ترمذی باب مذکور، [2] بخاری و مسلم کتاب الحج، [3] صحیح بخاری صفحہ ۲۴۵ باب جزاء الصید، [4] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [5] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۵۹،

داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل و زبان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے، چنانچہ اسی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات و حالات کے لیے کثرت سے ادعیہ ماثورہ منقول ہیں، اخیر زندگی میں جب سورۂ اِذَا جَآءَ اُتری جس میں تحمید و تسبیح کا حکم ہے تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی[1]

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ اکثر یہ دعا رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے ادا ہوئے[2]" سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپ یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے، سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے، اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رخ ہے یا نہیں، سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا آپ اُدھر ہی منہ کیے نماز کی نیت کر لیتے کہ[3] فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (جدھر رخ کرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے)

ذوق و شوق آپ اصحاب کی محفل میں یا امہات المومنین کے حجروں میں، بات چیت میں مشغول ہوتے کہ دفعۃً اذان کی آواز آتی، آپ اُٹھ کھڑے ہوتے[4]، رات کا ایک معتدبہ حصہ گو شب بیداری میں گزرتا تھا، تاہم صبح کے وقت اُدھر مؤذن نے اللہ اکبر کہا اِدھر آپ بستر سے اُٹھ بیٹھے[5]، شب کے وقت جس ذوق شوق اور وجد کی حالت میں نماز پڑھتے، اُس کا نقشہ حضرت عائشہؓ نے اِن الفاظ میں کھینچا ہے "کبھی پوری پوری رات آنحضرت صلعم کھڑے رہتے، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے، جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے دعا مانگتے، اور پناہ طلب کرتے، کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اُس کے حصول کی دعا مانگتے[6]"، قراءت اتنی زور سے فرماتے کہ دور دور تک آواز جاتی اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپ کی آواز سنتے[7]، کبھی کبھی کوئی ایسی آیت آجاتی کہ آپ اُس کے ذوق و شوق میں محو ہو جاتے، حضرت

---

[1] ابن سعد جزء الوفاۃ [2] ترمذی و ابن ماجہ و دارمی باب دعوات [3] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ۔ [4] صحیح بخاری باب یکون الرجل فی خدمۃ اہلہ صفحہ ۸۰ [5] صحیح بخاری باب من انتظر الاقامۃ [6] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۲ [7] ابن ماجہ باب ما جاء فی صلوٰۃ اللیل۔

ابوذر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے نماز میں یہ آیت پڑھی

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ — اگر تو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر معاف کردے

فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ، — تو تو غالب اور حکمت والا ہے،

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپ یہی آیت پڑھتے رہ گئے[1]،

زیدؓ بن خالد جہنی ایک صحابی ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا (غالبا یہ کسی سفر کا واقعہ ہے) نماز کا وقت آیا تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے، پہلے دو رکعتیں معمولی ادا کیں، پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں، پھر دو دو رکعتیں کرکے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی پڑھیں اور سب کے آخر میں وتر ادا کی[2]، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے[3]،

حضرت **حذیفہ** کہتے ہیں کہ ایک شب مجھکو آنحضرت صلعم کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپ نے سورۂ بقرہ شروع کی (قرآن کی سب سے بڑی سورہ ہے) میں سمجھا آپ سو آیتوں تک پڑھیں گے، لیکن آپ ان کو پڑھکر اور آگے بڑھے میں نے دل میں کہا شاید پوری سورہ آپ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں چنانچہ آپ نے جب اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا اب آپ رکوع کریں گے، لیکن آپ نے فوراً ہی سورۂ نساء شروع کردی، یہ بھی ختم ہوچکی تو سورۂ آل عمران شروع کی (یہ تینوں سورتیں ملکر سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپ قرات کر رہے تھے، اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے، اس کے بعد آپ نے رکوع کیا، رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا، پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے، پھر سجدہ کیا، اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی[4]،

میدان جنگ میں یاد الٰہی | (عین اسوقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرپیکار ہوتیں، تیر و سنان اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں، اور ہر طرف سے شور دار و گیر برپا ہوتا، آپ نہایت خضوع و خشوع اور

---

[1] ابن ماجہ باب مذکور [2] صحیح مسلم، موطا، ابوداؤد [3] نسائی احیاء اللیل [4] صحیح مسلم ونسائی صلوۃ اللیل

اطمینان قلب کے ساتھ دعا و زاری اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمین نیاز پر ہوتی، بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک، تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی،

معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے، لیکن اسلام کے **قائد اعظم** کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا، عالم اسباب کے لحاظ سے گو آپ نے اصول جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں، لیکن اصلی اعتماد اور بھروسا اسباب کائنات سے ماورا، قادر مطلق کی ذات پر تھا، **بدر** میں دو صحابی حاضر ہوتے ہیں، اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہمکو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ "ہمکو صرف خدا کی مدد درکار ہے"[1] بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے، اور آپ خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں "خدایا اپنا وعدۂ نصرت پورا کر" محویت اور بیخودی میں ردائے مبارک کندھے سے گر گر پڑتی ہے، اور آپ کو خبر نہیں ہوتی، کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ "خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر تو قیامت تک نہ پوجا جائیگا"[2] اسی اثنا میں حضرت **علی**ؓ تین دفعہ میدان جنگ سے حاضر خدمت ہوئے ہیں اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے[3]،

غزوۂ **احد** کے خاتمہ پر ابوسفیان مسرت سے **ہبل** کی جے پکارتا ہے، لیکن آپ اس دل شکستگی کے عالم میں بھی حضرت **عمر**ؓ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو،

اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ — خدا ہمارا آقا ہے، تمہارا کوئی آقا نہیں، خدا بڑا اور بلند ہے،

غزوۂ **احزاب** میں آپ خود اپنے دست مبارک سے خندق کھودنے میں مصروف تھے، اور لب مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے،

اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ اِلَّا خَيْرُ الْاٰخِرَةِ فَبَارِكْ فِي الْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ — خدایا بھلائی صرف آخرت کی بھلائی ہے، انصار اور مہاجرین کو برکت عطا کر،

---

[1] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد [2] صحیح بخاری و مسلم، بدر [3] سیرت جلد اول صفحہ ۴۵،

دشمن اس شدت سے حملہ پر حملہ کر رہے تھے، کہ کسی مسلمان کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا، اور یہ محاصرہ متصل ۲۲ دن تک قایم رہا، لیکن اس مدت میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چار وقت کی نمازیں قضا ہوئیں، ایک دن عصر کے وقت دشمنوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی مہلت نہ مل سکی، آخر عصر کا وقت ختم ہو گیا، آپکو سخت رنج ہوا، حملہ رکنے پر سب سے پہلے باجماعت نماز ادا کی،[1]

غزوۂ **خیبر** میں جب آپ شہر کے قریب پہنچے، تو زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے، اللہ اکبر خربت خیبر، اللہ اکبر خیبر ویران ہو چکا، عمارتیں نظر آئیں تو صحابہ سے ارشاد کیا کہ ٹھہر جاؤ، پھر یہ دعا مانگی،

اللھم انا نسئلک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا وخیر ما	اے خدا ہم تجھ سے اس آبادی کی، اس آبادی والوں کی
فیھا ونعوذ بک من شرھا وشر اھلھا وشر ما فیھا،	اس آبادی کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں، اور ان سب
(ابن ہشام)	کی برائیوں سے تیری پناہ کے طلبگار ہیں۔

حنین کے معرکہ میں بارہ ہزار فوج آپ کے ساتھ تھی، لیکن اول ہی دہلہ میں اُس کے پاؤں اُکھڑ گئے، اس فوج کا سپہ سالار اگر انہی آدمیوں کے بھروسہ پر میدان جنگ میں اترتا تو شاید وہ سب سے پہلے بھاگ کر اپنی جان بچاتا، لیکن آپ کو جس قوت پر اعتماد تھا، آپ اُس کو اس تنہائی میں بھی اُسی طرح ناصر و مددگار سمجھتے تھے جسطرح فوج ولشکر کے ساتھ، عین اسوقت جب دس ہزار قدر انداز تیروں کا مینہ برساتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے اور آپ کے پہلو میں چند جاں نثاروں کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہا تھا، آپ سواری سے اُتر آئے، اور فرمایا "میں خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں"، پھر بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کر نصرت موعودہ کی درخواست کی، دفعۃً ہوا کا رُخ پلٹ گیا، اور نسیم فتح علم اسلام کو لہرانے لگی،[2] دس ہزار دشمن کے بے پناہ تیروں کو یکہ و تنہا ثبات و وقار کی سپر پر روکنے کی جرأت پیغمبروں کے سوا اور کس سے ظاہر ہو سکتی ہے

اس مرقع کا سب سے مؤثر منظر غزوۂ **بنی مصطلق** میں نظر آتا ہے، سامنے دشمن پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں اور غفلت کے

---

[1] صحیح بخاری، احد [2] صحیح بخاری و مسلم، حنین

منتظر ہیں کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے اور آپ امام بنکر آگے کھڑے ہوجاتے ہیں صحابہ کی ایک جماعت مقتدی ہوکر نماز میں مصروف ہوجاتی ہے، اور دوسری دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہے۔ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک موقع پیش آیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ کے پاس عسفان میں خیمہ زن تھے، قریش کے مشہور جرنیل خالد بن ولید آس پاس کی پہاڑیوں میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ لیے ہوئے موقع کی تاک میں تھے۔ آخر قریش کی یہ رائے قرار پائی کہ مسلمان جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو عین اسوقت ایک بے خبری میں حملہ کیا جائے خداوند کارساز کی بارگاہ میں قصر صلوۃ کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہوگئی، چنانچہ قصر کی آیتیں نازل ہوئیں، عصر کا وقت آیا تو آپ نماز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، دشمن اسی فوج کا پرا لیے آپ کے سامنے تھے، صحابہ دو حصوں میں منقسم ہوگئے، ایک حصہ نے آپ کے پیچھے آکر نماز کی صفیں قائم کرلیں، اور دوسرا حصہ دشمنوں کے مقابل کھڑا ہوگیا، پہلی جماعت فارغ ہوکر بتدریج دشمنوں کے مقابل آگئی، اور دوسری ترتیب کے ساتھ پیچھے ہٹکر آپ کے ساتھ نماز میں داخل، یہ تمام تبدیلیاں مقتدیوں کی صفوں میں ہورہی ہیں، لیکن خود سپہ سالار جوں آشام تلواروں کے سایہ میں تمام خطرات سے بے پروا عبادت الٰہی میں مصروف[1] ہے، اور اس کو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوتی،

ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اس حکم الٰہی کی کہاں تک تعمیل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَ	مسلمانو جب کسی گروہ سے مٹ بھیڑ ہوجائے تو ثابت قدم
اذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، (انفال)	رہو، اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہوگے،

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تو تین بار اللہ اکبر[2] کہتے،

خشیتہ الٰہی | آپ خاتم الانبیاء تھے، افضل رُسُل تھے، محبوب خاص تھے تاہم خشیتہ الٰہی کا یہ اثر تھا کہ فرمایا کرتے، کہ "مجھکو کچھ نہیں معلوم کہ میرے اوپر کیا گذرے گی، حضرت عثمان بن مظعون نے جب وفات پائی تو آپ

---

[1] ابوداؤد جلد اول باب صلوۃ المسافرین [2] باب التکبیر عند الحرب

تعزیت کو گئے، لاش دھری تھی، ایک عورت نے لاش کی طرف مخاطب ہو کر کہا "خدا گواہ ہے کہ خدا نے تجھکو نوازا"

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "تم کو کیونکر معلوم ہوا؟" بولیں "خدا نے اُس کو نہیں نوازا تو اور کس کو نوازیگا"

ارشاد ہوا کہ "ہاں مجھکو بھی اس کی نسبت بھلائی کی توقع ہے لیکن میں پیغمبر ہو کر بھی یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا"[1]

جب کبھی زور سے ہوا چلتی آپ سہم جاتے، کسی ضروری کام میں ہوتے اس کو چھوڑ کر قبلہ رُخ ہو جاتے[2] اور فرماتے "خدایا تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں"، جب مطلع صاف ہو جاتا، یا پانی برس جاتا تو مسرور ہوتے، اور خدا کا شکر ادا فرماتے، ایک دن اس قسم کا واقعہ پیش آیا تو حضرت عائشہ نے پوچھا "یا رسول اللہ آپ کیوں مضطرب ہو جاتے ہیں" ارشاد ہوا "عائشہ تجھے کیا معلوم کہ قوم ہود کا واقعہ پیش آئے، جس نے بادل دیکھکر کہا کہ یہ ہماری کھیتوں کو سیراب کرنے والا ہے، حالانکہ وہ عذاب[3] الٰہی تھا"

حضرت **ابوبکر**رض نے عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ کے بال پکنے لگے، فرمایا "مجھے سورۂ ہود، واقعہ، والمرسلات اور عم یتساءلون نے بوڑھا[4] کر دیا، (ان سورتوں میں قیامت وغیرہ کے واقعات مذکور ہین،) ابی بن کعب سے روایت ہے کہ جب دو ثلث شب گذر چکتی، تو آواز یہ الفاظ ادا فرماتے "لوگو احد کو یاد کرو، خدا کو یاد کرو، زلزلہ آرہا ہے، اُس کے پیچھے پیچھے آنے والا آرہا ہے، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی"[5]

فرمایا کرتے تھے "لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں، اگر تم جانتے ہوتے، تو تم کو ہنسی کم، اور رونا زیادہ آتا،" (صحیح)

ایک دفعہ آپ نے نہایت موثر طرز سے خطبہ میں فرمایا "اے معشر قریش! اپنی آپ خبر لو، میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا اے بنی عبد المناف! میں تمکو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے عباس بن عبد المطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے صفیہ! رسول خدا کی پھوپی، میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ! میں تجھکو بھی

[1] صحیح بخاری باب الجنائز، [2] سنن ابن ماجہ باب ما یدعو به الرجل اذا رأى السحاب [3] یہ واقعہ بخاری ومسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے، اخیر فقرہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے) [4] شمائل ترمذی، ماجاء فی شیبہ صلعم [5] مشکوۃ بحوالہ ترمذی باب البکاء والخوف،)

خدا سے نہیں بچا سکتا۔ (صحیحین)

ایک دفعہ اعراب بادیہ کا مسجد نبوی میں اتنا ہجوم ہوا کہ آپ پسینے کے قریب ہوگئے، مہاجرین نے اُٹھ کر لوگوں کو ہٹایا، آپ نکل کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں داخل ہوگئے، اور تقاضائے بشری سے بددعا زبان سے نکل گئی، فوراً قبلہ رُخ ہوکر دونوں ہاتھ خدا کی بارگاہ میں اُٹھائے اور دعا کی، خدایا! میں ایک انسان ہوں اگر تیرے کسی بندہ کو مجھ سے تکلیف پہنچے تو مجھے سزا دینا۔[۱]

گریہ و بکا — خشیت الٰہی کی وجہ سے اکثر آپ پر رقت طاری ہوتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جب آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہوگئے،[۲] اکثر نماز میں رقت طاری ہوتی اور آنسو جاری ہوجاتے، ایک دفعہ جب سورج گرہن پڑا تو نماز کسوف میں آپ ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور فرماتے تھے خدایا تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو لوگوں پر میرے ہوتے عذاب نہیں نازل کرے گا،[۳]

عبداللہ بن شخیرؓ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بار خدمت نبوی میں حاضر ہوا دیکھا تو آپ نماز میں مشغول ہیں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے اس قدر ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی اُبل رہی ہے،[۴]

ایک بار آپ ایک جنازہ میں شریک تھے، قبر کھودی جارہی تھی آپ قبر کے کنارے بیٹھ گئے، یہ منظر دیکھکر آپ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں سے زمین نم ہوگئی پھر فرمایا بھائیو! اس دن کے لیے سامان کر رکھو،[۵]

ایک دفعہ کسی غزوہ سے واپس تشریف لارہے تھے، راہ میں ایک پڑاؤ ملا، کچھ لوگ بیٹھے تھے آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کون ہو، بولے ہم مسلمان ہیں ایک عورت بیٹھی چولھا سلگا رہی تھی، پاس ہی

---

۱ (مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۲۳، دونوں صحیحوں میں دو روایتیں ہیں مگر غالباً ایک ہی واقعہ ہے) ۲ صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ، ۳ ابوداؤد صلوۃ الکسوف، ۴ ترمذی و ابوداؤد باب البکاء فی صلوۃ اللیل، ۵ سنن ابن ماجہ باب الحزن والبکاء،

اس کا لڑکا تھا، آگ خوب روشن ہوگئی اور بھڑک گئی تو وہ بچہ کو لیکر آپ کی خدمت میں آئی، اور بولی آپ رسول اللہ ہیں؟ ارشاد ہوا ہاں بیشک، پھر اُس نے پوچھا کیا ایک ماں اپنے بچہ پر جس قدر مہربان ہے، خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں ہے، آپ نے فرمایا ہاں بیشک اُس نے کہا تو ماں اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈالتی، آپ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر سر اُٹھا کر فرمایا، خدا اُس بندہ کو عذاب دیگا جو سرکش اور متمرد ہے، خدا سے سرکشی کرتا ہے، اور اسکو ایک نہیں کہتا[1]"

ایک دفعہ آپ نے حضرت ابراہیم کی دعا،

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَاِنَّهُ مِنِّي،	پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ان میں سے جسنے میری پیروی کی وہی میری جماعت میں ہے'

اس کے بعد حضرت عیسیٰ والی دعا پڑھی،

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ	اگر تو اُن کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کردے تو تو غالب و دانا ہے۔

دونوں ہاتھ اُٹھا کر اَللّٰهُمَّ اُمَّتِي اُمَّتِي فرماتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے[2])

محبت الٰہی (دنیا میں دو قسم کے پیغمبر آئے ہیں، ایک وہ جنکی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اور اس لیے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوح وحضرت موسیٰ علیہما السلام دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے، اور وہ لوگوں کو اسی جمالِ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام، لیکن یہ دونوں افراط وتفریط کے راستے تھے، پہلی راہ اخلاص ومحبت کی منزل تک نہیں پہنچاتی، اور دوسری عبودیت اور آداب واحترام کی منزل سے دور پھینک دیتی ہے، جیسا کہ عیسائی تعلیم اور موجودہ انجیل کی سیرۃ مسیح میں ہر شخص کو نظر آسکتا ہے لیکن اسلام دونوں جلووں کو یکساں نمایاں کرنا چاہتا ہے، یہی سبب ہے کہ حاملِ شریعت اسلامیہ

([1] سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من رحمۃ اللہ، [2] صحیح مسلم باب بکائہ صلعم لامتہ)

کی ذات مبارک میں یہ دونوں پہلو بیک دفعہ نظر آتے ہیں، **قرآن مجید** نے کمال ایمان کا وصف یہ بیان کیا ہے،

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ — جو ایمان لائے ہیں انکو سب سے زیادہ خدا پیارا ہے

صحیح روایتوں میں ہے کہ آپ راتوں کو اتنی دیر تک نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا، یہ دیکھکر بعض صحابہ نے عرض کی کہ یارسول اللہ آپ کی مغفرت تو خدا کرچکا ہے آپ یہ زحمت کیوں اُٹھاتے ہیں۔" ارشاد ہوا کہ کیا میں عبدِ شکور نہ ہوں" ارباب باطن کہتے ہیں کہ لوگ سمجھے تھے کہ آپ کی یہ عبادت خشیتِ الٰہی سے ہے، اور چونکہ آپ گناہوں سے پاک کردیئے گئے تھے اس لیے آپ کو ریاضات شاقہ کی ضرورت نہ تھی آپ نے اپنے جواب میں اسی شبہہ کو دفع فرمایا اور بتایا کہ اس کا مقتضا محبت الٰہی ہے۔ خشیتہ الٰہی نہیں اسی لیے آپ فرمایا کرتے تھے۔

وجعلت لی قرۃ عینی فی الصّلوٰۃ — میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

راتوں کے سناٹے میں اُٹھکر آپ کبھی دعا وزاری میں مصروف ہوتے، کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ نصف شب کے سکوت میں خدا سمائے دنیا پر نزول فرماتا ہے[1]، عبادت شبانہ کا خاتمہ صبح کی دو رکعتوں پر ہوتا تھا، جنکی نسبت آپ کا ارشاد تھا کہ "انکے معاوضہ میں دنیا اور مافیہا کی نعمتیں بھی میرے سامنے ہیچ ہیں[2]"

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہوکر آئی، اُس کا بچہ گم ہوگیا تھا محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ ملجاتا تو وہ سینہ سے لگالیتی، اور اُس کو دودھ پلاتی، آپ نے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہوکر فرمایا کیا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے"، لوگوں نے عرض کی ہرگز نہیں"، فرمایا "تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی اُس کو اپنے بچہ سے ہے[3]"

اسی طرح ایک اور واقعہ اوپر گذرچکا ہے کہ آپ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لیکر خدمت اقدس میں آئی اور عرض کی، یارسول اللہ ایک ماں کو اپنے بچہ سے کسقدر محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیح مسلم کتاب الصلوۃ [3] صحیح بخاری صفحہ ۸۸۰ باب رحمۃ الولد۔

اپنے بندوں سے اُس سے زیادہ نہیں ہے۔" فرمایا ہاں ٹھیک ہے" اُس نے کہا کوئی ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی" یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا پھر سر اُٹھا کر فرمایا "خدا صرف اُس بندہ کو عذاب دے گا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے[1]۔

ایک دفعہ آپ صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرندہ کو مع اُس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اُٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا اُنکی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تمکو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجکو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ[2] ہے،

آپ محبتِ الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے، وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے صحابہ کے مجمع میں ایک خطبہ دیا، اس میں فرمایا "میں خدا کے سامنے اس بات سے برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے (یعنی انسانوں میں سے) کوئی میرا "دوست" ہو، کیونکہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنا لیا" جس طرح ابراہیم کو اُس نے اپنا دوست بنا لیا تھا، اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا[3]"

وفات کے وقت زبان مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا، وہ یہ تھا،

اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی — خدایا صرف رفیق اعلیٰ مطلوب ہے۔

یہ الفاظ سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ "اب آپ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے[4]"

اس "رفاقت علوی" کے راز سے جو کسی قدر آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی یہ تشریح کرتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام چون از مقام دعوت فارغ می گردند، و متوجہ عالم بقا می شوند، و منسلخ رجوع (الی الحق)

---

[1] سنن ابن ماجہ باب ما یرجیٰ من الرحمۃ۔ [2] مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد، باب رحمۃ اللہ [3] صحیح مسلم صفحہ ۱ ۲ باب النہی عن بناء المساجد علی القبور
[4] صحیح بخاری، باب الوفات)

تمام می شود بسوی تمام ندائے الرفیق الاعلیٰ برآورده بکلیت متوجہ حق جل سلطانہ میگردد
و در مراتب قرب سیری[1] می نماید")

توکل علی اللہ | (توکل کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو کوششوں کے نتائج اور واقعات عالم کے فیصلہ کو، خدا کے سپرد کر دے اسباب و علل کے پردے اس کے سامنے سے اُٹھ جائیں اور براہ راست ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نظر آئے، بظاہر اسباب و علل گو ناموافق ہوں مگر یہ غیر متزلزل یقین پیدا ہو، کہ یہ ناموافق حالات ہمارے کام میں ذرہ بھر مؤثر نہیں ہو سکتے، بلکہ اصلی قوت و قدرت عالم اسباب سے ماوراء ہستی کے ہاتھ میں ہے، انسان کا استقلال عزم، جرأت، دلیری یہ تمام باتیں اسی ایک اصل کی پرتو ہیں، اسی کی بدولت مشکل سے مشکل اوقات میں بھی زمام صبر اُس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، پر خطر سے پر خطر راستوں میں بھی خوف اور ضعفِ ہمت اُس کے قلب میں راہ نہیں پاتا، شدید سے شدید حالات میں بھی اس کے دل پر مایوسی کا بادل نہیں چھاتا،

آنحضرت صلعم کے سوانح زندگی کا ایک ایک حرف پڑھ جاؤ تم کو صاف نظر آئے گا کہ اس آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی ایسی صف نہ ہوگی جو آپ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو لیکن آپ کا دل کبھی اضطراب و انتشار مایوسی و ناامیدی اور خوف و بیم سے آشنا ہوا، مکہ کی تنہائیوں میں مصائب کے ہجوم میں، دشمنوں کے نرغہ میں حنین و اُحد کے خونریز معرکوں میں ہر جگہ توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے، ابو طالب سمجھاتے ہیں کہ "جان پدر! اس کام سے ہاتھ اُٹھاؤ" آپ فرماتے ہیں "عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجیے، حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا عجم و عرب ایک دن اس کے ساتھ ہوگا"، ایک دوسرے کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "خدا مجھے تنہا نہیں چھوڑے[2] گا"، مکہ میں ایک مصیبت زدہ مایوس صحابی سے ارشاد ہوتا ہے "خدا کی قسم عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے گا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہیگا"[3]

ایک دفعہ حرم میں بیٹھ کر کفار نے باہم مشورہ کیا کہ محمد اب جیسے ہی یہاں قدم رکھیں ان کی بوٹی بوٹی

۱؎ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی رح مکتوب ۲۷۲ جلد اول ۲؎ یہ دونوں واقعہ ابن ہشام میں ہیں ۳؎ صحیح بخاری اواخر جلد اول۔

اُڑا دی جائے حضرت فاطمہؓ اُنکی یہ تقریریں رہی تھیں، وہ روتی ہوئی آپ کے پاس آئیں اور واقعہ عرض کیا، آپ نے اُنکو تسکین دی، اور وضو کے لیے پانی مانگا، وضو کرکے آپ نے خطِ حرم کی سمت روانہ ہوگئے۔ جب خاص صحن حرم میں پہنچے اور کفار کی نظر آپ پر پڑی خودبخود اُن کی نگاہیں جھک گئیں۔[1]

جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ شبِ ہجرت میں قریش کے بہادر خون آشام ارادوں کے ساتھ کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کئے ہوئے تھے لیکن آپ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے عزیز، قوتِ بازو علی مرتضیٰ کو اپنی جگہ بستر پر لٹا دیا، حالانکہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قتل گاہ ہے بستر خواب نہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ ایک اور قادر کُل ہستی ہے جو تختۂ مقتل کو فرش گل بنا سکتی ہے، انکو لٹاتے ہوئے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ تمکو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔[2]

گھر کے چاروں طرف دشمنان قریش محاصرہ کئے ہوئے تھے، اور خیال ہوسکتا تھا کہ صبح امید کے انتظار میں مکہ کے ربائو پیر عجب نہیں کوچوں اور گلیوں میں مشتاق خبر چل پھر رہے ہوں لیکن آپ نے اذن الٰہی کے اعتماد پر ان تمام ناموافق حالات کی موجودگی میں گھر سے باہر قدم نکالا، اُس وقت سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیتیں زبانِ مبارک پر تھیں جن میں سوت کی اور اپنے راہ راست پر ہونے کی تصدیق ہے، آخری آیت یہ تھی۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا	ہم نے اُنکے آگے اور اُن کے پیچھے دیواریں کھڑی کردی ہیں
فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (یٰسین)	ہمنے انکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔

اور یہ بالکل سچ تھا،

مکہ سے نکلکر آپ نے مع حضرت ابوبکرؓ کے غار ثور میں پناہ لی، قریش میں خون آشامی کے ساتھ اس ایسی ناکامی کا غصہ بھی تھا، اور اس لیے اسوقت اُن کے انتقام کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم ہوگا، وہ آپکے تعاقب میں نشانِ قدم کو دیکھتے ہوئے ٹھیک اُسی غار کے پاس پہنچ گئے، کون کہسکتا ہے کہ اس پرخطر حالت میں

[1] مسند احمد جلد اول صفحہ ۳۶۸ [2] ابن ہشام و طبری۔

کسی کے حواس برجا رہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر نے گھبرا کر عرض کی، کہ یا رسول اللہ دشمن اسقدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی، لیکن آپ نے نے روحانیت کے پرسکون آواز میں فرمایا "ان دو کو کیا غم ہے جن کے ساتھ تیسرا خدا ہو" پھر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، فرمایا،

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا، غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے،

سینۂ نبوت کے سوا اس روحانی سکون کا جلوہ اور کہاں نظر آسکتا ہے؟

قریش کے اس اعلان کے بعد کہ جو محمدؐ کو زندہ، یا انکا سر کاٹ کر لائے گا اُسکو سو اونٹ ملیں گے، سراقہ بن جعشم نے آپ کا تعاقب کیا، اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ وہ آپ کو پا سکتا تھا، حضرت ابوبکر بار بار گھبرا کر اُدھر دیکھ رہے تھے، لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ سراقہ کس ارادہ سے آرہا ہے، یہاں دل پر وہی سکینتِ ربانی طاری تھی، اور لب ہائے مبارک تلاوت قرآن میں مصروف تھے[2]،

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مدینہ آکر آپ کی زندگی ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہو گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو اسلام کو یہاں اعوان و انصار کی ایک معتدبہ تعداد مل گئی تھی، لیکن اسی کے ساتھ اُن دشمنوں کا سامنا بھی تھا جو دشمنان مکہ سے زیادہ خطرناک تھے، مکہ میں قریش گو آپ کے دشمن تھے لیکن اُن میں اور رسول اللہ صلعم میں نسبی تعلقات تھے، جو کبھی کبھی کسیقدر غمخواری اور مواسات پر بھی مائل کر دیتے تھے، لیکن مدینہ کے منافقین اور یہود کو مواسات و ہمدردی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، علاوہ بریں یہود و منافقین مدینہ اور قریش مکہ میں باہم آنحضرت صلعم کے قتل و جلا وطنی کی سازشیں شروع ہو گئی تھیں[3]، اس بنا پر صحابہ جان نثاری کی بنا پر آکر راتوں کو پہرا دیا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ایک رات صحابہ آپکے خیمہ کا پہرہ دے رہے تھے، کہ یہ آیت نازل ہوئی،

وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ) اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم ہجرت، [2] صحیح بخاری ہجرت [3] سیرۃ جلد اول سلسلۂ غزوات۔

اور آپ نے اُسی وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر صحابہ سے فرمایا[1]،

ایھا الناس انصرفوا فقد عصمنی اللہ، لوگو واپس جاؤ میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے،

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا یہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے، دوپہر کا وقت تھا، صحابہ درختوں کے سایہ میں اِدھر اُدھر سو رہے تھے آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما تھے آپکی تلوار ایک درخت سے لٹکی تھی کہ ناگاہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا، چپکے سے آیا، اور آپ کی تلوار اُتار کر نیام سے باہر کی اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہشیار ہوئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے، بدو نے پوچھا "اے محمدؐ اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے؟" ایک پر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"[2]

ایک دفعہ ایک شخص گرفتار ہو کر پیش ہوا کہ یہ آپ پر حملہ کی گھات میں تھا، آپ نے فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ یہ مجھکو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا"[3]، یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار کوئی اور ہے، خیبر میں جس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا، اُس سے آپ نے دریافت کیا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی، اُس نے جواب دیا کہ آپ کے قتل کرنے کے لیے" آپ نے فرمایا کہ خدا تمکو اس پر مسلط نہ کرتا"[4]،

احد اور حنین کے معرکوں میں جب میدانِ جنگ تھوڑی دیر کے لیے جاں نثاروں سے خالی ہو گیا تھا۔ آپ کا استقلال، توکل علے اللہ و سکینت روحانی کی معجزانہ مثال ہے۔

یہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی یکرخی تصویر ہے، اس مرقع کا دوسرا رُخ بھی کچھ اس سے کم موثر نہیں ہے، آپ پر فقر و غنا کے مختلف دور گذرے، کوئی دن ایسا آتا کہ مسجد نبوی کا صحن زر و مال سے معمور ہو جاتا اور پھر متصل کئی کئی دن ایسے آتے کہ فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے، حالانکہ بالکل ممکن تھا کہ آج کا سرمایہ کل کے مصارف کے لیے اُٹھا رکھا جائے، لیکن تمام عمر آپ کا طرزِ عمل اس کے خلاف رہا کبھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لیے اُٹھا کر نہیں رکھی گئی، ضروری اور بقدر کفاف اخراجات کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ شام تک

[1] جامع ترمذی، تفسیر مائدہ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد [3] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۷۱ [4] صحیح مسلم باب السم،

اہل استحقاق پر صرف کر دیا جاتا تھا، ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے

ان رسول اللہ صلعم کان لا یدخر لغد، آنحضرت صلعم کل کے لیے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے،

اتفاق سے یا بھولے سے اگر کوئی چیز گھر میں رہ جاتی تو آپ کو سخت تکلیف ہوتی تھی[1]، بلکہ آپ اس وقت تک گھر میں تشریف نہیں لے جاتے تھے، جب تک یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہاں خدا کی برکت کے سوا کچھ نہیں ہے[2]، اس قسم کے متعدد واقعات جود و سخا کے عنوان میں مذکور ہیں۔

نزع کے وقت جب انسان ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے، آپ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، وہ پڑی ہوں گی، اس نازک موقع پر بھی یہ سہو آپکو توکل علی اللہ کی شان کے خلاف نظر آیا، ارشاد ہوا کہ عائشہ! کیا محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا، جاؤ پہلے اُن کو خیرات کر دو[3]")

صبر و شکر | رنج و غم کے متعاقب اور توأم دور کسی زندگی میں نہیں آتے، لیکن انسان کے روحانی کمال کا جوہر یہ ہے کہ ایک طرف حصول مقصد اور کامیابی کے نشہ میں سرشار اور از خود رفتہ نہ ہو، تو دوسری طرف مصائب و آلام کی تلخی کو خندہ جبینی اور کشادہ دلی کے ساتھ گوارا کر لے، اور یہ یقین رکھے کہ انسان کا فرض صرف عمل ہے، کامیابی و ناکامی دونوں کا سررشتہ کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے، **قرآن مجید** نے اس آیت میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے،

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي	جتنی مصیبتیں زمین پر اور خود تم پر نازل ہوتی ہیں وہ ان کے
أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا ط	وجود سے پہلے، دیوان قضا میں لکھی گئی ہیں، یہ بات
إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ	خدا کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے کیا گیا تاکہ تم ناکامی
مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ط وَاللَّهُ	پر غم اور حصول مقصد پر فخر نہ کرو، خدا مغرور اور فخار کو دوست
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (حدید ۳)	نہیں رکھتا،

[1] صحیح بخاری باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاہم و مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۹۳ [2] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین [3] مسند احمد و ابن سعد جزء الوفاۃ،

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی زندگی میں وہ بڑی سے بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں، جو اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے کسی فرد کو حاصل ہوسکتی تھیں، تاہم آپ کے آئینۂ دل میں کبھی فخر و غرور نے اپنا عکس نہیں ڈالا آپ نے فرمایا اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ "میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن مجھے اس پر فخر نہیں" عدی بن حاتم طائی نے جو مذہباً عیسائی تھے آپ کے جو حالات سنے تھے ان کی بنا پر ان کو یہ شک تھا کہ آپ بادشاہ ہیں، یا پیغمبر؟ جب وہ اپنے قبیلہ کا وفد لے کر خاص خدمت ہوئے تو عین اُسی وقت ایک مسکین سی عورت اپنی کسی غرض کے لیے بارگاہِ اقدس میں آئی اور مجمع سے دراہٹکر کچھ سن لینے کی درخواست کی آپ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُسوقت تک گلی میں کھڑے رہے جب تک وہ خود اپنی مرضی سے چلی نہیں گئی، عدی کہتے ہیں کہ آپ کی تواضع اور خاکساری کا یہ عالم دیکھکر مجھے یقین ہوگیا کہ آپ پیغمبر ہیں بادشاہ نہیں[1]

مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہوئے دنیا کے ہر فاتح کا سر غرور و نازسے بلند ہوجاتا ہے لیکن مکہ و خیبر کا فاتح اسوقت بھی اپنا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں جھکا کر شہر میں داخل ہوا اس اسحاق نے روایت کی ہے کہ فتح مکہ میں جب آنحضرت صلعم ذی طوی میں پہونچے اور دیکھا کہ خدا نے آپکو فتح کی عزت عطا کی ہے، تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا،

ان رسول اللہ صلعم لما انتہی الی ذی طوی وقف علی راحلتہ لیضع راسہ تواضعاً للہ حین رای ما اکرمہ اللہ بہ من الفتح، حتی ان عثنونہ لیکاد یمس واسطۃ الرحل،[2]	جب آنحضرت صلعم ذی طوی میں پہنچے، اور دیکھا کہ خدا نے آپکو فتح کی عزت عطا کی ہے، تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا تاکہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکا لیں۔ پھر یہاں تک آپ جھکے کہ آپ کی ٹھوڑی درست تھی کہ کجاوہ کی لکڑی سے لگ جائے،

آنحضرت صلعم کثرت سے عبادت اور تسبیح و تہلیل کیا کرتے تھے، بعض صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ خدا تو آپ کو بے گناہ اور معصوم بنا چکا ہے آپ کیوں یہ زحمت اُٹھاتے ہیں؟" ارشاد ہوا

افلا اکون عبداً شکوراً[3]	کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ ہوں،

---

[1] سیرت ابن ہشام صفحہ ۳۰ ج ۲ [2] سیرت ابن ہشام ذکر فتح مکہ [3] صحیح بخاری قیام اللیل

یعنی اگر یہ تعبّد و تسبیح و تحمید پہلے اس مرتبہ کے حصول کے لیے تھی تو اب اس مرتبہ کے حصول پر شکرگذاری اور احسان مندی کے اعتراف میں ہے۔

دنیا کے اعاظم رجال حکومت و حمایت کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا، اپنی ہر کامیابی کو اپنی قوت بازو، اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب و داب کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن مقربین الٰہی کی اصطلاح میں یہ تخیل شرک و کفر کے ہمپایہ ہے، ان کو ہر کامیابی اور مسرت کے واقعہ کے اندر خود **قادر کل** کا دستِ غیر مرئی کام کرتا نظر آتا ہے، حدیث میں ہے[1] کہ

انه كان اذا جاءه امر سرور او بشر به خرّ ساجدًا شاكرًا لله تعالى،

آنحضرت صلعم کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی تھی تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ فوراً سجدہ میں گر پڑتے تھے۔

قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا[2]، اسی طرح ایک دفعہ اور کسی بات کی آپ کو خبر دی گئی تو آپ فوراً سجدۂ الٰہی بجا لائے[3]، وحی کے ذریعہ سے جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا، اس پر خدا درود بھیجے گا، تو اس رفع منزلت پر آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا[4]،

حضرت **سعد** بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلعم کے ساتھ مکہ سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور جب مقام عزوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک بارگاہِ الٰہی میں دعا کی، پھر سجدہ میں گئے، اور دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے، پھر سر اٹھا کر بدستور دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے، اور پھر دیر تک سجدہ میں رہے، پھر اٹھ کر تضرع کیساتھ دعا شروع کی اور اس کے بعد جبین نیاز خاک پر رکھی، اس دعا و سجود سے فارغ ہو کر آپ نے صحابہ سے فرمایا، میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لیے خدا سے دعا مانگی تھی، جس کا ایک حصہ مقبول ہوا، میں شکر کے لیے سجدہ میں گرا، پھر مزید درخواست کی، اس نے وہ بھی قبول کی، میں سجدۂ شکر بجالایا، اور پھر دعا و زاری کی، اس نے اس کو بھی درجۂ استجابت بخشا، اور پھر میں[5] سجدہ میں گر پڑا،

سورۂ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے اسی وصف کو نمایاں کیا ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر [2] زاد المعاد بحوالہ بیہقی سند علی شرط البخاری جلد ۱ صفحہ ۹ [3] زاد المعاد مذکور بحوالہ ابن ماجہ [4] مسند احمد عن عبدالرحمٰن بن عوف

[5] ابوداؤد کتاب السجود

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ	(اے پیغمبر) دن کے پہلے پہر کی قسم، اور رات کی قسم جب پردہ ڈالدے
رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ	کہ تیرے پروردگار نے نہ تجکو چھوڑا، اور نہ تجھسے ناراض ہوا، یقیناً تیری
مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى	پچھلی زندگی پہلی سے بہتر ہے، وہ تجکو وہ کچھ دیگا جس سے توخوش ہوجائیگا،
اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا	کیا اُسنے تجکو یتیم نہیں پایا اور پناہ میں لے لیا، اور تجکو راہ حق کا جویاں
فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ فَاَمَّا	پایا تو اُسے سیدھی راہ دکھادی اور تجکو مفلس پایا تو غنی کردیا، تو (اس نعمت
الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا	کے شکریہ میں) یتیم پر ظلم نہ کرنا، اور سائل کو نہ جھڑکنا، اور اپنے پروردگار
تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝	کے احسان کو یاد کرتے رہنا،

آپ کی سوانح زندگی کا حرف حرف شاہد ہے کہ آپ عمر بھر کیونکر اس ارشاد ربانی کی تعمیل کرتے رہے،

صبر کا مفہوم بالکل شکر کے مخالف ہے لیکن رسول اللہ صلعم کی ذات پاک میں یہ دونوں متضاد اوصاف ایک ساتھ جمع ہوگئے تھے اور آپ کو عملاً دونوں کے اظہار کا موقع ملا، حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟" ارشاد ہوا کہ "پیغمبروں پر، پھر اسیطرح درجہ بدرجہ لوگوں پر"[۱] واقعات بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں، آپ سرور انبیا تھے، اس بنا پر دنیا کے شدائد اور مصائب کا بار اس مقدس گروہ میں سب سے زیادہ آپکے دوشِ مبارک پر تھا، اسی لیے قرآن مجید میں باربار آپکو صبر کی تلقین کیگئی ہے، سورۂ احقاف میں ہے،

وَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ،	(اے پیغمبر) جسطرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا، تم بھی صبر کرو،

آپ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ والد نے انتقال کیا، عہد طفولیت میں تھے کہ سر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا، اس کے دو برس کے بعد دادا نے جنکی نگاہِ لطف زخم یتیمی کا مرہم تھی، وفات پائی، ان کے بعد ابوطالب نے جو قریش کے ظلم و ستم کی سپر تھے، مفارقت کی، محرم اسرار اُم المومنین **خدیجۃ الکبریٰ** جو اس ہجوم مصائب میں آپ کی تنہا مونس و غمخوار تھیں، موت نے ان کو بھی اسی زمانہ میں آپ سے علیحدہ کردیا، والدین اور بیوی کے بعد انسان کو سب سے زیادہ اولاد سے محبت ہوتی ہے جسکی مفارقت کا زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوتا، آپ کی اولاد کو حسب اختلاف روایت

[۱] سنن ابن ماجہ باب الصبر علی البلاء،

کم سے کم دو، اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی، لڑکیوں کی تعداد چار تھی، لیکن ایک (حضرت فاطمہ) کے سوا سب نے کمسنی یا جوانی میں آپ کی نگاہوں کے سامنے جان دی، ان واقعات پر اگرچہ کبھی کبھی آپ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، لیکن زبان و دل پر ہمیشہ صبر و سکینت کی مُہر لگی رہی، اور کبھی کوئی کلمہ زبان مبارک سے ایسا نہیں نکلا جس سے کار کنان قضا کی شکایت کا پہلو نکلتا ہو،

آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب نے ۸ھ میں وفات پائی تو تجہیز و تکفین کے متعلق آپ نے خود بعض بعض ہدایات دیں، جنازہ قبر کے سامنے رکھا گیا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ لیکن زبان مبارک سے ایک لفظ بھی نہ نکلا حضرت زید (پروردۂ خاص) اور حضرت جعفر (ابن عم) دونوں آپ کو بہت محبوب تھے غزوۂ موتہ میں انکی شہادت کی خبر آئی تو چشم مبارک اشک آلود ہوگئی، لیکن اسی اثناء میں حضرت جعفر کے گھر سے نوحہ کی آواز آئی تو آپ نے منع کر بھیجا آپ کا ایک نواسہ جس سے آپ کو محبت تھی مبتلائے نزع ہوا تو صاحبزادی نے بلا بھیجا، لیکن آپ نے اس کے جواب میں سلام کے بعد یہ پیغام بھیجا،

اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلٌّ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ،

اللہ نے جو لے لیا، وہ اُسی کا تھا، اور جو دیا وہ بھی اُسی کا ہے اسکا ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے، صبر کرو اور اُس سے خیر طلب کرو۔

صاحبزادی نے دوبارہ بہ اصرار بلایا، آپ چند صحابہ کیساتھ وہاں تشریف لے گئے، بچہ آپکی گود میں رکھ دیا گیا، وہ دم توڑ رہا تھا، آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟" فرمایا "یہ جذبہ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں رکھا ہے، خدا اپنے بندوں میں سے رحمدلوں ہی پر رحم کرتا ہے"

ایک بار آپ سعد بن عبادہ کی عیادت کو تشریف لائے، اور انکی حالت دیکھکر فرمایا کہ "انتقال کر گئے" صحابہ نے کہا "نہیں یا رسول اللہ" آپ رو پڑے، تو آپکو روتے دیکھکر صحابہ بھی رو پڑے، آپنے فرمایا "اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کو منع نہیں کرتا، لیکن (زبان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ) اس سے عذاب ہوتا ہے، حضرت ابراہیم کی وفات کیوقت جب آپکی آنکھوں سے اشکِ محبت جاری ہوئے تو عبدالرحمان بن عوف نے کہا یا رسول اللہ یہ کیا بات ہے، فرمایا یہ رحمت و شفقت ہے" حضرت عبدالرحمان نے دوبارہ گذارش کی، ارشاد ہوا، [1]

[1] ان تمام واقعات کے لئے صحیح بخاری کتاب الجنائز دیکھو

إنّ العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول إلا ما يرضى ربنا وإنا بفراقك يا ابراهيم لمحزونون،

آنکھ اشک ریز ہے، دل غمگیں ہے، لیکن ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کی مرضی ہو اے ابراہیم ہم تمہارے فراق میں بہت غمگیں ہیں۔

بہرحال یہ واقعات آنی ہیں، یعنی ان کا اثر ایک خاص وقت تک انسان پر رہتا ہے، پھر مٹ جاتا ہے لیکن مسلسل اور غیر منقطع مصائب وحوادث کو اس طرح برداشت کرنا کہ کبھی پیمانۂ صبر لبریز نہ ہونے پائے، سخت مشکل ہے ہجرت سے پہلے ۱۳ سال تک طائف اور مکہ کے اشقیا نے دعوت حق کا جس تحقیر واستہزاء، سب وشتم، تعدی وایذارسانی کے ساتھ جواب دیا، اُس کے دُہرانے کی حاجت نہیں، مدینہ منورہ میں آٹھ نو برس تک جن خونیں معرکوں کا ہمیشہ سامنا رہا اور دشمنوں نے آپ کی جلاوطنی وقتل وشکست کے جو منصوبے باندھے انکے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں، لیکن ان تمام تیروں کی بوچھار صبر کے سوا آپ کے کس سپر پر روکی؟

اس سے بھی زیادہ مشکل اُن واقعات پر صبر ہے جو خود اختیاری ہوں، فتوحات کی کثرت گو ہر دفعہ بیت المال کو معمور کردیتی تھی، لیکن دستِ کرم کو اُسی وقت آرام ملتا جب سارا خزانہ ارباب حاجت اور فقرا میں لٹ چکا ہوتا، چنانچہ اسی بنا پر خود آپ اور تمام اہلبیت کی زندگی اکثر فقر وفاقہ میں گذرتی تھی، جسم مبارک کے لیے ایک کے سوا کپڑے کا کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہوتا تھا، تاہم یہ تمام شدائد اس لیے گوارا تھے کہ صبر کی لذت، الوان نعمت کی خوشگواری اور لباسہائے فاخرہ کی مسرت سے کہیں زیادہ تھی۔

لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما اُس تیر کا نشانہ ہے جو دشمنوں کے نہیں بلکہ دوستوں کے ہاتھ سے لگایا جائے دو دفعہ ایسا ہوا کہ بعض جلد باز نوجوانوں نے آپ کے کسی فعل پر جو کسی مصلحت پر مبنی تھا اعتراض کیا، اس موقع پر بھی صبر کا رشتہ آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، صحیح بخاری میں ہے کہ غنائم حنین کے متعلق ایک دو انصاریوں نے اعتراض کیا کہ آنحضرت صلعم نے یہ دوسروں کو کیوں دیدیا، حق تو ہمارا تھا، آپ کو اسکی خبر پہنچی تو فرمایا،

رحمة الله على موسى قد أوذي بأكثر من ذلك فصبر (باب غزوۂ حنین)

موسٰی پر خدا کی رحمت ہو وہ اس سے بھی زیادہ (اپنے دوستوں کی طرف سے) ستائے گئے ہیں لیکن انھوں نے صبر کیا۔

اخلاقِ نبوی

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ،

(حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کا یہ وہ حصہ ہے، جہاں آکر آپ کی زندگی تمام انبیائے کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی واعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا، تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائے گی، دنیا کے تمام مصلحین اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے، لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلح اعظم (بودھ) عملاً خود کیا تھا، کوہِ زیتون کے ریحانہ اخلاق کا واعظ (مسیحؑ) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا، لیکن اسکی زندگی کا ایک واقعہ بھی اُس کے زرّیں مقولوں کی تائید میں تمکو معلوم ہے؟

لیکن مکہ کا معلّم اُمّی پکار کر کہتا تھا،

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (صف) جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو

وہ خود اپنی تعلیم کا آئینہ تھا، انسانوں کے مجمع عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا، گھر کے خلوت کدہ میں وہ اُسی طرح نظر آتا تھا، اخلاق وعمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا، وہ خود اس کا عملی پیکر بنجاتا تھا، بیوی سے بڑھکر انسان کے اخلاق کا اور کون رازداں ہو سکتا ہے۔ چند صاحبوں نے آکر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرت کے اخلاق بیان کیجیے، انھوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ ان خلق رسول اللہ صلعم کان القرآن، آپکا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا،[1]

موجودہ صحائف آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں، لیکن کیا اُنکا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدّعی ہے قرآن مجید لاکھوں مخالفین اور اہل عناد کی بھیڑ میں اپنے داعیِ حق کی نسبت گویا تھا،

---

[1] ابوداؤد باب الصلوٰۃ فی اللیل،-

إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ — اے محمد تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔

بیدرد نکتہ چیں آج تیرہ سو برس کے بعد آپ کو سنگدل کہتے ہیں، لیکن اُسوقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا قرآن جو دشمنوں کے مجمع میں آپ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا،

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا — خدا کی عنایت سے تم اُن سے نرمی سے پیش آتے ہو اگر تم کہیں

غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران) — کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے۔

دوسری جگہ کہتا ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ — تمہارے پاس تم میں سے جو ایک پیغمبر آیا، اسپر تمہاری تکلیف بہت

مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ) — شاق گذرتی ہے، تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے، اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے

مسئلۂ اخلاق کی نسبت ایک بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف رحم و رافت اور تواضع و خاکساری کو معیار اخلاق کا مظہر قرار دیدیا گیا، حالانکہ اخلاق وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر تہ میں اور واقعات کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ، صغیر و کبیر، مفلس و تونگر، صلح و جنگ، خلوت و جلوت، غرض ہر جگہ اور ہر ایک تک دائرہ اخلاق کی وسعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عنوان اخلاق پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے)

اخلاق نبوی کا جامع بیان (اس سے پہلے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مبارکہ کے جزئی اور تفصیلی واقعات لکھے جائیں، اُن صاحبوں کے بیانات زیر تحریر آتے ہیں، جنھوں نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں سالہا سال اور مدتہائے دراز بسر کی ہیں اور جو آپ کے اخلاق و عادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف تھے، انسان کے حالات کا واقف کار بیوی سے بڑھکر دنیا میں کون ہوسکتا ہے، حضرت **خدیجۃ الکبریٰ** جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ۲۵ برس تک آپ کی خدمت زوجیت میں رہی تھیں، زمانۂ آغاز وحی میں آپ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں "ہرگز نہیں، خدا کی قسم، خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلۂ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اُٹھاتے ہیں غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی

حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں[1]"

امہات المومنین میں حضرت عائشہ سے بڑھکر کسی نے آپ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کئے ہیں فرماتی ہیں "آنحضرت صلعم کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی، بُرائی کے بدلہ میں بُرائی نہیں کرتے تھے، بلکہ درگذر کرتے تھے اور معاف فرمادیتے[2] تھے، آپ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا، تو اُن میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے۔ بشرطیکہ وہ گناہ نہو، ورنہ آپ اُس سے بہت دور ہوتے، آپ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا، خدا اُس سے انتقام لیتا[3] تھا، (یعنی خدا کی طرف سے بموجب احکام ربانی آپ اُسپر حد جاری فرماتے تھے) آپ نے نام لیکر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی آپ نے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو، خادم کو، جانور[4] کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، آپ نے کبھی کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی، لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو[5]، آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، ہنستے اور مسکراتے ہوئے، دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے[6]، باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے[7]"۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آنحضرت صلعم کے تربیت یافتہ تھے، اور آغاز نبوت سے آخر عمر تک کم از کم ۲۳ برس آپ کی خدمت اقدس میں رہے تھے، ایک دفعہ حضرت امام حسینؑ نے اُن سے آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا۔ فرمایا "آپ خندہ جبیں، نرم خو، مہرباں طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، بات بات پر تشدد نہیں کرتے تھے، کوئی بُرا کلمہ منھ سے کبھی نہیں نکالتے تھے، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ کے ناپسند ہوتی تو اُس سے اغماض فرماتے تھے، کوئی آپ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس بناتے تھے، اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے، (یعنی صراحۃً انکار و تردید نہیں کرتے تھے، بلکہ خاموش رہتے تھے،

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] جامع ترمذی و شمائل ترمذی، [3] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الادب
[4] یہ تفصیل مسلم اور ابوداؤد وغیرہ احادیث کے مختلف روایات میں حضرت عائشہ سے مروی ہے [5] حاکم بہ سند متصل، اسکے بعض ٹکڑے صحیح مسلم میں بھی ہیں [6] ابن سعد [7] صحیح بخاری و مسلم و ابوداود۔

اور مزاج شناس آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ جاتے تھے) اپنے نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کر دی تھیں
بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا، اور جو بات مطلب کی ہو اس میں پڑنا، دوسروں کے متعلق بھی تین
باتوں سے پرہیز کرتے تھے کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات
کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جس سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا، جب آپ کلام کرتے صحابہ
اسطرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپ چپ ہو جاتے تو پھر وہ
آپس میں باتیں چیتیں کرتے، کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا، چپ سنا کرتے، لوگ جن باتوں پر
ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے، جن پر لوگ تعجب کرتے، آپ بھی کرتے، کوئی باہر کا آدمی اگر بیبا کی سے گفتگو کرتا تو آپ
تحمل فرماتے، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی آپ کے احسان و انعام کا
شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے، جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اسکی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے[1]،
نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعۃً آپکو دیکھتا تو مرعوب
ہو جاتا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا"[2]

ہند بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت صلعم کے آغوش پروردہ تھے وہ بیان کرتے ہیں[3] کہ "آپ نرم خو تھے سخت
مزاج نہ تھے کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے کسی چیز کو بُرا نہیں
کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے، اور اس کو بُرا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا
تو آپ کو غصہ آجاتا اور اسکی پوری حمایت کرتے، لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی
سے انتقام لیا"

مداومت عمل | (اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اسپر اس قدر استقلال
کے ساتھ قایم رہے کہ گویا وہ اُسکی فطرت ثانیہ بن جائے۔ انسان کے سوا دنیا کی تمام مخلوقات صرف ایک ہی

---

[1] یہ پوری تفصیل شمائل ترمذی، بیان اخلاق میں ہے [2] تذکرہ شمائل ترمذی، بیان حلیۂ مبارک میں ہے [3] شمائل ترمذی

قسم کا کام کر سکتی ہے اور وہ فطرۃً اُسی پر مجبور ہے، آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے، اُس سے تاریکی کا صدور نہیں ہو سکتا، رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے، وہ روشنی کی علت نہیں، درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں اور پھول ایامِ بہار ہی میں پھولتے ہیں۔ حیوانات کا ایک ایک فرد اپنی نوعی افعال و اخلاق سے ایک سرِ مو تجاوز نہیں کر سکتا لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے، وہ آفتاب بھی ہے، اور رات کی تاریکی بھی، اُس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے، اور اُس کے اخلاق کے پھول ایامِ بہار کے پابند نہیں۔ وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے اعمال و اخلاق پر مجبور نہیں، اسکو اختیار دیا گیا ہے، اور یہی اختیار اُس کے مکلف اور ذمہ دار ہونے کا راز ہے۔

لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے، اُسکی اس شدت سے پابندی کرے، اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے، کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اُس سے یہ افعال اُس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی۔ درخت سے پھل، اور پھول سے خوشبو، کہ یہ خصوصیات اُن سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں، اسی کا نام استقامت حال اور مداومتِ عمل ہے۔

آنحضرت صلعم اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ نے شروع فرمایا، اُس پر برابر شدت کے ساتھ قایم رہتے تھے، سُنّت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے، سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت صلعم نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اُسکو ترک نہیں فرمایا، اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپکی استقامت حال اور مداومت عمل کی ناقابل انکار مثالیں ہیں، آپ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، جس سے یہ معلوم ہوا ہو گا کہ آپ کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے، کہ کبھی تمام عمر اس میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا، ایک دفعہ ایک

شخص نے آنحضرت صلعم کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کسی خاص دن یہ کرتے تھے؟ اُنھوں نے جواب دیا لا کان عملہ دیمۃ آپکا عمل جھڑی ہوتا تھا، یعنی جس طرح بادل کی جھڑی جب برسنے پر آتی ہے تو نہیں رُکتی اسی طرح آپ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپنے اختیار کر لی ہمیشہ اسکی پابندی کی، پھر فرمایا وایکم یستطیع ما کان النبی صلعم یستطیع آنحضرت صلعم جو کر سکتے تھے وہ تم میں سے کون کر سکتا ہے[1]، دوسری روایت میں ہے؛

وکان اذا عمل عملاً اثبتہ[2] — جب آنحضرت صلعم کوئی کام کرتے تھے تو اسپر مداومت فرماتے تھے۔

اسلیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو ارشاد[3] ہے

ان احب العمل الی اللہ ادومہ، — خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ کام ہے جسپر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے

آپ راتوں کو اُٹھکر عبادت کیا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت صلعم نے کبھی رات کی یہ عبادت ترک نہیں کی؛ اگر کبھی مزاج اقدس ناساز یا سُست ہوا تو بیٹھکر ادا کرتے[4] تھے، جریر بن عبداللہ ایک صحابی ہیں جنکو دیکھکر آپ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے، انکا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہوا کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپ نے مسکرا نہ دیا ہو[5]،

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپ نے مقرر کر لیا تھا اس میں کبھی تخلف نہوا، نماز اور تسبیح و تہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب اور بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز و انداز میں کبھی فرق نہیں آیا اور اب وہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے)۔

حسن خلق (حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ہند بن ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپکی خدمت میں رہے تھے، ان سب کا متفقاً بیان ہے کہ آپ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق، اور نیکو سیرت تھے آپکا چہرہ ہنستا تھا، وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے،)

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق [2] ابو داؤد آخر کتاب الصلوٰۃ و صحیح بخاری کتاب الادب۔ [3] ایضاً، [4] ابو داؤد قیام اللیل [5] صحیح مسلم مناقب جریر بن عبداللہ

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اُس وقت تک اُسکی طرف سے رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود مُونھہ نہ ہٹالے مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا، یعنی کسی سے ہات ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے اُس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہمنشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے[1]،

اکثر نوکر چاکر، لونڈی غلام خدمت اقدس میں پانی لیکر آتے کہ آپ اس میں ہات ڈالدیں تاکہ متبرک ہوجائے جاڑوں کے دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپ کبھی انکار نہ فرماتے[2]،

ایک دفعہ آپ سعد بن عبادہ سے ملنے گئے، واپس آنے لگے تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ قیس کو ساتھ کردیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہمرکاب جائیں۔ آنحضرت صلعم نے قیس سے کہا، تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہولو، اُنھوں نے بے ادبی کے لحاظ سے تامل کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ یا سوار ہولو، یا گھر کو واپس جاؤ وہ واپس چلے آئے[3]،

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی، آپ نے اُس کو اپنے ہاں مہمان رکھا، اور خود بنفس نفیس مہمانداری کے تمام کام انجام دیے صحابہ نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے، ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گذاری کی ہے، اس لیے میں خود انکی خدمت گذاری کرنی چاہتا ہوں[4]

عتبان بن مالک جو اصحاب بدر میں تھے، انکی بینائی میں فرق آگیا تھا، آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر درخواست کی کہ میں اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں، لیکن جب بارش ہوجاتی ہے تو مسجد تک جانا مشکل ہوجاتا ہے اس لیے اگر آپ میرے گھر میں تشریف لاکر نماز پڑھ لیتے تو میں اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنالیتا، دوسرے دن صبح کے وقت آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر اُنکے گھر گئے، دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا، اندر سے جواب آیا

---

[1] ابوداؤد و ترمذی، [2] صحیح مسلم باب قرب النبی صلے اللہ علیہ وسلم من الناس [3] سنن ابوداؤد کتاب الادب، [4] شرح شفای قاضی عیاض بحوالہ دلائل بیہقی، جلد اخلاق۔

تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ اُنھوں نے جگہ بتا دی، آپ نے تکبیر کہکر دو رکعت نماز ادا کی، نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لیے اصرار کیا، حریرہ ایک کھانا ہوتا ہے، قیمہ پر چھڑک کر طیار کرتے ہیں وہ سامنے آیا، محلہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوئے، حاضرین میں سے کسی نے کہا مالک بن دخشن نظر نہیں آتے، ایک نے کہا وہ منافق ہے، ارشاد فرمایا یہ نہ کہو، وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں، لوگوں نے کہا ہاں لیکن اُس کا میلان منافقین کی طرف ہے، آپ نے فرمایا جو شخص خدا کی مرضی کے لیے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اُس پر آگ کو حرام کر دیتا ہے[1]،

(ابتدائے ہجرت میں خود آنحضرت صلعم اور تمام مہاجرین، انصار کے گھر مہمان رہے تھے، دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اُتاری گئی تھی **مقداد بن الاسود** کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جس میں خود آنحضرت صلعم شامل تھے، گھر میں چند بکریاں تھیں جن کے دُودھ پر گذارہ تھا، دُودھ دُوہ چکتا تو سب لوگ اپنے اپنے حصّہ کا پی لیتے اور آپ کے لیے پیالہ میں چھوڑ دیتے، ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی، لوگ دُودھ پی کر سو رہے، آپ نے آکر دیکھا تو پیالہ خالی پایا، خاموش ہو رہے، پھر فرمایا، خدایا جو آج کھلا دے اُسکو تو بھی کھلا دیا، حضرت **مقداد** چھری لیکر کھڑے ہوئے کہ بکری کو ذبح کر کے گوشت پکائیں، آپ نے روکا اور بکری کو دوبارہ دُوہ کر جو کچھ نکلا اُسی کو پی کر سو رہے[2]، اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی،)

ابو شعیب ایک انصاری تھے، اُنکا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا، ایک دن وہ خدمت اقدس میں آئے آپ صحابہ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے، اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا، **ابو شعیب** نے جاکر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا طیار کرو، کھانا طیار ہو چکا تو آکر آنحضرت صلعم سے درخواست کی کہ صحابہ کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں کل پانچ آدمی تھے، راہ میں ایک اور شخص ساتھ ہو لیا، آنحضرت صلعم نے ابو شعیب سے

[1] بخاری جلد ا صفحہ ۶۱ کتاب الصلوۃ [2] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴

کہا کہ یہ شخص بے کہے ساتھ ہولیا ہے، تم اجازت دو تو یہ بھی ساتھ آئے، ورنہ رخصت کر دیا جائے، انھوں نے کہا آپ اِن کو بھی ساتھ لائیں۔[۱]

عقبہ بن عامر ایک صحابی تھے ایک دفعہ آنحضرت صلعم پہاڑ کے درہ میں اونٹ پر سوار جا رہے تھے یہ بھی ساتھ تھے، آنحضرت صلعم نے اُن سے کہا کہ "آؤ سوار ہولو" اُنھوں نے اس کو گستاخی سمجھا کہ رسول اللہ کو پیادہ ساکر خود سوار ہوں، آنحضرت صلعم نے دوبارہ کہا، اب انکار کرنا امتثال امر کے خلاف تھا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُتر پڑے اور یہ سوار ہو لیے۔[۲]

مجالس صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے، حضرت زینب سے جب نکاح ہوا، اور دعوت ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اس وقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور حضرت زینب بھی محلس میں شریک تھیں، آپ چاہتے تھے کہ لوگ اُٹھ جائیں لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپ اُٹھ کر حضرت عائشہ کے حجرہ تک گئے، واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے، اور دوبارہ تشریف لائے، پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری۔[۳]

غزوۂ حنین سے واپس آرہے تھے کہ راہ میں نماز کا وقت آگیا، حسب دستور ٹھہر گئے، مؤذّن نے اذان دی **ابومحذورۃ** جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے چند دوستوں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے، اذان سنکر سب نے چلّا چلّا کر استہزا کے طور پر اذان کی نقل اتارنی شروع کی، آنحضرت صلعم نے سب کو بلوا کر ایک ایک سے اذان کہلوائی ابومحذورہ خوش لحن تھے اُن کی آواز پسند آئی، سامنے بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا، اور برکت کے لیے دعا کی، پھر اُن کو اذان سکھلا کر ارشاد فرمایا کہ جاؤ اسی طرح حرم میں اذان دیا کرنا۔[۴]

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں، میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں

---

[۱] بخاری صفحہ ۸۲۱، [۲] نسائی صفحہ ۳۰۸، [۳] بخاری صفحہ ۹۲۲، باب آیۃ الحجاب، [۴] دارقطنی، مطبوعۂ دہلی، جلد اول صفحہ ۸۶ کتاب الصلوٰۃ۔

گراتا، لوگ مجھکو خدمتِ اقدس میں لے گئے، آپ نے پوچھا ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟ میں نے کہا کھجوروں کے لیے، ارشاد فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہکر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی،[۱]

عباد بن شرحبیل مدینہ میں ایک صاحب تھے، ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے اور خوشے توڑ کر کچھ کھائے، کچھ دامن میں رکھ لیے، باغ کے مالک کو معلوم ہوا تو اُس نے آکر انکو مارا اور کپڑے اُتروا لیے یہ آنحضرتؐ کے پاس شکایت لیکر آئے، مدعا علیہ بھی ساتھ تھا۔ آپ نے اُسکی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ یہ جاہل تھا، اسکو تعلیم دینا تھا، یہ بھوکا تھا، اس کو کھانا کھلانا تھا، یہ کہکر کپڑے واپس دلوائے، اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا۔[۲]

یہود کا دستور تھا کہ عورتوں کو جب ایام آتے تو انکو گھروں سے نکال دیتے، اور اسکے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے آنحضرت صلعم جب مدینہ میں تشریف لائے، تو انصار نے آپ سے اس کے متعلق سوال کیا اسپر آیت اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے، اس بناپر آپ نے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں، یہودیوں نے آپ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے صحابہ آپ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں۔ رخسارۂ مبارک غصہ سے سُرخ ہوگیا، دونوں صاحب چلے گئے، آپ نے اُن کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں اُسوقت اُن کو تسکین ہوئی کہ آپ ناراض نہ تھے۔[۳]

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اُس کے سامنے اُس کا تذکرہ نہ فرماتے ایک دفعہ ایک صاحب زرد کپڑے پہنکر خدمت میں حاضر ہوئے، آپنے کچھ نہ فرمایا، جب وہ اُٹھکر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ اِنسے کہدینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں[۴]

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا اچھا آنے دو وہ اپنے قبیلہ کا اچھا

---

[۱] ابو داؤد کتاب الجہاد [۲] ابو داؤد جلد ۲ کتاب الجہاد۔ [۳] ابو داؤد باب مواکلۃ الحائض [۴] ابو داؤد جلد ۲ کتاب الادب،

آدمی نہیں ہے لیکن جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اُس سے گفتگو فرمائی، حضرت عائشہ کو اس پر تعجب ہوا اور آپ سے دریافت فرمایا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق و ملاطفت کے ساتھ کلام کیا، آپ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے بُرا وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اُس سے ملنا جُلنا چھوڑ دیں[1]

یہود جس درجہ شقی اور دشمن اسلام تھے، اس کا اندازہ گذشتہ واقعات سے ہو چکا ہوگا، باایں ہمہ آنحضرت صلعم ان سنگدلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے اور اُن سے داد و ستد رکھتے، سخت سے سخت غصّہ کی حالت میں صرف اس قدر فرماتے "اسکی پیشانی خاک آلودہ ہو"[2]

حضرت **جابر بن عبداللہ** انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا جس سے میں قرض لیا کرتا تھا، ایکسال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں، اور قرضہ ادا نہ ہو سکا، اُس پر پورا سال گذر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا، اب کی بھی پھل کم آئے میں نے آیندہ فصل کی مہلت مانگی، اُس نے انکار کیا، میں نے آنحضرتؐ سے آکر تمام واقعات بیان کیے، آپ چند صحابہ کے ساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دیدو اُس نے کہا، ابوالقاسم میں کبھی مہلت نہ دونگا آپ نخلستان میں تشریف لے گئے اور ایک چکّر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے، اور اُس سے گفتگو کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا، بالآخر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ چبوترہ پر (جو مسقّف تھا) فرش بچھا دو، اُس پر آرام فرمایا اور سو گئے، سوکر اُٹھے تو پھر یہودی سے خواہش کی کہ مہلت دیدے۔ اُس شقی نے اب بھی نہ مانا۔ اب آپ درختوں کے جھنڈ میں جاکر کھڑے ہو گئے، اور جابر سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کرو، آنحضرت صلعم کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرضہ ادا کرکے بچ رہیں[3]۔

(مجلس نبوی میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے آکر بیٹھ جاتے تھے ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اُس کے لیے آپ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے، ایک دفعہ مقام جعرانہ

---

۱ صحیح بخاری و ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب ۲ ادب المفرد امام بخاری ۳ بخاری صفحہ ۱۰۸ باب الرطب والتمر۔

میں آنحضرت صلعم تشریف فرماتھے، اور اپنے ہاتھ سے لوگوں کو گوشت تقسیم فرمارہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور آپ کے پاس چلی گئی، آنحضرت صلعم نے دیکھا تو اسکی نہایت تعظیم کی، اپنی چادر مبارک اُس کے لیے بچھادی راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون عورت تھی، تو لوگوں نے کہا یہ حضور کی رضاعی ماں تھیں۔[1]

اسی طرح ایک دفعہ کا اور ذکر ہے کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) تشریف فرما تھے کہ آپ کے رضاعی والد آئے، آپ نے اُن کے لیے چادر کا ایک گوشہ بچھادیا، پھر رضاعی ماں آئیں، آپ نے دوسرا گوشہ بچھادیا آخر میں رضاعی بھائی آئے، تو آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنکو اپنے سامنے بٹھالیا۔[2]

حضرت ابوذر مشہور صحابی ہیں، ایک دفعہ انکو بلا بھیجا تو وہ گھر میں نہیں ملے، تھوڑی دیر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو آپ لیٹے ہوئے تھے، انکو دیکھکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگالیا۔[3] حضرت جعفر جب حبشہ سے واپس آئے تھے تو آپ نے اُنکو گلے لگالیا اور انکی پیشانی کو بوسہ دیا۔[4]

سلام میں پیشدستی فرماتے، راستہ میں جب چلتے تو مرد، عورتیں بچے جو سامنے آتے اُنکو سلام کرتے،[5] ایک دفعہ آپ راستہ سے گذر رہے تھے ایک مقام پر مسلمان اور منافق و کافر یکجا بیٹھے ملے آپ نے سبکو سلام کیا۔[6]

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لیکر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے، کہ لوگ ایسا کرتے ہیں لوگ ایسا کہتے ہیں بعض لوگوں کی یہ عادت ہے۔ یہ طریقۂ ابہام اسلئے اختیار فرماتے تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہو اور اُس کے احساس غیرت میں کمی نہ آجائے۔

حسن معاملہ | اگرچہ غایت فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ کی زرہ مَن بھر غلہ پر ایک یہودی کے ہاں گرو تھی، لیکن ہر حال میں حسن معاملہ کا سخت اہتمام تھا، مدینہ میں دولتمند عموماً یہودی تھے، اور اکثر انہی سے آپ قرض لیا کرتے یہودی عموماً دنی الطبع اور سخت گیر ہوتے ہیں آپ اُن کی ہر قسم

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب بر الوالدین۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب باب المعانقہ [4] حوالۂ سابق [5] بخاری و ابوداؤد باب السلام [6] بخاری باب السلام علی جماعۃ فیہا الکافر۔

کی بدمزاجیاں برداشت فرماتے تھے،

(نبوت سے پہلے جن لوگوں سے آپ کے تاجرانہ تعلقات تھے، انھوں نے ہمیشہ آپ کی دیانت اور حسنِ معاملہ کا اعتراف کیا ہے اسی لیے قریش نے متفقاً آپ کو **امین** کا خطاب دیا تھا، نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض وکینہ کے جوش سے لبریز تھے، تاہم انکی دولت کے لیے مامون مقام آپ ہی کا کاشانہ تھا، عرب میں سائبؓ نام ایک تاجر تھے وہ مسلمان ہوکر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوے، لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپ سے انکا تعارف کرایا، آپ نے فرمایا میں" انکو تم سے زیادہ جانتا ہوں"، سائب نے کہا میرے ماں باپ فدا، آپ میرے ساجھی تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا[1]،)

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں، چند روز کے بعد وہ تقاضا کو آیا آپ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اُس کا قرضہ ادا کردیں، انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اُسے دی تھیں، اُس شخص نے لینے سے انکار کیا، انصاری نے کہا تم رسول اللہ کی عطا کردہ کھجور کے لینے سے انکار کرتے ہو، بولا ہاں، رسول اللہ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے، آنحضرت صلعم نے یہ جملے سنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے[2]

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرضہ آنحضرت صلعم پر تھا، بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں اُسے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی صحابہ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تجھکو خبر ہے تو کس سے ہمکلام ہے، بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں آنحضرت صلعم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے، کیونکہ اُس کا حق ہے (قرضخواہ کو بولنے کا حق ہے، اس کے بعد صحابہ کو اُس کا قرض ادا کردینے کا حکم فرمایا اور زیادہ دلوایا[3])

ایک غزوہ میں حضرت عبداللہ بن جابر انصاری ہمرکاب تھے، انکی سواری میں جو اونٹ تھا سست رو تھا اور تھک جانے کی وجہ سے اور بھی سست ہوگیا تھا، آپ نے اونٹ اُن سے خرید لیا اور دام کے ساتھ

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۲۱ [2] ترغیب و ترہیب بحوالہ مسند احمد صفحہ ۲۳ مطبوعہ مصر جلد ۲ ۔ [3] ابن ماجہ باب لصاحب الحق سلطان

اونٹ بھی ان کو دیدیا کہ دونوں تمہارے ہیں۔[1]

(یہی واقعہ ایک روایت میں اس طرح پر ہے کہ آنحضرت صلعم نے اُن سے فرمایا تمہارے پاس کوئی لکڑی ہو تو دو، انھوں نے دی، آپ نے اُس سے اونٹ کو مارا تو وہ اس قدر تیز دوڑنے لگا کہ سب سے آگے نکل گیا، پھر آنحضرت صلعم نے اُن سے چار دینار پر اونٹ اس شرط پر خرید لیا کہ مدینہ تک ان کو سواری کا حق ہے، مدینہ پہنچکر جابر بن عبداللہ نے قیمت طلب کی آپ نے بلالؓ سے فرمایا کہ انکو قیمت چار دینار اور اس سے کچھ اور زیادہ بھی دو، چنانچہ حضرت بلالؓ نے چار دینار پر ایک قیراط سوا اور زیادہ دیا۔[2])

معمول تھا کہ کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے فرماتے کہ میت پر کچھ قرضہ تو نہیں ہے، اگر معلوم ہوتا کہ مقروض تھا، تو صحابہ سے فرماتے تم جنازہ کی نماز پڑھا دو، خود شریک نہ ہوتے۔[3]

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا، جب واپس کیا تو اُس سے بہتر اونٹ واپس کیا اور فرمایا کہ سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو حسن معاملگی سے ادا کرتے ہیں۔[4]"

ایک دفعہ کسی شخص سے ایک پیالہ مستعار لیا، سوء اتفاق سے وہ گم گیا تو اُس کا تاوان ادا فرمایا۔[5]

عموماً فرمایا کرتے تھے کہ میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا بجز دس دینار کے جنکو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں۔[6]"

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلعم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں آپ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اُسنے واویلا مچائی کہ ہائے بددیانتی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بددیانتی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں چھوڑ دو، اُسکو کہنے کا حق ہے

[1] بخاری صفحہ ۲۸۲ باب شری الدواب [2] صحیح بخاری کتاب الوکالہ، [3] صحیح بخاری صفحہ ۸۰۹ کتاب النفقات، [4] ترمذی صفحہ ۱۶۷، [5] ترمذی صفحہ ۱۶۷ - [6] بخاری جلد ا صفحہ ۳۲۱ کتاب الاستقراض۔

پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا، اُس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ نے فرمایا اُسکو کہنے دو اُس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دُہراتے رہے، اس کے بعد آپ نے ایک انصاریہ کے ہاں اُسکو بھجوا دیا، کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لیکر پلٹا تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم وعفو، اور حسنِ معاملت سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا، محمدؐ! تمکو خدا جزائے خیر دے تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی[۱]"

ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آکر فروکش تھا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اُسکے ساتھ تھا، اتفاقاً اُدھر سے آپ کا گذر ہوا آپ نے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی، بے مول تول کئے آنحضرت صلعم نے وہی قیمت منظور کرلی اور اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے، بعد کو لوگوں کو خیال آیا کہ بے جان پہچان ہمنے جانور کیوں حوالہ کردیا، اور اس حماقت پر اب پورے قافلہ کو ندامت تھی، قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، اُسنے کہا مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا، یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو آپ نے اُن کے لیے کھانا اور قیمت بھر کھجوریں بھجوادیں[۲]۔

غزوۂ حنین میں آپکو کچھ اسلحہ کی ضرورت تھی، صفوان اُسوقت تک کافر تھے، اُنکے پاس بہت سی زرہیں تھیں آپنے اُنسے کچھ زرہیں طلب کیں، اُنھوں نے کہا محمد! کیا کچھ غصب کا ارادہ ہے؟ فرمایا نہیں، میں عاریۃً مانگتا ہوں، اگر ان میں سے کوئی تلف ہوئی تو میں تاوان دوں گا، چنانچہ اُنھوں نے تیس چالیس زرہیں مسلمانوں کو عاریۃً دیں، حنین سے واپسی کے بعد جب اسلحہ اور دیگر سامانوں کا جائزہ لیا گیا تو کچھ زرہیں کم نکلیں، آپ نے صفوان سے کہا، تمہاری چند زرہیں کم ہیں، انکا معاوضہ لے لو، صفوان نے عرض کی یا رسول اللہ صلعم میرے دل کی حالت اب پہلی جیسی نہیں[۳]، یعنی مسلمان ہوگیا، اب معاوضہ کی حاجت نہیں،)

عدل وانصاف | کوئی شخص گوشہ نشین ہوکر بیٹھ جائے تو اُس کے لیے عدل وانصاف سے کام لینا نہایت آسان ہے آنحضرت صلعم کو عرب کے سیکڑوں قبایل سے کام پڑتا تھا، یہ آپس میں ایک ایک کے دشمن تھے، ایک کے موافق

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۶۸
[۲] دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ کتاب البیوع
[۳] ابوداؤد باب تضمین العاریہ

فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بن جاتا، اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہمیشہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو تالیف قلوب سے کام لینا پڑتا، ان سب مشکلات اور پیچیدگیوں پر بھی عدل و انصاف کا پلہ کبھی کسی طرف جھکنے نہ پاتا

فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا جس نے گردن تسلیم خم نہیں کی، آنحضرت صلعم نے اس کا محاصرہ کیا لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اُٹھا لینا پڑا، صخر ایک رئیس تھے اُن کو یہ حال معلوم ہوا تو خود جا کر طائف کی حصار بندی کی اور اہلِ شہر کو اس قدر دبایا کہ بالآخر وہ مصالحت پر راضی ہو گئے۔ صخر نے بارگاہِ نبوت میں اطلاع کی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئے کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو اُن کے گھر بھیجا دو، اس کے بعد بنو سلیم آئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے، صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ہم اسلام لائے ہمارا چشمہ ہم کو دلا دیا جائے، آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے اس لیے ان کو انکا چشمہ دیدو، صخر کو منظور کرنا پڑا، راوی کا بیان ہے کہ جب آنحضرتؐ کے حکم سے صخر نے دونوں حکم منظور کیے، تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلعم کے چہرہ پر شرم سے سرخی آگئی[1]، کہ صخر کو دونوں معاملوں میں شکست ہوئی، اور فتح طائف کا انکو کوئی صلہ نہ ملا

ایک دفعہ ایک عورت نے جو خاندانِ مخزوم سے تھی، چوری کی، قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دَب جائے، حضرت اُسامہ بن زید رسول اللہؐ کے محبوب خاص تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجیے، اُنھوں نے آنحضرت صلعم سے معافی کی درخواست کی، آپ نے غضب آلود ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غربا پر حد جاری کرتے اور امراء سے درگزر کرتے تھے،[2]

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہو کر وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو عبداللہ بن سہل ایک دفعہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گئے، مُحیّصہ ان کے چچیرے بھائی بھی ساتھ تھے، عبداللہ گلی میں جا رہے تھے کہ کسی نے ان کو قتل کر کے لاش ایک گڈھے میں ڈال دی، مُحیّصہ نے آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر استغاثہ کیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا "تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے انکو قتل کیا، بولے "میں نے اپنی آنکھ سے

[1] ابوداؤد صفحہ ۸ جلد ۲

[2] صحیح بخاری کتاب الحدود

نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا تو یہود سے حلف لیا جائے؟ بولے، حضرت یہودیوں کی قسم کا اعتبار کیا، یہ تو دفعۃً جھوٹی قسم کھالیں گے"

خیبر میں یہود کے سوا اور کوئی قوم آباد نہ تھی، یہ یقینی تھا کہ یہودیوں نے ہی عبداللہ بن سہل کو قتل کیا ہے تاہم چونکہ عینی شہادت موجود نہ تھی آنحضرت صلعم نے یہود سے تعرض نہیں فرمایا اور خونبہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے[1]۔

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب اسلام عرب میں پھیلنا شروع ہوا تو ہم چند آدمی ربذہ سے نکلے، اور مدینہ کو روانہ ہوئے، شہر کے قریب پہنچکر مقام کیا، ہماری سواری بھی ساتھ تھی، ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے، اور سلام علیک کی، ہمنے سلام کا جواب دیا، ہمارے ساتھ سرخ رنگ کا اونٹ تھا، اسکی قیمت پوچھی، ہمنے جواب دیا اتنی کھجوریں، اُنھوں نے کچھ مول تول نہیں کیا اور وہی قیمت منظور کرلی، پھر اونٹ کی مہار پکڑکر شہر کی طرف بڑھے، نظروں سے اوجھل ہوگئے تو سبکو خیال آیا کہ دام رہ گئے اور ہم لوگ انکو پہچانتے نہیں، لوگوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرانا شروع کیا، محمل نشین خاتون نے کہا، مطمئن رہو، ہمنے کسی شخص کا چہرہ، اس قدر چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن نہیں دیکھا، (یعنی ایسا شخص دغا نہ دیگا) رات ہوئی تو ایک شخص آیا کہ رسول اللہ نے تمہارے لیے کھانا اور کھجوریں بھیجی ہیں، دوسرے دن صبح کو ہملوگ مدینہ میں آئے آنحضرت صلعم مسجد میں خطبہ دے رہے تھے ہملوگوں کو دیکھکر ایک انصاری نے اُٹھکر کہا یا رسول اللہ! یہ لوگ بنو ثعلبہ کے قبیلہ کے ہیں اور ان کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کردیا تھا، اس کے بدلہ میں انکا ایک آدمی قتل کرادیجیے، آپ نے فرمایا، باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جاسکتا[2]۔

سرق ایک صحابی تھے، انھوں نے ایک بدوی سے ایک اونٹ مول لیا، لیکن قیمت نہ ادا ہوسکی، بدو ان کو پکڑکر آنحضرت صلعم کی خدمت میں لے گیا، اور واقعہ بیان کیا، آنحضرت صلعم نے حکم دیا کہ قیمت ادا کردو، انھوں نے ناداری کا عذر کیا، آپ نے بدو سے کہا بازار میں لیجاکر انکو فروخت کرلو، بدو انکو بازار میں لیگیا، ایک صاحب نے دام دیکر بدو سے ان کو خریدا اور آزاد کردیا[3]۔

---

[1] یہ واقعہ بخاری ونسائی وغیرہ میں (باب القسامۃ) میں باختلاف الفاظ مذکور ہے [2] دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۳۰۷ و ۳۰۸ [3] دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۳۱۴

(ابو حدرد اسلمی ایک صحابی تھے، جن پر ایک یہودی کا قرض آتا تھا، اور اُن کے پاس بدن پر جو کپڑے تھے، اُنکے سوا کچھ نہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلعم خیبر کی مہم کا ارادہ کر رہے تھے، ابو حدرد نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی لیکن وہ نہ مانا، اور انکو پکڑ کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں لایا، آپ نے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کردو، انھوں نے عذر کیا، آپ نے پھر فرمایا، انھوں نے پھر یہی جواب دیا، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ غزوۂ خیبر قریب ہی، شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے تو میں اسکو ادا کردوں، آپ نے پھر بھی حکم دیا کہ فوراً ادا کردو، آخر ایک تہمد اُس یہودی کو قرض میں نذر کیا، اور سر سے جو عمامہ بندھا تھا اس کو کھولکر کمر سے لپیٹ لیا[۱]

اس عدل و انصاف کا یہ اثر تھا کہ مسلمان ایک طرف، یہود بھی جو آپ کے شدید ترین دشمن تھے، اپنے مقدمات اسی بارگاہ عدالت میں لاتے تھے[۲]، اور ان کی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا، چنانچہ قرآن مجید میں اس واقعہ کا مصرح ذکر ہے، اسلام سے پہلے یہودیاں بنو نضیر و قریظہ میں عزت و شرافت کی ایک عجیب و غریب حد قائم تھی کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کرتا تو قصاص میں وہ مارا جاتا، لیکن اگر کوئی قریظی کسی نضیری کے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس کے خون کی قیمت سو بار شتر چھوہارا تھی، اسلام میں جب یہ واقعہ پیش آیا تو قریظہ نے آنحضرت صلعم کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپ نے فوراً توراۃ کے آئین کے مطابق اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ کے حکم سے دونوں قبیلوں میں برابر کا قصاص جاری کردیا[۳]

عدل و انصاف کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ خود اپنے مقابلہ میں بھی حق کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے، ایک بار آپ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، لوگوں کا گرد و پیش ہجوم تھا، ایک شخص آکر منہ کے بل آپ پر لد گیا، دست مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی آپ نے اُس سے اُسکو ٹھوکا دیا، اتفاق سے لکڑی کا سرا اُس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آگئی فرمایا مجھسے انتقام لے لو، اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے معاف کردیا[۴]

۱؎ مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۴۲۳ معجم صغیر طبرانی معجم عبدان ۲؎ ابو داؤد، باب تضمین العاریۃ جلد ثانی، ۳؎ ابو داؤد، کتاب الدیات
۴؎ ابو داؤد، باب القود بغیر حدید۔

مرض الموت میں آپ نے عام مجمع میں اعلان کیا کہ اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی کی جان ومال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو تو میری جان ومال آبرو حاضر ہے، اسی دنیا میں وہ اپنا انتقام لے لے، مجمع میں سناٹا تھا، صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو دلوا دیئے گئے،[1]

جود وسخا جود وسخا آپ کی فطرت تھی، ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے، اور خصوصاً رمضان کے مہینہ میں آپ اور زیادہ سخاوت فرماتے تھے،[2] تمام عمر کسی کے سوال پر "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا،[3] آپ فرمایا کرتے تھے،

انما انا قاسم وخازن واللہ یعطی، (بخاری) — میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں دینا اللہ ہے،

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں آیا، اور دیکھا کہ دور تک آپ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے، اُس نے آپ سے درخواست کی اور آپ نے سب کی سب دیدیں اُس نے اپنے قبیلہ میں جاکر کہا اسلام قبول کرلو، محمد صلعم ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پرواہ نہیں کرتے،[4]

ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا، آپ نے فرمایا اسوقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، تم میرے ساتھ آؤ، حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے، عرض کی کہ آپکے پاس کچھ موجود نہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے، ایک اور صاحب حاضر تھے انہوں نے کہا یا رسول اللہ آپ دیئے جائیے اور عرش والے خدا سے نہ ڈریئے، وہ آپ کو محتاج نہ کرے گا، آپ فرط بشاشت سے مسکرا دیئے۔[5]

(عام فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اگر آپکے پاس کچھ سرمایہ موجود رہتا تو اُس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے، ورنہ وعدہ کرتے، اس معمول کی بنا پر لوگ اِس قدر دلیر ہوگئے تھے کہ ایک مرتبہ عین اقامتِ نماز کے وقت ایک بدّو آیا اور آپ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں اسکو پورا کر دیجیے، چنانچہ آپ اُس کے ساتھ تشریف لے گئے، اور اُسکی

---

[1] ابن اسحاق بروایت ابن ہشام [2] صحیح بخاری باب جود الرسول، [3] صحیح بخاری بدء الوحی [4] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا
[5] صحیح مسلم صفحہ ۲۹ [6] شمائل ترمذی

حاجت براری کرکے آئے تو نماز پڑھی[۱]۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے، قیمت چکا دینے کے بعد پھر وہ چیز اسکو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا، اور پھر اسی وقت اسکو عبداللہ بن عمر کو دیدیا[۲]، حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے[۳]۔

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے، بلکہ تمام صحابہ کو شریک فرمالیتے، کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابہ ہمراہ تھے، آپ نے ایک بکری خرید فرماکر ذبح کروائی اور کلیجی کے بھونے کا حکم دیا، وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ کو تقسیم فرمایا، جو لوگ موجود نہ تھے ان کا حصہ الگ محفوظ رکھا[۴]،

جو چیز آں حضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آتی، جب تک صرف نہ ہو جاتی آپ کو چین نہ آتا، بیقراری سی رہتی، ام المومنین ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم گھر میں تشریف لائے تو چہرہ متغیر تھا، ام سلمہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! خیر ہے؟ فرمایا کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہوگئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے[۵]،

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ ایک شب کو وہ آنحضرت صلعم کے ساتھ ایک راستہ سے گذر رہے تھے آنحضرت صلعم نے فرمایا، ابوذر! اگر اُحد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی یہ پسند نہ کرونگا کہ تین راتیں گذر جائیں اور میرے پاس، ایک دینار بھی رہ جائے، لیکن ہاں وہ دینار جس کو میں ادائے قرض کے لیے رکھ چھوڑوں[۶]۔

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کردیجاتی گھر میں آرام نہ فرماتے، رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ بار کرکے خدمت نبوی میں بھیجا، حضرت بلالؓ نے بازار میں غلہ فروخت کرکے ایک یہودی کا قرض تھا وہ ادا کیا، پھر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آکر

---

۱ ادب المفرد امام بخاری ۲ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۸۴ ۳ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۸۲ ۴ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۹،
۵ مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۹۳ ۶ صحیح بخاری کتاب الاستقراض صفحہ ۳۲۱۔

اطلاع کی، آپ نے پوچھا کچھ بچ تو نہیں رہا، بولے ہاں کچھ بچ بھی رہا، فرمایا جب تک کچھ باقی رہیگا میں گھر نہیں جا سکتا حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا میں کیا کروں کوئی سائل نہیں آنحضرت صلعم نے مسجد میں رات بسر کی، دوسرے دِن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آکر کہا، یا رسول اللہ خدا نے آپ کو سبکدوش کر دیا، یعنی جو کچھ تھا وہ بھی تقسیم کر دیا گیا، آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اُٹھکر گھر تشریف لے گئے[1]

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھکر خلاف معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے، لوگوں کو تعجب ہوا، آپ نے فرمایا مجھکو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے اس لیے جا کر اُس کو خیرات کر دینے کو کہہ آیا۔[2]

غزوۂ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت صلعم اُس کو خیرات فرما کر واپس آرہے تھے، راہ میں بدوؤں کو خبر لگی کہ ادھر سے آنحضرت صلعم کا گذر ہونے والا ہے، آس پاس سے دوڑ دوڑ کر آئے اور لپٹ گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو، آپ اژدحام سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے، انھوں نے ردائے مبارک تھام لی، بالآخر اس کشاکش میں جسم اطہر سے چادر اُتر کر اُن کے ہاتھ میں رہ گئی، فیاضِ عالم نے کہا، میری چادر دیدو، خدا کی قسم، اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے تو میں سب تمکو دیدیتا اور پھر مجھکو بخیل نہ پاتے نہ دروغگو نہ نامرد۔[3]

لوگوں کو حکم عام تھا کہ جو مسلمان مرجائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کروں گا، اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے[4]، مجھے اُس سے کوئی مطلب نہیں

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک بدو آیا اور آپ کی چادر کا گوشہ زور سے کھینچکر بولا محمدؐ! یہ مال نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے ایک بار شتر دے، آپ نے اُس کے اونٹ کو جَو اور کھجوروں سے لدوا دیا[5]

---

[1] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین [2] صحیح بخاری باب من صلی بالناس فذکر حاجة (یفکر الرجل الشیٔ فی الصلوٰة) [3] صحیح بخاری باب الشجاعة فی الحرب، [4] صحیح بخاری [5] ابو داؤد کتاب الادب،

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اس قدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دارالاسلام میں نہیں آئی تھی آپ نے حکم دیا کہ اس کو صحن مسجد میں ڈلوا دو، اس کے بعد جب آپ مسجد میں تشریف لائے تو آپ نے مڑکر بھی نظر نہ ڈالی، نماز سے فارغ ہوکر آپ نے اُسکی تقسیم شروع کی جو سامنے آتا اُس کو دیتے چلے جاتے، حضرت عباس کو جو غزوۂ بدر کے بعد دولتمند نہیں رہے تھے اتنا دیا کہ اُٹھا کر چل نہیں سکتے تھے، اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے، جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے[۱]،

اسلام میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام مرجائے تو اس کا ترکہ آقا کو ملتا ہے، ایک دفعہ آپکا اسی قسم کا ایک غلام مرگیا لوگ اُس کا متروکہ سامان اُٹھا کر آپ کے پاس لائے، آپنے دریافت فرمایا کہ کوئی اس کا یہاں ہموطن ہے، لوگوں نے کہا ہاں ہے، آپ نے فرمایا یہ تمام چیزیں اُسی کے حوالہ کردو[۲]۔

ایک دفعہ چند انصار نے آپ سے کچھ مانگا، آپنے دیدیا پھر مانگا پھر دیا، پھر جب تک رہا آپ دیتے رہے، یہاں تک کہ آپ کے پاس کچھ نہیں رہا، لیکن وہ ما وجود اس کے حاضر ہوئے اور درخواست کی، فرمایا میرے پاس جو کچھ ہو میں اُسکو تم سے بچا کر نہیں رکھونگا[۳]،

ایثار آپ کے اخلاق وعادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا، اولاد سے آپ کو بے انتہا محبت تھی اور اُن میں حضرت فاطمہ زہراؓ اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرط محبت سے کھڑے ہوجاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم حضرت فاطمہؓ کی عسرت اور تنگدستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں اور خود ہی پانی کی مشک بھرلاتیں چکی پیستے پیستے ہتیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے، ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں، خود تو پاسِ حیا سے عرض حال نہ کرسکیں، جنابِ امیرؓ نے اُن کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں اُن میں سے ایک کنیز ملجائے، آپ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحاب صُفّہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ باب القسمۃ، [۲] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۷۰، [۳] صحیح بخاری صفحہ ۱۹۸ کتاب الصدقات۔

اُن کا سد دوست نہ ہونے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیر کی صاحبزادیاں اور حضرت فاطمہ زہراؓ خدمت اقدس میں گئیں اور اپنے افلاس و تنگدستی کی شکایت کرکے عرض کی کہ اس غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں اُن میں سے ایک دو ہمکو ملجائیں آپ نے فرمایا بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے،[2]

(ایک دفعہ حضرت علی نے کسی امر کی درخواست کی فرمایا یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تمکو دوں اور اہل صفہ[3] کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹ پھریں

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لاکر پیش کی، آپ کو ضرورت تھی آپ نے لے لی، ایک صاحب حاضر خدمت تھے، اُنھوں نے کہا کیا اچھی چادر ہے، آپ نے اتار کر انکو دیدی، جب اُٹھکر چلے گئے تو لوگوں نے انکو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلعم کو چادر کی ضرورت تھی، یہ بھی جانتے ہو کہ آنحضرت صلعم کسی کا سوال رد نہیں کرتے، اُنھوں نے کہا ہاں لیکن میں نے تو برکت کے لیے لیا ہے کہ مجھکو اسی چادر کا کفن دیا جائے[4]،

زہد و قناعت کے عنوان سے جو واقعات لکھے گئے ہیں اُن سے ظاہر ہوگا کہ آنحضرت صلعم کس عُسرت اور تنگدستی میں بسر فرماتے تھے، ۳ھ کے بہت بعد فتوحات کو وسعت حاصل ہوئی ہے، عرب میں باغات سب سے بہتر جائداد تھے، ۳ھ میں[5] یہود بنو نضیر میں سے مخیریق نامی، ایک شخص نے اپنے سات باغ، مثیب، صائفہ، دلال، حسنی، برقہ، اعواف، مشربۂ ام ابراہیم، مرتے وقت آنحضرتؐ کو وصیت کر دیے، آپ نے سب کو خیرات کر دیا، یعنی وہ خدا کی راہ میں وقف تھے، جو کچھ پیدا ہوتا تھا غربا اور مساکین کو دیدیا جاتا تھا[6]،

ایک صحابی نے شادی کی، سامان ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا، آنحضرت صلعم نے اُن سے فرمایا کہ

---

۱ روایت کتب احادیث (سنن ابی داؤد وغیرہ) میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہ کو ایک دعا بتادی کہ یہ لونڈی سے بڑھکر ہے ۲ ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۴۳۔ ۳ مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۷۹، ۴ صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا، وباب من استعد الکفن۔ ۵ فتح الباری شرح کتاب الفرائض۔ ۶ اصابہ تذکرہ مخیریق۔

عائشہ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جاکر لے آئے، حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا[۱]

ایک دفعہ ایک غفاری آکر مہمان ہوا، رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپ نے اسکے نذر کردیا، یہ تمام رات خانہ نبوی میں فاقہ سے گذری، حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا[۲])

مہمان نوازی (عرب کے مختلف اطراف اور صوبوں سے جوق جوق لوگ بارگاہ نبوی میں آتے تھے، رملہ ایک صحابیہ تھیں، اُنکا گھر دارالضیوف تھا[۳]، یہیں لوگ مہمان اُترتے تھے، ام شریک جو ایک دولت مند اور فیاض انصاریہ تھیں ان کا گھر بھی گویا ایک مہمان خانہ تھا[۴]، مخصوص لوگ مسجدِ نبوی میں اُتارے جاتے تھے، چنانچہ وفد ثقیف یہیں اُترا تھا، آنحضرت صلعم خود بنفس نفیس ان مہمانوں کی خاطرداری اور تواضع فرماتے تھے، یوں بھی جو لوگ حاضر ہوتے تھے بغیر کچھ کھائے پیے واپس نہ آتے تھے[۵]،

فیاضی میں کافر و مسلمان کا امتیاز نہ تھا، مشرک و کافر سب آپ کے مہمان ہوتے اور آپ یکساں انکی مہمان نوازی کرتے، جب اہل حبشہ کا وفد آیا تو آپ نے خود اپنے ہاں انکو مہمان اُتارا، اور خود بنفس نفیس اُن کی خدمت کی[۶]، ایک دفعہ ایک کافر مہمان ہوا، آپ نے ایک بکری کا دودھ اُسے پلایا، وہ سارے کا سارا پی گیا، آپ نے دوسری بکری منگوائی وہ بھی کافی نہ ہوئی، غرض سات بکریوں تک نوبت آئی، جب تک وہ سیر نہ ہوا آپ پلاتے گئے[۷]،

کبھی ایسا ہوتا کہ مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود رہتا وہ انکی نذر ہوجاتا، اور تمام اہل و عیال فاقہ کرتے[۸]، آپ راتوں کو اُٹھ اُٹھکر اپنے مہمانوں کی خبرگیری کرتے تھے[۹])

صحابہ میں سب سے مفلس اور نادار گروہ اصحاب صفہ کا تھا، وہ مسلمانوں کے مہمان عام تھے لیکن ان کو زیادہ تر

---

[۱] مسند احمد ج ۴ ص ۵۸۔ [۲] مسند احمد جلد ۶ ص ۳۹۷ [۳] زرقانی ذکر وفود، [۴] مسلم جلد ۲ ص ۵۱۹ [۵] شمائل ترمذی،
[۶] شفاے قاضی عیاض بسند متصل، [۷] صحیح مسلم باب المؤمن یاکل فی معی، [۸] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۳۹۷ [۹] ابوداؤد کتاب الادب،

خود آنحضرت صلعم کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا، ایک بار آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو آدمی کا کھانا ہو وہ اُن میں سے تین آدمی کو اور جس کے پاس چار آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے پانچ آدمی کو ساتھ لیجائے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ تین آدمی کو ساتھ لائے، لیکن آنحضرت صلعم دس آدمیوں کو ہمراہ لے گئے[۱]،

اصحاب صفہ میں حضرت ابوہریرہؓ اپنے فقر وفاقہ کی داستان نہایت درد انگیز طریقہ سے بیان کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز شدت گرسنگی کی حالت میں گذرگاہ عام پر بیٹھ گیا، حضرت ابوبکرؓ راستے سے گذرے تو میں نے بطور حسن طلب کے اُن سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی، لیکن وہ گذر گئے اور میری حالت کی طرف توجہ نہیں کی، حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور وہی نتیجہ ہوا۔ اس کے بعد آنحضرت صلعم کا گذر ہوا تو آپ مجھکو دیکھکر مسکرائے اور فرمایا کہ میرے ساتھ ساتھ آؤ، آپ گھر میں پہونچے تو دودھ کا ایک پیالہ نظر آیا، آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ کسی نے ہدیۃً بھیجا ہے، آپ نے مجھ سے کہا کہ اصحاب صفہ کو بُلالاؤ میں ان کو بُلا لایا تو آپ نے مجھکو دودھ کا وہ پیالہ دیا کہ سب کو تقسیم کردو[۲]،

آنحضرت صلعم کے گھر میں ایک پیالہ اس قدر بھاری تھا کہ اس کو چار آدمی اُٹھا سکتے تھے، جب دوپہر ہوتی تو وہ پیالہ آتا اور اصحاب صفہ اُس کے گرد بیٹھ جاتے یہاں تک کہ جب زیادہ مجمع ہوجاتا تو آنحضرت صلعم کو اُکڑوں بیٹھنا پڑتا کہ لوگوں کے لیے جگہ نکل آئے[۳]۔

مقدادؓ کا بیان ہے کہ میں اور میرے دو رفیق اس قدر تنگ دست تھے کہ بھوک سے بینائی جاتی رہی، ہم لوگوں نے اپنے تکفل کی درخواست کی لیکن کسی نے منظور نہیں کیا، آخر ہم لوگ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ دولت خانہ پر لواگئے، اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو، چنانچہ ہم میں ہر شخص دُودھ دُوہ کر اپنا اپنا حصہ پی لیا کرتا تھا[۴]،

(ایک دن اصحاب صفہ کو لیکر حضرت عائشہؓ کے گھر پہنچے، اور فرمایا کھانے کو جو کچھ ہو لاؤ، جو کی پکا ہوا کھانا

[۱] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲ [۲] ترمذی صفحہ ۹۹ ۲- [۳] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [۴] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۰-

سامنے لاکر رکھا گیا، آپ نے کھانے کی کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا، اس کے بعد بڑے پیالہ میں دودھ حاضر کیا گیا، اور یہی سامان مہمانی کی آخری قسط تھی[1])

گداگری اور سوال سے نفرت | باوجود اس کے کہ آپ کا ابرِ کرم ہر وقت برستا رہتا تھا، تاہم کسی کا بے ضرورتِ شدید سوال کرنا آپ پر سخت گراں ہوتا تھا، ارشاد فرماتے کہ "اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لائے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے[2]"

(ایک دفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا آپ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ بولے کہ بس ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا اور کچھ بچھا لیتا ہوں، اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے، آپ نے دونوں چیزیں منگوائیں، پھر فرمایا یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے دو درم لگائے، آپ نے فرمایا اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہے؟ ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیے، آپ نے دونوں چیزیں دیدیں، اور درہم انصاری کو دیئے، کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ، اور دوسرے سے رسّی خریدو، اور جنگل سے لکڑیاں لاکر شہر میں بیچو، پندرہ دن کے بعد وہ خدمتِ اقدس میں آئے تو دس درہم اُنکے پاس جمع ہو گئے تھے، اس سے کچھ کپڑا خریدا، کچھ کا غلہ مول لیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا "یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے[3]"

ایک دفعہ چند انصاری آئے اور سوال کیا، آپ نے عنایت فرمایا، پھر جب تک کچھ رہا، آپ نے اُنکی درخواست رد نہیں فرمائی، جب کچھ نہیں رہا، تو آپ نے فرمایا، میرے پاس جب تک کچھ رہے گا، میں تم سے بچا کر اس کو نہیں رکھونگا، لیکن جو شخص اللہ سے یہ دعا مانگے کہ وہ اس کو سوال و گداگری کی ذلت سے بچائے، تو وہ اُسکو بچا دیتا ہے، اور جو خدا سے غنا کا طالب ہوتا ہے، وہ اس کو غنا مرحمت فرماتا ہے، اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے، اور صبر سے کوئی بہتر اور وسیع تر دولت کسی کو نہیں دی گئی ہے[4]،

حکیمؓ بن حزام فتح مکہ میں اسلام لائے تھے، ایک دفعہ اُنھوں نے آپ سے کچھ طلب کیا، آپ نے عنایت فرمایا،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] صحیح بخاری کتاب الصدقات صفحہ ۱۹۹ [3] ابوداؤد و ترمذی صدقات [4] صحیح بخاری صفحہ ۱۹۸ کتاب الصدقات،

کچھ دن کے بعد پھر مانگا، آپ نے پھر انکو دیا، تیسری دفعہ پھر سوال کیا، آپ نے پھر کچھ مرحمت کیا، اسکے بعد فرمایا "اے حکیم! یہ دولت سرسبز و شیریں ہے، جو استغنا کے ساتھ اسکو قبول کرتا ہے، اسکو برکت ملتی ہے، اور جو حرص و طمع کے ساتھ اسکو حاصل کرتا ہے، وہ اُس سے محروم رہتا ہے، اور اسکی مثال اُس شخص کی جیسی ہے جو کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، دستِ بالا، دستِ زیریں سے بہتر ہے" حکیمؓ پر آنحضرت صلعم کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ جب تک زندہ رہے کبھی کسی سے کوئی معمولی چیز بھی نہیں مانگی[1]،

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلعم صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آکر شامل ہوئے، آپ نے انکی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور ہاتھ پاؤں کے درست معلوم ہوئے، آپ نے فرمایا "اگر تم چاہو تو میں اسمیں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لایق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے[2]"

قبیصہ نام ایک صاحب تھے، وہ مقروض ہو گئے تھے، آپ کے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپ نے وعدہ کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا، اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے ایک اُس شخص کو جو قرض سے زیر بار ہو، وہ مانگ سکتا ہے، لیکن جب اُسکی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رُک جانا چاہئے، دوسرے اُس شخص کو جسپر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آگئی جس نے اس کے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اُس کو اُس وقت تک مانگنا جائز ہے، جب تک اُسکی حالت کسی قدر درست ہو جائے، تیسرے وہ شخص جو مبتلاے فاقہ ہو اور محلہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اسکو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے[3]

صدقہ سے پرہیز آنحضرت صلعم اپنے اور اپنے خاندان کے لیے صدقہ و زکوٰۃ لینے کو سخت موجب ننگ و عار سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ میں گھر میں آتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجور پاتا ہوں، جی میں آتا ہے کہ اُٹھا کر منھ میں ڈال لوں، پھر خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو، اس لیے ڈال دیتا ہوں[4]"

---

[1] صحیح بخاری صفحہ ۱۹۹ کتاب الصدقات، [2] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ، [3] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ [4] بخاری جلد ا صفحہ ۳۲۰ کتاب اللقطہ۔

ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آگئی، فرمایا، اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا تو میں اُس کو کھا جاتا،[1]

ایک بار امام حسن علیہ السلام نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی، آپ نے ڈانٹ کر کہا کیا تمھیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا،[2] پھر منہ سے اُگلوا دیا،

آپ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لیکر آتا تو دریافت فرماتے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر ہدیہ کہتا، قبول فرماتے، اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ، تو آپ ہاتھ روک لیتے، اور دوسرے صاحبوں کو عنایت فرما دیتے،)

ہدایا اور تحفے قبول کرنا

(دوست واحباب کے ہدایا اور تحفے آپ قبول فرماتے تھے، بلکہ آپ نے اس کو ازدیاد محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے،

تہادوا وتحابوا (حدیث) باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو، تو باہم محبت ہوگی

اسی لیے صحابہ عموماً کچھ نہ کچھ روز آپ کے گھر بھیجا کرتے تھے، اور خصوصیت کے ساتھ اُس دن بھیجتے تھے، جس دن آپ حجرۂ عائشہ میں قیام فرماتے تھے،[3] اوپر گذر چکا ہے کہ کوئی چیز آپ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ دریافت فرماتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ کہتا تو قبول فرماتے، ورنہ احتراز کرتے،[4] ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمت اقدس میں پیش کی، آپ نے لے لی، اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی آپ نے انکو عنایت فرما دی،[5])

آس پاس کے ملوک وسلاطین بھی آپ کو تحفے بھیجا کرتے تھے، حدود شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا، عزیزِ مصر نے بھی ایک خچر مصر سے بھیجا تھا، ایک امیر نے موزے آپ کو بھیجے تھے

ایک دفعہ قیصر روم نے آپ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی جسمیں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی، آپ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی۔ پھر اتار کر حضرت جعفر (حضرت علی کے بھائی) کے پاس بھیجدی، وہ پہنکر خدمتِ اقدس

---

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۸۳ کتاب اللقطہ [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۲ کتاب الصدقات [3] بخاری مناقب عائشہ [4] صحیح بخاری کتاب الصدقہ [5] صحیح بخاری کتاب الجنائز

میں آئے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس لیے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو" عرض کی پھر کیا کروں، ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی **نجاشی** کو بھیجدو[1]، حضرت جعفر ایک مدت یعنی فتح خیبر تک حبش میں رہے تھے اور نجاشی نے انہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی

ہدایا اور تحفے دینا | (جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے تھے انکو ان کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے، حضرت عائشہ سے روایت ہے کان یقبل الھدیۃ ویثیب علیھا، آنحضرت صلعم ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا معاوضہ دیتے تھے) یمن کا مشہور بادشاہ ذی **یزن** جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی، اُس نے آنحضرت صلعم کو ایک قیمتی حُلّہ بھیجا، جس کو اُس نے ۳۳، اونٹوں کے بدلہ میں خریدا تھا، آپ نے قبول فرمایا اور پھر اس کو ایک حُلّہ ہدیۃً بھیجا جو ۲۰، اونٹ دیکر خریدا گیا تھا[2]

(ایک دفعہ قبیلۂ بنی فزارہ کے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں ہدیۃً ایک اونٹنی پیش کی، آپ نے اُسکا صلہ دیا تو وہ سخت ناراض ہوا، آپ نے منبر پر کھڑے ہوکر خطاب عام کیا اور فرمایا کہ تم لوگ مجھے ہدیہ دیتے ہو اور میں بقدر استطاعت اس کا صلہ دیتا ہوں تو ناراض ہوتے ہو، آیندہ قریش، انصار، ثقیف اور دوس کے سوا کسی قبیلۂ عرب کا ہدیہ قبول نہ کروں گا۔[3]

حضرت ابوایوب انصاری جن کے مکان میں آپ چھ مہینے تک فروکش رہے تھے، آپ اکثر انکو پکا ہوا کھانا بھیجا کرتے[4]، ہمسایوں اور بیوہ عورتوں کے گھروں میں بھی تحفے بھیجتے تھے، اصحاب صفہ اکثر آپکے تحفوں سے مشرف ہوا کرتے تھے،

عام قبول احسان | کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے، حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر جان نثار کون ہوسکتا تھا، تاہم ہجرت کے وقت جب اُنھوں نے سواری کے لیے ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمت ادا کی[5]، مدینہ میں مسجد کے لیے جو زمین درکار تھی، مالکان زمین نے مفت نذر کرنی چاہی تھی، لیکن آپ نے قیمت دیکر لی،

ایک دفعہ عبداللہ بن عمر اور حضرت عمرؓ دونوں ہمسفر تھے، عبداللہ بن عمر کی سواری کا اونٹ سرکش تھا، اور آنحضرت صلعم کے ناقہ سے آگے نکل نکل جاتا تھا، عبداللہ بن عمر روکتے تھے، لیکن وہ قابو کا نہ تھا، حضرت عمرؓ بار بار عبداللہ بن عمر کو ڈانٹتے تھے، آنحضرت صلعم نے حضرت عمرؓ سے کہا یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچڈالو" انھوں نے کہا کہ نذر ہے، آپ نے فرمایا نہیں دام لو

[1] ابوداؤد صفحہ ۲۰۵ جلد دوم
[2] ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۴۰۲
[3] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۰۱
[4] مسلم کتاب الاطعمہ
[5] بخاری صفحہ ۵۵۳

اُنھوں نے دوبارہ عرض کی کہ یوں ہی حاضر ہے، آپ نے انکار کیا، بالآخر حضرت عمر نے دام لینے منظور کیے، آپ نے خرید کر عبداللہ بن عمر کو دیدیا کہ اب یہ تمہارا ہے[1]،

عدم تشدد

حضرت معاذ بن جبل (جو اکابر صحابہ میں سے تھے) ایک محلہ میں امامت کرتے، اور نماز فجر میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے شکایت کی کہ وہ اِس قدر لمبی نماز پڑھتے ہیں کہ میں اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں، ابومسعود انصاری کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلعم کو کبھی اس قدر غصناک نہیں دیکھا جسقدر اسموقع پر دیکھا، آپ نے لوگوں سے خطاب کرکے فرمایا بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کردیتے ہیں، جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے، مختصر پڑھائے، کیونکہ نماز میں بوڑھے، کمزور، کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں[2]،

حدّ و قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے، اور جہاں تک ممکن ہوتا درگذر کرنا چاہتے، ماعز اسلمی ایک صاحب تھے جو زنا میں مبتلا ہوگئے لیکن فوراً مسجد میں آئے اور کہا یارسول اللہ میں نے بدکاری کی، آپ نے منھ پھیر لیا، وہ دوسری سمت سے آئے، آپ نے اور طرف منھ پھیر لیا، آپ بار بار منھ پھیر لیتے اور وہ بار بار سامنے آکر زنا کا اقرار کرتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ تمکو جنون تو نہیں ہے؟ بولے نہیں، پھر پوچھا تمہاری شادی ہوچکی ہے؟ بولے ہاں، آپنے فرمایا کہ تمنے صرف ہاتھ لگایا ہوگا، بولے نہیں، بلکہ مجامعت کی، آخر مجبور ہوکر آپ نے حکم دیا کہ سنگسار کیے جائیں[3]،

ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا، آپ حدّ (سزا) کا حکم دیں، آپ چپ رہے اور نماز کا وقت آگیا، نماز کے بعد انھوں نے پھر آکر وہی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے نماز نہیں پڑھی؟ بولے ہاں، پڑھ لی، ارشاد فرمایا کہ تو خدا نے تمہارا گناہ معاف کردیا[4]۔

ایک دفعہ قبیلۂ غامد کی ایک عورت آئی اور اظہار کیا کہ میں نے بدکاری کی، آپنے فرمایا "واپس جاؤ"، دوسرے دن پھر آئی اور بولی کہ کیا آپ مجکو ماعز کی طرح چھوڑ دینا چاہتے ہیں خدا کی قسم مجکو حمل رہ گیا ہے، آپ نے پھر فرمایا واپس جاؤ، وہ چلی گئی، تیسرے دن پھر واپس آئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے تک انتظار کرو، بچہ جب پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں لیے ہوئے آئی، (یعنی اب زنا کی سزا دینے میں کیا تامل ہے؟) آپنے فرمایا کہ

[1] بخاری صفحہ ۲۸۴
[2] بخاری کتاب الصلوٰۃ و باب الغضب فی الموعظۃ صفحہ ۹۶ ۱
[3] صحیح بخاری
[4] صحیح بخاری کتاب المحاربین صفحہ ۱۰۰۱
[5] بخاری صفحہ ۱

دودھ پینے کی مدت تک انتظار کرو، جب دودھ چھوٹ جائے تب آنا، جب رضاعت کا زمانہ گذر گیا تو پھر حاضر ہوئی، اب آپ نے مجبور ہوکر سنگسار کرنے کا حکم دیا، لوگوں نے اُس پر پتھر برسانے شروع کئے، ایک صاحب کا پتھر اُس کے چہرہ پر لگا اور خون کی چھینٹیں اُڑ کر اُن کے چہرہ پر آئیں، اُنھوں نے اُسکو گالی دی، آنحضرت صلعم نے فرمایا "زبان روکو، خدا کی قسم اُس نے ایسی توبہ کی ہے کہ خراج محصول لینے والا بھی اگر یہ توبہ کرتا تو بخشدیا جاتا"[1]

ایک دن ایک صاحب نے عرض کی کہ ہم لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کے ملک میں رہتے ہیں، کیا انکے برتنوں میں کھانا کھالیا کریں؟ فرمایا اور برتن ہات آئیں تو اُن کے برتنوں میں نہ کھاؤ، ورنہ اُن کو دھو کر کھا سکتے ہو[2]

(ایک بار ایک صحابی نے ماہ رمضان تک کے لیے اپنی بی بی سے ظہار کرلیا، لیکن ابھی یہ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ اُس سے مقاربت کرلی پھر لوگوں کو اس واقعہ کی خبر کی اور کہا مجھے رسول اللہ کی خدمت میں لے چلو، سب نے انکار کردیا، انھوں نے خود آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر واقعہ بیان کیا، آپ نے پہلے تو تعجب ظاہر کیا، پھر ایک غلام کے آزاد کرنے کا حکم دیا، انھوں نے ناداری کا عذر کیا، تو آپ نے متصل دو ماہ تک روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی، اُنھوں نے کہا یہ سب تو رمضان ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اب آپ نے ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے کو فرمایا، انھوں نے کہا ہم تو خود فاقہ کررہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ صدقہ کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمہیں ایک وسق کھجور دیگا، اس میں سے ساٹھ مسکینوں کو دیدینا اور جو بچے وہ اپنے اہل وعیال پر صرف کرنا، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ تم لوگ متشدد اور بدتدبیر تھے، لیکن مجھے رسول اللہ کی خدمت میں حسن رائے اور آسانی نظر آئی،[3]

ایک بار ایک اور صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ میں برباد ہوگیا، روزہ میں اپنی بیوی سے ہمبستر ہوا، آپ نے فرمایا ایک غلام آزاد کرسکتے ہو، کہا نہیں، فرمایا دو مہینے تک متصل روزہ رکھ سکتے ہو؟ کہا نہیں فرمایا ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلاسکتے ہو؟ کہا اسکی بھی قدرت نہیں، آنحضرت صلعم نے تامل فرمایا، کچھ دیر نہ گذری تھی کہ ایک شخص نے کھجوروں کی ایک ٹوکری ہدیۃً پیش کی، آپ نے فرمایا سائل کہاں گیا، سائل نے کہا یا رسول اللہ میں یہ ہوں، فرمایا ان کھجوروں کو

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود، [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۲۳ [3] ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۲۲،

لے جاؤ، اور کسی غریب کو خیرات دیدو، سائل نے عرض کی یا رسول اللہ! مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا، آنحضرت صلعم ہنس پڑے اور فرمایا جاؤ گھر ہی والوں کو کھلادو[1])

تقشف ناپسند تھا رہبانیت اور تقشف کو ناپسند فرماتے تھے، صحابہ میں سے بعض بزرگ میلان طبعی، یا عیسائی راہبوں کے اثر سے رہبانیت پر آمادہ تھے، آنحضرت صلعم نے انکو باز رکھا، بعض صحابہ ناداری کی وجہ سے شادی نہیں کرسکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے اُنھوں نے قطع اعضا کرنا چاہا، آپ نے سخت ناراضی ظاہر کی، قدامہ بن مظعون اور ایک اور صحابی آئے کہ ہم میں سے ایک نے ترک حیوانات اور دوسرے نے ترکِ نکاح کا عزم کرلیا ہے، آپ نے فرمایا کہ میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں، آپ کی مرضی نہ پاکر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے، عرب میں صومِ وصال کا طریقہ مدت سے جاری تھا یعنی کئی کئی دن متصل روزے رکھتے تھے، صحابہ نے بھی اس کا ارادہ کیا، لیکن آپ نے سختی سے روکا، حضرت عبداللہ بن عمرو نہایت مرتاض زاہد تھے، انھوں نے عہد کرلیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا، اور پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے؟ عرض کی "ہاں"، فرمایا کہ "تم پر تمہارے جسم کا حق ہے، آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں"، عبداللہ بن عمرو نے کہا مجھکو اس سے زیادہ طاقت ہے، فرمایا کہ اچھا تو تیسرے دن، بولے میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں، ارشاد ہوا کہ ایک دن بیچ دے کر، کہ یہی داؤدؑ کا روزہ تھا، اور یہی افضل الصیام ہے انھوں نے عرض کی کہ مجھکو اس سے بھی زیادہ قدرت ہے، ارشاد ہوا کہ بس، اس سے زیادہ بہتر نہیں[2]،

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی روزہ داری کا چرچا ہوا تو آنحضرت صلعم خود اُن کے پاس تشریف لے گئے انھوں نے استقبال کیا اور چمڑے کا گدا بچھا دیا، آپ زمین پر بیٹھ گئے، اور اُن سے کہا کہ کیا تم کو مہینہ میں تین روزے بس نہیں کرتے، عرض کی، نہیں، فرمایا پانچ؟ بولے نہیں، غرض آپ بار بار تعداد بڑھاتے جاتے اور وہ اس پر بھی راضی نہ ہوتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ اخیر حد یہ ہے کہ ایک دن افطار کرو اور ایک دن روزہ رکھو[3]،

---

[1] بخاری صفحہ ۲۶ باب اذا جامع فی رمضان [2] صحیح بخاری کتاب الصوم، [3] بخاری کتاب الصوم۔

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ میں جوان آدمی ہوں اور اتنا مقدور نہیں کہ نکاح کروں، نہ اپنے نفس پر اطمینان ہے آنحضرت صلعم چپ رہے، حضرت ابوہریرہ نے پھر انہی الفاظ کا اعادہ کیا، آپ چپ رہے، سہ بارہ کہا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کا حکم ٹل نہیں سکتا،[1]

(قبیلۂ باہلہ کے ایک صاحب آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر واپس گئے پھر سال بھر کے بعد آنے کا اتفاق ہوا، لیکن اتنے ہی زمانہ میں اُن کی شکل وصورت اس قدر بدل گئی کہ آنحضرت صلعم انکو نہ پہچان سکے، انھوں نے اپنا نام بتایا تو آنحضرت صلعم نے تعجب سے پوچھا کہ تم تو نہایت خوش جمال تھے، تمہاری صورت کیوں بگڑ گئی، انھوں نے کہا جب سے آپ سے رخصت ہوا متصل روزے رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک دن کا روزہ کافی ہے، انھوں نے کہا اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں، آپ نے ایک دن کا اور اضافہ کردیا، اُنھوں نے اور اضافہ کی درخواست کی آپ نے تین دن کردیئے، ان کو اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو آپ نے اشہر حرام کے روزوں کا حکم دیا،[2]

ایک دن چند صحابہ، خاص اس غرض سے ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آنحضرت صلعم کی عبادت کے حالات دریافت کریں وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلعم رات دن عبادت کے سوا اور کچھ نہ کرتے ہونگے، حالات سے تو اُس کے معیار کے مواقف نہ تھے، بولے کہ بھلا ہمکو آنحضرت صلعم سے کیا نسبت، اُن کے تو اگلے پچھلے گناہ، سب خدا نے معاف کردیئے ہیں، پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں تو رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزہ رکھوں گا، ایک اور صاحب نے کہا میں کبھی شادی نہیں کرونگا، آنحضرت صلعم سُن رہے تھے، فرمایا کہ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میرے گروہ سے خارج ہے"[3]،

کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گذر ہوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں خدمت

---

[1] بخاری کتاب النکاح [2] ابو داؤد صفحہ ۲۴۲ - [3] صحیح بخاری کتاب النکاح

اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی یا رسول اللہ مجھکو ایک غار ملگیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گزیں ہوکر ترک دنیا کردوں، آپ نے فرمایا میں یہودیت یا نصرانیت لیکر دنیا میں نہیں آیا، میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہوں[1]۔)

عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی

مداحی اور تعریف کو بھی (گو دل سے ہو) ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ مجلس اقدس میں ایک شخص کا مذکور نکلا، حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کی بہت تعریف کی، آپ نے فرمایا تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹی، یہ الفاظ چند بار فرمائے، پھر ارشاد کیا کہ تمکو اگر کسی کی خواہی نخواہی مدح کرنی ہو تو یوں کہو کہ میرا ایسا خیال[2] ہے،

ایک دفعہ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا، حضرت **مقداد** بھی موجود تھے، انھوں نے زمین سے خاک اُٹھا کر اُس کے منہ میں جھونک دی اور کہا کہ ہم کو رسول اللہ نے حکم دیا ہے کہ مداحوں کے منہ میں خاک بھر دیں[3]

ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا، **محجن ثقفی**ؓ سے پوچھا یہ کون ہے، محجن نے اس کا نام بتایا اور نہایت تعریف کی، ارشاد فرمایا کہ دیکھو یہ سن نہ پائے ورنہ تباہ ہو جائیگا، یعنی دل میں غرور پیدا ہوگا جو موجب ہلاکت[4] ہوگا،

ایک دفعہ **اسودؓ بن سریع** جو شاعر تھے، خدمت عالی میں آئے اور عرض کی کہ میں نے خدا کی حمد اور حضور کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں، فرمایا کہ ہاں خدا کو حمد پسند ہے، اسود نے اشعار پڑھنے شروع کیے، اسی اثناء میں کوئی صاحب باہر سے آگئے، آپ نے اسود کو روک دیا، وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے، اسود نے پھر پڑھنے شروع کیے، وہ صاحب پھر آگئے، آپ نے اسود کو پھر روک دیا، دو تین دفعہ یہی اتفاق ہوا، اسود نے عرض کی کہ یہ کون صاحب ہیں جسکے لیے آپ مجھکو بار بار روک دیتے ہیں، فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جو فضول باتیں پسند نہیں کرتا[5]،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶ [2] ادب المفرد صفحہ ۶۶ [3] ایضاً صفحہ ۶۷ [4] ایضاً صفحہ ۶۸ [5] ایضاً،

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر اُن کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے اللھم ایدہ بروح القدس، حالانکہ یہ اشعار آنحضرت کی مدح میں ہوتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے، عرب میں شعرا کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ وہ کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جسکو چاہتے معزز کر دیتے، ابن الزبعری، اور کعب اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت صلعم کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسانؓ کی مداحی انکا ردِ عمل تھا

سادگی اور بے تکلفی | معمول تھا کہ مجلس سے اُٹھ کر گھر میں تشریف لیجاتے تو کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں[1] گے،

دور دور لنگھا کرنا ناپسند فرماتے، ارشاد تھا، کہ ایک دن بیچ دیکر کنگھا کرنا چاہیے،

(کھانے پینے، پہنے اوڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے، کسی چیز میں تکلف نہ تھا، کھانے میں جو سامنے آتا تناول فرماتے، پہنے کو موٹا جھوٹا جو ملجاتا پہن لیتے، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر، جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے[2]، آپ کے لیے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کی جاتی[3] تھی، کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے، لباس میں نمایش کو ناپسند فرماتے تھے، سامانِ آرائش سے آپ طبعاً نفور[4] تھے، غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پیش نظر تھی،)

امارت پسندی سے اجتناب | اسلام رہبانیت اور جوگی پن کا سخت مخالف ہے، لارھبانیۃ فی الاسلام، اسی بنا پر آپ ہر قسم کے جائز حظوظ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے، اور خود بھی کبھی کبھی اُن چیزوں سے تمتع اُٹھاتے تھے، تاہم ناز و نعمت تکلف و عیش پرستی کو ناپسند فرماتے، اور اوروں کو بھی اس سے روکتے،

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی اور کھانا یکوا کر گھر بھیج دیا، حضرت فاطمہ زہراؓ نے کہا کہ رسول اللہ بھی تشریف لاتے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا، حضرت علیؓ گئے اور آپ سے جا کر عرض کی آپ تشریف لائے، لیکن دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھکر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں واپس چلے گئے،

[1] ابو داؤد جلد دوم صفحہ ۲۱۰، [2] دیکھو شمائل، [3] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ صفحہ ۸۱۴ [4] (صحاح کی کتاب اللباس میں متعدد واقعات ہیں)

(حضرت علی نے واپسی کی وجہ دریافت کی تو فرمایا پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی زیب و زینت کے مکان میں داخل ہو،)[1]

فرمایا کرتے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لیے، ایک بیوی کے لیے، اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے،[2]

ایک دفعہ کسی غزوہ میں تشریف لے گئے، حضرت عائشہ رہ گئیں، لڑائی سے واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہ کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھر میں چھت گیر لگی ہوئی ہے، اسی وقت پھاڑ ڈالی، اور فرمایا کہ خدا نے ہمکو دولت اس لیے نہیں دی ہے کہ اینٹ پتھر کو کپڑے پہنائے جائیں،[3]

ایک انصاری نے ایک مکان بنوایا جس کا گنبد بہت بلند تھا، آپ نے دیکھا تو پوچھا کس نے بنایا ہے، لوگوں نے نام بتایا، آپ چپ ہو رہے، جب وہ حسب معمول خدمت اقدس میں آئے اور سلام کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا، انھوں نے پھر سلام کیا، آپ نے پھر منہ پھیر لیا، وہ سمجھ گئے کہ ناراضی کی کیا وجہ ہے، جا کر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا، ایک دن آپ بازار میں نکلے تو گنبد نظر نہ آیا، معلوم ہوا کہ انصاری نے اس کو ڈھا دیا، ارشاد فرمایا کہ ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لیے وبال ہے،[4]

ایک دفعہ کسی نے کمخواب کی قبا بھیجی آپ نے پہن لی، پھر خیال آیا اور اتار کر حضرت عمر کے پاس بھیجدی، حضرت عمر روتے ہوئے آئے، اور عرض کی کہ آپ نے جو چیز ناپسند کی وہ مجھکو عنایت ہوتی ہے، ارشاد ہوا کہ میں نے استعمال کے لیے نہیں بلکہ فروخت کرنے کے لیے بھیجی، چنانچہ حضرت عمر نے فروخت کیا تو دو ہزار دام اٹھے،[5]

ایک دفعہ کسی نے ایک مخطط جوڑا بھیجا، آپ نے حضرت علی کو عنایت فرمایا، وہ پہنکر خدمت اقدس میں آئے، آپ کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوئے، اور فرمایا کہ میں نے اس لیے بھیجا تھا کہ پھاڑ کر زنانی چادریں بنائی جائیں،[6]

مہر کرنے کی ضرورت سے جب آپ نے انگوٹھی بنوائی تو پہلے سونے کی بنوائی، آپ کی تقلید سے صحابہ نے

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۷۱، [2] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۸ کتاب اللباس [3] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۹ [4] ایضاً صفحہ ۳۶۴ [5] و [6] ایضاً کتاب اللباس

بھی زریں انگوٹھیاں بنوائیں، آپ منبر پر چڑھے، اور انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور فرمایا کہ اب نہ پہنوں گا، صحابہ نے بھی اُسی وقت اتار کر پھینک دیں[1]،

(ایک دفعہ آپ کسی غزوہ سے واپس تشریف لائے، حضرت عائشہ نے بطور خیر مقدم کے گھر کی دیوار پر پردہ لٹکا دیا تھا، آپ گھر کے اندر داخل ہوئے تو حضرت عائشہ نے سلام کیا، آپ نے جواب دیا، اور چہرۂ مبارک سے ناراضی کے آثار ظاہر ہونے لگے اس کے بعد آپ پردے کی طرف بڑھے اور اس کو چاک کرکے فرمایا کہ خدا نے ہم کو اینٹ اور پتھر کے منڈھنے کے لیے رزق نہیں دیا ہے[2]۔

ایک دفعہ حضرت فاطمہ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو یہ ناگوار نہ ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی لڑکی کے گلے میں آگ کا ہار ہے[3]،

ایک دفعہ حضرت عائشہ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن (مسکتہ) دیکھے، فرمایا کہ اگر اس کو اتار کر ورس کے کنگن کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتیں تو بہتر ہوتا[4]،

(ایک دفعہ نجاشی نے کچھ زیور آنحضرت صلعم کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے، اُن میں ایک انگوٹھی بھی تھی جس میں حبشی پتھر کا نگینہ جڑا تھا، آپ کے چہرہ پر کراہت کے آثار ظاہر ہوئے تھے، اور لکڑی سے اُس کو چھوتے تھے، ہاتھ نہیں لگاتے تھے[5]

ایک دفعہ کسی نے ریشم کا ستلوکہ ہدیۃً بھیجا، آپ نے پہن لیا، اور اس کو پہنکر نماز ادا فرمائی، نماز سے فارغ ہوکر نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا، پھر فرمایا پرہیز گاروں کے لیے یہ کپڑے مناسب نہیں،

تواضع اور خاکساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے، حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ جمعہ وعیدین میں یا سفراء کے ورود کے موقع پر آپ شان وتجمل کے کپڑے زیب تن فرمائیں، اتفاق سے ایک بار راستہ میں ایک ریشمی کپڑا (حلّۂ سیراء) بک رہا تھا، حضرت عمرؓ نے موقع پاکر عرض کیا، یارسول اللہ! یہ کپڑا حضور خرید لیں

[1] ابوداؤد کتاب الخاتم [2] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۹ [3] نسائی جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ [4] ایضاً [5] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۱۹

اور جمعہ میں اور سفراء کی آمد کے موقع پر ملبوس فرمائیں، ارشاد ہوا کہ یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں،

اکثر موٹے جھوٹے اور بھیڑ کے بال کے بُنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور اُنہی کپڑوں میں وفات بھی پائی،[1] بستر کمل کا تھا، کبھی چمڑے کا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی، کبھی معمولی کپڑا جو دوتہ کر دیا جاتا تھا، حضرت حفصہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شب کو میں نے بستر مبارک چار تہ کر کے بچھایا کہ ذرا نرم ہو جائے، صبح اُٹھکر آنحضرت صلعم نے ناگواری ظاہر فرمائی،[2]

سنہ ۹ھ میں جبکہ یمن سے شام تک صرف اسلام کی حکومت تھی، فرماں روائے اسلام کے گھر میں صرف ایک کھری چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ تھا،[3] حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب آپ نے وفات پائی تو تھوڑے سے جو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا،[4] صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں انسان کے لیے اتنا کافی ہے جتنا ایک مسافر کو زاد راہ کے لیے،[5] ایک دفعہ ایک بوریے پر آپ آرام فرما رہے تھے، اُٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں، عرض کی یا رسول اللہ کیا ہم لوگ کوئی گدا بنوا کر حاضر کریں؟ ارشاد ہوا کہ مجھکو دنیا سے کیا غرض؟ مجھکو دنیا سے اس قدر تعلق ہے جس قدر اُس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لیے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے، پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے،[6]

ایلاء کے زمانہ میں حضرت عمرؓ جب مشربہ میں جو اسباب کی کوٹھری تھی حاضر ہوئے تو اُنکو نظر آیا کہ سرور عالم کے بیت قدس میں دنیاوی ساز و ساماں کی کیا کیفیت ہے؟ جسم مبارک پر صرف ایک تہبند ہے، ایک کھرّی چارپائی بچھی ہے، سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں، ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی ہے، کچھ مشکیزہ کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی ہیں۔ یہ دیکھکر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آنحضرت صلعم

---

[1] اوپر کی تمام روایتیں صحیح بخاری کتاب اللباس سے ماخوذ ہیں۔ [2] شمائل ترمذی [3] صحیح بخاری کتاب اللباس۔ [4] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۰۸ [5] ابن ماجہ کتاب الزہد [6] جامع ترمذی ابواب الزہد

نے رونے کا سبب دریافت فرمایا، عرض کی، یا رسول اللہ صلعم! میں کیوں نہ روؤں، چارپائی کے بان سے جسم اقدس میں بدھیاں پڑ گئی ہیں، یہ آپ کے اسباب کی کوٹھری ہے، اس میں جو سامان ہے وہ نظر آ رہا ہے قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں، اور آپ خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہو کر آپ کے سامان خانہ کی یہ کیفیت ہو، ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! تمکو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت[1]!"

مساوات آپ کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے، سلمانؓ و صہیبؓ و بلالؓ کہ سب کے سب غلام رہ چکے تھے، آپ کی بارگاہ میں رؤسائے قریش سے کم رتبہ نہ تھے، ایک دفعہ حضرت سلمانؓ و بلالؓ ایک موقع پر جمع تھے، اتفاق سے **ابوسفیان** نکلے، ان لوگوں نے کہا ابھی تلوار نے اس دشمن خدا کے گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے کہا، سردار قریش کی شان میں یہ الفاظ! پھر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا، ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فوراً جا کر ان بزرگوں سے کہا، بھائیو! آپ لوگ مجھسے ناراض تو نہیں ہوئے، ان لوگوں نے کہا، نہیں، خدا تم کو معاف کرے[2]،

(قبیلہ **مخزوم** کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی **اسامہ بن زید** جن سے آنحضرت صلعم نہایت محبت رکھتے تھے، لوگوں نے اُن کو شفیع بنا کر خدمت نبوی میں بھیجا، آپ نے فرمایا اسامہ! کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو، پھر آپ نے لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا تم سے پہلے کی اُمتیں اسی لیے برباد ہو گئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو تسامح کرتے، اور معمولی آدمی مجرم ہوتے تو سزا پاتے، خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ سرقہ کرتی تو اُس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے[3]،

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی گرفتار ہو کر آئے تھے، قیدیوں کو رسن بستہ کر رکھا گیا تھا، بعض نیک دل انصار نے اس بنا پر کہ وہ آپ سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں عرض

---

[1] صحیح مسلم کتاب الطلاق باب تخییر الازواج [2] صحیح مسلم فضائل سلمانؓ و صہیبؓ، [3] بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الحدود۔

کی کہ یا رسول اللہ اجازت دیجیے کہ ہم اپنے بھانجے (عباسؓ) کا زرِ فدیہ معاف کر دیں آپ نے فرمایا، نہیں، ایک درہم بھی معاف نہ کرو[1]،

مجلس میں جو چیزیں آتیں ہمیشہ داہنی طرف سے اسکی تقسیم شروع فرماتے، اور ہمیشہ اُس میں امیر و غریب، صغیر و کبیر سب کی مساوات کا لحاظ ہوتا،)

ایک دفعہ خدمتِ اقدس میں صحابہ کا مجمع تھا، اتفاق سے داہنی طرف حضرت **عبداللہ بن عباسؓ** بیٹھے ہوئے تھے، جو بہت کمسن تھے، بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ تھے، کہیں سے دُودھ آیا، آپ نے نوش فرماکر عبداللہ بن عباس سے کہا تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، انھوں نے عرض کی اس عطیہ میں میں ایثار نہیں کر سکتا، چونکہ وہ داہنی جانب تھے اور ترتیبِ مجلس کی رو سے اُنہی کا حق تھا آپ نے اُنہی کو ترجیح دی[2]،

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان پر تشریف لائے اور پینے کو پانی مانگا، میں نے بکری کا دودھ پیش کیا، مجلس کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بائیں جانب، حضرت عمرؓ سامنے اور ایک بدّو داہنی طرف تھا، آپ نے پی لیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کیا، یعنی بقیہ ان کو عنایت ہو، آپ نے فرمایا پہلے داہنی طرف والے کا حق ہے، یہ کہکر بچا ہوا دودھ بدو کو عنایت فرمایا[3]

(قریش اپنے فخر و امتیاز کے لیے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، لیکن آنحضرت صلعم نے اس تفریق کو کبھی پسند نہ فرمایا بعثت سے پہلے[4] اور بعثت کے بعد[5] بھی ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ مقام کرتے تھے، علاوہ بریں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہیں خاص طور سے کوئی عمدہ جگہ دیکھکر آپ کے لیے مخصوص کر دی جائے اور وہاں سایہ کے لیے کوئی چھپر ڈال دیا جائے، صحابہ نے یہ تجویز پیش کی تو فرمایا جو پہلے پہنچ جائے اُسی کا مقام ہے[6]،

صحابہ جب سب ملکر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ آنحضرت صلعم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے، اور معمولی مزدور

---

[1] صحیح بخاری باب فداء المشرکین [2] صحیح بخاری صفحہ ۸۸- [3] بخاری صفحہ ۳۵- [4] ابوداؤد کتاب المناسک، [5] ابوداؤد کتاب المناسک [6] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۸۷

کی طرح کام انجام دیتے، مدینہ آکر سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر تھی، اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہ کی طرح خود آنحضرت صلعم بھی بنفس نفیس شریک تھے، خود اپنے دستِ مبارک سے اینٹ اُٹھا اٹھا کر لاتے تھے، صحابہ عرض کرتے تھے کہ ہماری جانیں قرباں، آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں، لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے[۱]، غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہ مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے، آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے، یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہ جم گئی تھی[۲]

ایک سفر میں کھانا طیار نہ تھا، تمام صحابہ نے ملکر کھانا پکانے کا ساماں کیا، لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا، جنگل سے لکڑی لانے کا کام آنحضرت صلعم نے اپنے ذمہ لیا، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلعم یہ کام ہم خدام کرلیں گے، فرمایا، ہاں سچ ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے کو ممتاز کروں، خدا اُس بندہ کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے[۳]

غزوۂ بدر میں سواریوں کا ساماں بہت کم تھا، تین تین آدمیوں کے بیچ میں ایک ایک اونٹ تھا، لوگ باری باری سے چڑھتے اترتے تھے، آنحضرت صلعم بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو اور آدمیوں کے ساتھ شریک تھے، ہمراہ جان نثار اپنی باری پیش کرتے، اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ آپ سوار رہیں حضور کے بدلہ ہم پیادہ چلیں گے، ارشاد ہوتا کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا چل سکتے ہو، اور میں تم سے ثواب کا محتاج ہوں[۴]

تواضع گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، (گدھے کی سواری سے آپ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا[۵]) ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ اہل عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اُٹھو[۶]

---

[۱] صحیح بخاری باب الہجرۃ وبناء المسجد، [۲] صحیح بخاری باب غزوۂ احزاب، [۳] زرقانی جلد ۴ صفحہ ۳۰۶ بحوالہ سیرت محب طبری، یہ روایت کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ [۴] مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۴۲۲ و مسند ابوداؤد طیالسی [۵] شمائل ترمذی [۶] ابوداؤد و ابن ماجہ

غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جاکر اُنکے ساتھ بیٹھتے صحابہؓ کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بناء پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا، کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے[1]،

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا، لیکن نبوت کا اسقدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں فرشتہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکاکر کھایا کرتی تھی[2]،

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ اکڑوں بیٹھکر کھانا تناول فرماتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں- ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ ہوگئے آپ اکڑوں بیٹھ گئے، کہ جگہ نکل آئے، ایک بدوی بھی مجلس میں شریک تھا، اس نے کہا محمدؐ! یہ کیا طرز نشست ہے؟ آپ نے فرمایا خدا نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے[3]،

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت صلعم اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ بھی نہیں پسند فرماتے تھے، ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ کو خطاب کیا "اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر، اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند!" آپ نے فرمایا لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گمراہ نہ کردے، میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اُس کا رسول مجکو خدا نے جو مرتبہ بخشا، میں پسند نہیں کرتا، کہ تم مجھے اُس سے زیادہ بڑھاؤ[4]،

ایک دفعہ ایک شخص نے آپکو یا خیر البریۃ (یعنی اے بہترین خلق) کہکر مخاطب کیا، آپنے فرمایا وہ ابراہیمؑ[5] تھے،

عبداللہ بن شخیر کا بیان ہے کہ بنی عامر کی سفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمت اقدس میں آئے تو عرض کی کہ حضور ہمارے آقا (سید) ہیں، ارشاد فرمایا کہ "آقا خدا ہے" پھر ہم لوگوں نے عرض کی آپ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، ارشاد ہوا کہ بات کہو تو دیکھ لو کہ شیطان تو تم کو نہیں چلا رہا ہے[6]"

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی، جسکے دماغ میں کچھ فتور تھا آپ کی خدمت میں آئی اور کہا کہ محمدؐ! مجکو تم سے

---

[1] شمائل ترمذی [2] ایضاً [3] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [4] صحیح مسلم باب فضائل ابراہیم [5] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۵۳ [6] ابوداؤد کتاب الادب،

کچھ کام ہے، فرمایا جہاں کہو چل سکتا ہوں، وہ آپ کو ایک کوچہ میں لے گئی، اور وہیں بیٹھ گئی، آپ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے، اور جو کام تھا انجام دے دیا،[1]

مخرمہؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ اُنھوں نے اپنے بیٹے مسوَر سے کہا کہ آنحضرت صلعم کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں آؤ ہم بھی چلیں، آئے تو آپ زنانہ میں تشریف لے جاچکے تھے، بیٹے سے کہا آواز دو، اُنھوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت صلعم کو آواز دوں، مخرمہ نے کہا بیٹے، محمدؐ جبار نہیں ہیں، ان کی جرأت دلانے سے مسوَر نے آواز دی، آنحضرت فوراً نکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زرّین تھیں،[2]

ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ اُس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، یہ سمجھے کہ آنحضرت صلعم پر تعریض ہے، غصہ میں آکر اُس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا، وہ آنحضرت صلعم کے پاس فریادی آیا، آپ نے انصاری کو بلا بھیجا اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ مجھ کو انبیاء پر فضیلت نہ دو۔[3]

(انسان کے غرور و ترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے جیب و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے، جو اُس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب وہ فاتحانہ ایک جرار و پرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے، لیکن آنحضرت صلعم کی تواضع و خاکساری کا منظر اسوقت اور نمایاں ہو جاتا ہے، فتح مکہ کے موقع پر جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو تواضعاً سرِ مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آکر مل گیا،[4] غزوۂ خیبر میں جب آپکا داخلہ ہوا تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال سے رسی تھی،[5] حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپ سوار تھے، سن چکے ہو کہ اسکی قیمت کیا تھی،

تعظیم اور مدح مفرط سے روکتے تھے

(شرک کا پہلا دیباچہ انبیا اور صلحا کی مبالغہ آمیز تعظیم ہے، آنحضرت صلعم اس نکتہ کا بڑا لحاظ

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب، [2] بخاری صفحہ ۸۱۷، [3] بخاری کتاب الانبیاء ذکر موسیٰ [4] شرح شفا قاضی عیاض و سیرت ابن ہشام، [5] مشکوۃ اخلاق النبی صلعم بحوالہ ابن ماجہ و بیہقی۔

فرماتے تھے، حضرت عیسیٰ کی مثال میں بطرتھی، فرمایا کرتے تھے کہ میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جسقدر نصارٰی ابن مریم کی کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اُس کا فرستادہ ہوں[۱]")

قیس بن سعد کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حیرۃ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیسِ شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر میں نے یہ واقعہ بیان کیا، اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کروگے؟ کہا نہیں، فرمایا تو جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیے[۲]۔

معوذ بن عفراء کی صاحبزادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی، تو آپ اُن کے گھر تشریف لے گئے، اور دلہن کے لیے جو فرش بچھایا گیا تھا، اُس پر بیٹھ گئے، گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہوگئیں اور دف بجا بجا کر شہدائے بدر کا مرثیہ گانے لگیں، گاتے گاتے ایک نے یہ مصرع گایا،

فِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ، ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے،

فرمایا یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں[۳]"

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صاحبزادے حضرت **قاسم** نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا، لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اُسکے درد و صدمہ سے کم از کم اجرام سماوی میں انقلاب پیدا ہوجاوے، لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی قسم کے واقعہ پر محمول کیا، ایک جاہ پسند انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہوسکتا تھا، لیکن نبوّت کی شان اس سے بدرجہا ارفع واعلیٰ ہے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اُسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیات قدرت میں ہے کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا[۴]"

(ایک دفعہ آنحضرت صلعم وضو کر رہے تھے، وضو کا پانی جو دست مبارک سے گرتا، فدائی برکت کے خیال سے

---

[۱] صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۴۹ [۲] ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ [۳] صحیح مسلم باب ضرب الدف فی النکاح [۴] صحیح بخاری ومسلم باب صلوٰۃ الخسوف

اُس کو چُلّو میں لے لیکر بدن میں مل لیتے، آپ نے پوچھا کہ تم یہ کیوں کر رہے ہو، انھوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں، فرمایا کہ اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو اُس کو چاہیے کہ جب باتیں کرے، سچ بولے، جب امین بنایا جائے تو ادا امانت کرے، اور کسی کا پڑوسی ہے تو ہمسائیگی کو اچھی طرح نباہے[1]"

ایک صاحب بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا "جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں" ارشاد ہوا تم نے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا، کہو کہ جو خدا تنہا چاہے[2]"

شرم و حیا (صحاح میں ہے کہ آپ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے، اور شرم و حیا کا اثر آپ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی، بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گذر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لبِ مبارک خندۂ و قہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے،)

بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے، چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ متنبہ ہو جاتے،

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم و حیا کا بہت کم لحاظ تھا، ننگے نہانا عام بات تھی، حرم کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں، ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو، لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے، ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کر لیا کرو، عرب میں حمام نہ تھے، لیکن شام و عراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے، وہاں کثرت سے حمام تھے، اس بنا پر آپ نے فرمایا کہ تم جب عجم فتح کروگے تو وہاں حمام ملیں گے اُن میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا،

ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہ کے پاس آئیں انھوں نے وطن پوچھا بولیں **حمص** (شام کا ایک شہر)

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی [2] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۰۵ مصر،

حضرت ام سلمہ نے کہا تم ہی وہ عورتیں ہو جو حمام میں نہاتی ہیں، بولیں کیا حمام کوئی بری چیز ہے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلعم سے سنا ہے کہ جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے خدا اُسکی پردہ دری کرتا ہے[1]، ابو داؤد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے حمام میں نہانے کو مطلقاً منع کر دیا تھا، پھر مردوں کو پردہ کی قید کے ساتھ اجازت دی لیکن عورتوں کے لیے وہی حکم قائم رہا، عرب میں جائے ضرور نہ تھے[2]، لوگ میدانوں میں رفع حاجت کے لیے جایا کرتے تھے، لیکن پردہ نہیں کرتے تھے، بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جایا کرتے، اور ہر قسم کی بات چیت کرتے، آنحضرت صلعم نے اسکی سخت ممانعت کی اور فرمایا کہ خدا اس سے ناراض ہوتا ہے[3]،

معمول تھا کہ رفع حاجت کے لیے اس قدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے، مکہ معظمہ میں جب تک قیام تھا، حدود حرم سے باہر چلے جاتے جس کا فاصلہ مکہ معظمہ سے کم از کم تین میل تھا،

اپنے ہاتھ سے کام کرنا، (اگرچہ تمام صحابہ آپ کے جاں نثار خادموں میں داخل تھے، تاہم آپ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو پسند کرتے تھے، حضرت عائشہ، ابو سعید خدری، اور امام حسن سے روایت ہے کہ کان یخدم نفسہ، یعنی آپ اپنے کام خود اپنے دستِ مبارک سے انجام دیا کرتے تھے[4]، ایک شخص نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ آپ گھر میں کیا کیا کرتے تھے، جواب دیا کہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے تھے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگا لیتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے، بازار سے سودا خرید لاتے تھے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے تھے، ڈول میں ٹانکے لگا دیتے تھے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے، اُسکو چارہ دیتے، غلام کے ساتھ ملکر آٹا گوندھتے[5]،

ایک دفعہ حضرت انس بن مالک خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ خود اپنے ہاتھ سے ایک اونٹ کے

---

[1] یہ تمام روایتیں ترغیب و ترہیب میں کتب حدیث کے حوالہ سے منقول ہیں [2] صحیح بخاری حدیث افک، [3] ابو داؤد و ابن ماجہ [4] شرح شفای قاضی عیاض جلد ۲ صفحہ ۱۱۶ [5] صحیح بخاری کتاب الادب اور باب ما یکون الرجل فی مہنۃ اہلہ میں مجمل ہے قاضی عیاض نے شفا میں متعدد حدیثوں سے لیکر اور ٹکڑے بھی جمع کر دئے ہیں زرقانی نے جلد ۴ صفحہ ۴ ۳ میں مسند ابن احمد و ابن سعد سے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ابن حبان نے اسکو صحیح کہا ہے،

مدل پر تیل مل رہے ہیں، ان سے دوسری روایت ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے ہیں، تیسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ بکریوں کو داغ لگا رہے تھے[1]، ایک دفعہ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے دیکھا تو کسی نے مسجد میں ناک صاف کی ہے، آپ نے خود دستِ مبارک سے ایک کنکر لے کر اُس کو کھرچ ڈالا، اور آیندہ لوگوں کو اس فعل سے منع فرمایا[2]،

آپ جب بچے تھے اور خانۂ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی تو اُسوقت بھی پتھر اُٹھا اُٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے[3]، مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر اور خندق کے کھودنے میں جس طرح عام مزدوروں کے ساتھ مل کر آپ نے کام کیا، خود دستِ مبارک سے جس طرح پتھر اٹھا اٹھا کر دیا اور جس طرح زمین کھودی اسکی تفصیل جلد اول کے واقعات میں گذر چکی ہے، ایک سفر میں صحابہ نے بکری ذبح کی اور اُس کے پکانے کے لیے آپس میں کام بانٹ لیے، آپ نے فرمایا جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا، صحابہ نے تامل کیا، تو فرمایا میں امتیاز پسند نہیں کرتا[4]، ایک اور سفر میں آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا، آپ نے خود اُس کو درست کرنا چاہا، ایک صحابی نے عرض کی، یا رسول اللہ لائیے میں ٹانک دوں، فرمایا یہ تشخص پسندی ہے، مجھے محبوب نہیں ہے[5]، دو صحابی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ خود اپنے دست مبارک سے مکان کی مرمت کر رہے ہیں ہم لوگ بھی اس کام میں شریک ہو گئے، جب کام ختم ہو گیا، تو آپ نے ہمارے لیے دعائے خیر فرمائی[6]،

دوسروں کے کام کر دینا (خباب بن ارت ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے انکو کسی غزوہ پر بھیجا، خباب کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا، اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا، اس بنا پر آپ ہر روز اُن کے گھر جاتے، اور دودھ دوہ دیا کرتے[7]، حبش سے جو مہمان آئے تھے، صحابہ نے چاہا کہ وہ اُنکی خدمت گذاری کریں لیکن آپ نے اُن کو روک دیا، اور فرمایا کہ انھوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے، اس لیے میں خود ان کی خدمت کا فرض

[1] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم میں ہیں پہلی روایت کتاب الادب میں اور دوسری اور تیسری باب جواز وسم الحیوان میں ہیں، [2] سنن نسائی کتاب المساجد، [3] صحیح بخاری باب الجاہلیۃ، [4] زرقانی جلد ۴ صفحہ ۳۰۶ بحوالہ سیرت محب طبری، [5] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۰۶، بحوالہ کتاب شمائل النعل الشریف لابی الیمن بن عساکر[6] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۶۹، [7] ابن سعد حصہ ہشتم صفحہ ۲۱۳ ترجمہ بنت خباب،

انجام[1] دونگا، کفار ثقیف جنھوں نے طائف میں آپ کے پائے مبارک کو زخمی کیا تھا، ۹ھ میں وفد لیکر آئے، تو آپ نے اُن کو مسجد نبوی میں اُتارا، اور بنفس نفیس انکی مہمانی کے فرائض ادا کئے۔

مدینہ کی لونڈیاں آپ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں "یا رسول اللہ میرا یہ کام ہے" آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور اُس کا کام کردیتے، مدینہ میں ایک پاگل لونڈی تھی وہ ایک دن حاضر ہوئی اور آپ کا دست مبارک پکڑ لیا آپ نے فرمایا اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے بیٹھ، میں تیرا کام کردوں گا" چنانچہ آپ اُس کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی میں جاکر بیٹھے، اور اُسکی ضرورت پوری کی،[2] عبداللہ بن ابی اوفیٰ ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں،

ولا یأنف ان یمشی مع الارملة والمسکین فیقضی له الحاجة، (نسائی ودارمی)	بیوہ اور مسکین کے ساتھ چلکر انکا کام کردینے میں آپ کو عار نہ تھا،

ایک دفعہ آپ نماز کے لیے کھڑے ہوچکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپ کا دامن پکڑ کر بولا "میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں پہلے اُسکو کردو" آپ اُسکے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آئے اور اُس کا کام انجام دے کر نماز ادا کی۔[3]

عزم واستقلال (خدا نے قرآن مجید میں اولوالعزم من الرسل کہکر انبیاء کبار علیہم السلام کی مدح فرمائی ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) چونکہ خاتم الرسل تھے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ خدا نے یہ وصف آپ کی ذات میں ودیعت کیا تھا، ابتدا سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت صلعم کے عزم واستقلال کا مظہر اتم ہے، عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے، بے یار و مددگار دعوتِ حق کی صدائیں بلند کرتا ہے ریگستانِ عرب کا ذرّہ ذرّہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بنکر سامنے آتا ہے، لیکن وقارِ نبوت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھاکر پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور مخالفتوں کی تمام قوت اُس کے سامنے چور چور ہوجاتی ہے

---

[1] شفای قاضی عیاض بسند متصل بحوالہ بیہقی، [2] مسلم وابوداؤد، اخلاق وآداب، [3] ابوداؤد کتاب الادب بخاری کتاب الصلوٰة، مختصراً،

تیرہ برس کی متواتر ناکامیوں کے بعد بھی ذاتِ اقدس حُزن و یاس سے آشنا نہیں ہوتی، اور بالآخر وہ دن آتا ہے، جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جاں نثاروں کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے، ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ نے کفار کی ایذارسانیوں سے تنگ آکر خدمتِ مبارک میں عرض کی کہ آپ ہمارے لیے کیوں دُعا نہیں فرماتے،، آپکا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہوگیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں اُنکو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، اُن کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست سے علیحدہ ہو جاتا تھا لیکن یہ آزمائشیں بھی اُنکو مذہب سے برگشتہ نہیں کر سکتی تھیں، خدا کی قسم دینِ اسلام اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچکر رہے گا یہاں تک کہ صنعاء سے **حضر موت** تک ایک سوار اسطرح بیخطر چلا آئیگا کہ اُس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا،[1]

مکہ میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو اُنھوں نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی، ان میں سے ہر چیز بہادر سے بہادر انسان کے قدم کو ڈگمگا دینے کے لیے کافی تھی، لیکن آپ نے ذلت کے ساتھ انکی درخواست کو ٹھکرا دیا، اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ غور و فکر کا آخری لمحہ اور عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا، اُسوقت آپ نے جواب میں جو فقرے فرمائے، عالم کائنات میں ثبات و پامردی کے اظہار کا سب سے آخری طریقۂ تعبیر ہے، آپ نے فرمایا چچا جان اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ دیں تب بھی اپنے اعلانِ حق سے باز نہ آؤں گا، (ابن ہشام)

غزوۂ **بدر** میں جب تین سو بے سامان مُسلم ایک ہزار با ساز و سامان فوج سے معرکہ آرا تھے، کفار قریش اپنے زور و کثرت سے بپھرتے آتے تھے، اُسوقت مسلمان سمٹ سمٹ کر آنحضرت صلعم کے پہلو میں آجاتے تھے، اور با ایں ہمہ نبوت کا کوہِ وقار اپنی جگہ پر قائم تھا،[2]

غزوۂ اُحد میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو سب نے حملہ کی رائے دی، لیکن جب آپ زرہ پہنکر تیار ہو گئے

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب مالقی النبی صلعم، [2] مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۱۲۶۔

تو صحابہ نے رک جانے کا مشورہ دیا، آپ نے فرمایا پیغمبر زرہ پہن کر اُتار نہیں سکتا[1]

غزوۂ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کے قدر اندازوں نے متصل تیروں کی بوچھار کی تو اکثر صحابہ کے قدم اُکھڑ گئے لیکن آپ نہایت سکون و اطمینان سے جیدجاں نثاروں کے ساتھ میدان میں جمے رہے اُس وقت زباں پر یہ رجز جاری تھا،

أنا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب[2] — میں پیغمبر صادق ہوں، میں فرزند عبدالمطلب ہوں،

ایک بار آپ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، ایک کافر آیا اور اسی حالت خواب میں تلوار کھینچ کر بولا، محمدؐ اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے، آپ نے فرمایا خدا، اس عزم و استقلال اور جرأت صادقہ نے اس کو اس قدر مرعوب کر دیا کہ فوراً اس نے تلوار میان میں کر لی اور پاس بیٹھ گیا[3]

شجاعت (یہ وصف انسانیت کا اعلےٰ جوہر اور اخلاق کا سنگ بنیاد ہے، عزم، استقلال، حقگوئی، راست گفتاری، بُردلی، یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلعم کو سیکڑوں مصائب و خطرات، اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے، لیکن کبھی نامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی، غزوۂ بدر کی گھمسان لڑائی میں جب مسلمانوں کے قدم جب ایک ہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے، تو دوڑ کر مرکز ثبوت ہی کے دامن میں آکر پناہ لیتے تھے، حضرت علیؓ جن کے دست و بازو نے بڑے بڑے معرکے سر کئے کہتے ہیں کہ بدر میں جب زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی، آپ سب لوگوں سے زیادہ شجاع تھے، مشرکین کی صف سے اُس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا[4]،

غزوۂ حنین میں ہوازن کے بے پناہ تیروں کی بارش ہوئی تو مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج دفعتہً میدان سے ہٹ گئی لیکن آپ مع جیدجاں نثاروں کے بدستور میدان میں کھڑے رہے، اس وقت بار بار آپ اپنے

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۵ ۱، باب قول اللہ وامرہم شوریٰ بینہم، [2] صحیح بخاری حنین، [3] بخاری جلد ۲ صفحہ ۵۹۳ غزوۂ ذات الرقاع [4] مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۲۶،

خچر کو ایڑ لگا کر آگے بڑھانے کا قصد فرما رہے تھے، لیکن جاں نثار مانع آتے تھے، اس دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ صرف آپ کی ذات تھی، بایں ہمہ پائے اقدس میں لغزش نہیں ہوئی، حضرت براءؓ جو اس معرکہ میں شریک تھے، کسی نے اُن سے پوچھا کہ کیا حنین میں تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے، جواب دیا ہاں یہ سچ ہے، لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت صلعم اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے، خدا کی قسم جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپ ہی کے پہلو میں آکر پناہ لیتے تھے، ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا[1]

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم سب سے زیادہ شجاع تھے، ایک دفعہ مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آگئے لوگ مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے، لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود آنحضرت صلعم تھے، جلدی میں آپ نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے، گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپ تمام خطرہ کے مقامات میں گشت لگائے، اور واپس آکر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں[2]

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی کو اپنے دستِ خاص سے قتل نہیں کیا، ابی بن خلف آپ کا سخت دشمن تھا، بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا، تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا، کہ میرے پاس ایک گھوڑا ہے، جس کو میں ہر روز چارہ کھلایا کرتا ہوں، اُسی پر چڑھ کر محمدؐ کو قتل کروں گا،" احد میں اُسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپ کے پاس پہنچ گیا، مسلمانوں نے چاہا کہ اُس کو بیچ میں روک لیں، لیکن آپ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے نیزہ لیکر آپ اس کی طرف بڑھے، اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھوئی، وہ چنگھاڑ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں، تم اس قدر خوفزدہ کیوں ہو؟ اُس نے کہا ہاں سچ ہے لیکن یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے[3])

راست گفتاری (راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے اور اس کا وجود اُس کی ذات سے کبھی منفک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر آنحضرت صلعم کے اخلاق کے عنوان میں اس کے جزئیات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی، لیکن

[1] صحیح مسلم غزوۂ حنین [2] صحیح بخاری کے متفرق ابواب میں یہ حدیث ہے مثلاً باب الشجاعۃ فی الحرب، و باب اذا فزعوا باللیل،
[3] شرح شفا قاضی عیاض جلد ۲ صفحہ ۴۶ بحوالہ بیہقی بسند صحیح و مصنف عبدالرزاق و ابن سعد و واقدی

اس موقع پر ہم صرف اُن شہادتوں کو قلمبند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے اعتراف سے ہاتھ آسکی ہیں

آنحضرت صلعم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپ سے واقف تھے اُنھوں نے آپ کو کاذب اور دروغگو یقین نہیں کیا، بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپ کے حواس درست نہیں ہیں یا اب عقل بجا نہیں رہی ہے یا یہ کہ ان میں اب شاعرانہ تخیل پرستی آگئی ہے، اسی بنا پر انھوں نے آپ کو مجنون کہا، مسحور کہا، شاعر کہا، لیکن کاذب نہیں کہا،

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا جلسہ جمائے بیٹھے تھے اور آپ کا ذکر ہو رہا تھا، نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا، اے قریش تم پر جو مصیبت آئی ہے اب تک تم اسکی کوئی تدبیر نہ نکال سکے، محمدؐ تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا، اب جب اُسکے بالوں میں سپیدی آچلی اور تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے، خدا کی قسم میں نے اسکی باتیں سنی ہیں، محمدؐ میں یہ کوئی بات نہیں، تم پر کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے[1]،

ابو جہل کہا کرتا تھا "محمدؐ میں تمکو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ تم جو کچھ کہتے ہو، اُس کو صحیح نہیں سمجھتا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے[2]،

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ‹انعام›

ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تجھکو غمگین کرتی ہیں کیونکہ وہ تجھکو جھٹلاتے نہیں البتہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

جب آنحضرت صلعم کو بارگاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہل خاندان کو اسلام کی دعوت دو تو آپ نے ایک پہاڑ پر چڑھکر پکارا، یَا مَعْشَرَ قُرَیْش، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا، سب نے کہا، ہاں، کیونکہ ہمنے تمکو کبھی جھوٹ بولتے نہیں[3] دیکھا۔

قیصر روم نے دربار میں **ابوسفیان** سے پوچھا کہ تمہارے ہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے، اس دعوی سے پہلے کبھی تمنے اس کو دروغگو بھی پایا، ابوسفیان نے کہا نہیں، آخر میں قیصر نے جو تقریر کی اس میں کہا، میں نے تم سے

---

[1] ابن ہشام [2] جامع ترمذی تفسیر انعام [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت

پوچھا کہ تمہارے نزدیک وہ کبھی کذب کا بھی مرتکب ہوا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب[1] باز رہتا،)

ایفائے عہد (ایفائے عہد آپ کی ایک ایسی عام خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی محمد ﷺ نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ نہیں[2]، وحشی جنھوں نے حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا اسلام کے ڈر سے شہر بہ شہر پھرا کرتے تھے، اہل طائف نے مدینہ بھیجنے کے لیے جو وفد مرتب کیا اس میں اُن کا نام بھی تھا، لیکن اُن کو ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے، لیکن خود دشمنوں نے اُن کو یقین دلایا کہ تم بے خوف و خطر جاؤ، محمد ﷺ سفراء کو قتل نہیں کرتے چنانچہ وہ اس اعتماد پر دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے[3]، صفوان بن امیہ (قبل اسلام) شدید ترین دشمنوں میں تھے، جب مکہ فتح ہوا تو وہ بھاگ کر یمن کے ارادہ سے جدہ چلے گئے، عمیر بن وہب نے حاضر خدمت ہو کر واقعہ عرض کیا، آنحضرت صلعم نے عمامہ مبارک عنایت کیا اور فرمایا کہ یہ صفوان کی امان کی نشانی ہے، عمیر عمامہ مبارک لیکر صفوان کے پاس پہنچے، اور کہا تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں تم کو امان ہے جب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ کیا آپ نے مجھے امان دی ہے، ارشاد ہوا کہ ہاں، یہ سچ[4] ہے،

ابورافع ایک غلام تھے، حالت کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ منورہ آئے، روئے اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت اُن کے دل میں جاگزیں ہوگئی، عرض کی یا رسول اللہ اب میں کبھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا، ارشاد ہوا، نہ میں عہد شکنی کر سکتا، اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا، تم اسوقت واپس جاؤ، اگر وہاں پہنچ کر بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آجانا، چنانچہ وہ اُسوقت واپس گئے، اور پھر[5] اسلام لائے،

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائیگا عین اسوقت جب معاہدہ کی یہ شرطیں زیر تحریر تھیں ابوجندل پا بزنجیر اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے، اور رسول اللہ صلعم

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی، [2] ایضاً، [3] صحیح بخاری غزوۂ احد، [4] ابن ہشام [5] ابوداؤد باب الوفاء بالعہد

سے فریادی ہوئے، تمام مسلمان اس درد انگیز منظر کو دیکھکر تڑپ اٹھے لیکن آنحضرت صلعم نے اطمینان تمام انکی طرف مخاطب ہوکر فرمایا، اے ابوجندل! صبر کرو، ہم بدعہدی نہیں کرسکتے، اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کوئی راستہ نکالے گا۔[۱]

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آنحضرت صلعم سے کچھ معاملہ کیا اور آپ کو بٹھا کر کہیں چلے گئے کہ آکر حساب صاف کردیتا ہوں، اتفاق سے انکو خیال نہ رہا تین دن کے بعد آئے، تو آنحضرت صلعم اُسی جگہ تشریف رکھتے تھے، ان کو دیکھکر فرمایا "میں تین دن سے یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں[۲]"،

غزوۂ بدر میں کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی، ایسے موقع پر آنحضرت صلعم کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جس قدر آدمی بڑھ سکیں بہتر ہے، لیکن آپ اس وقت بھی ہمہ تن وفا تھے، **ابوحذیفہ** بن الیمان اور **ابوحسل** دو صحابی مکہ سے آرہے تھے، راہ میں کفار نے انکو روکا کہ محمدؐ کے پاس جارہے ہو، انھوں نے انکار کیا، آخر اس شرط پر انکو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپ کا ساتھ نہ دیں گے، یہ دونوں صاحب آنحضرت صلعم کے پاس آئے، تو صورت حال عرض کی، فرمایا، تم دونوں واپس جاؤ، ہم ہر حال میں وعدہ وفا کرینگے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔[۳]

زہد وقناعت | مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت صلعم جب تک مکہ میں تھے پیغمبر تھے، مدینہ پہنچکر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیرنگیں ہوجانے پر بھی فاقہ کش رہے، صحیح بخاری باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں تین صاع جَو پر گرو تھی، جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لیکر عدن تک فتح ہوچکا ہے، اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آچکا ہے،

اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی مہمات فرائض میں رہبانیت کا قلع قمع کرنا بھی تھا، جس کے بست خدا نے نصاریٰ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الشروط، آخری فقرے ابن ہشام میں ہیں [۲] ابوداؤد کتاب الادب، [۳] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد جلد ۲ صفحہ ۸۹۔

کو ملامت کی تھی کہ رہبانیةً ابتدعوھا اس بنا پر آپ نے کبھی کبھی اچھے کھانے اور اچھے کپڑے بھی استعمال کیے ہیں لیکن اصلی میلانِ طبع زخارفِ دنیوی سے اجتناب تھا، فرمایا کرتے، فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں، رہنے کے لیے ایک گھر، ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا، اور شکم سیری کے لیے روکھی سوکھی روٹی اور پانی[1]، حضرت عائشہ فرماتی ہیں، وَلَا یُطْوٰی لَہٗ ثوبٌ، کبھی آپکا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا، یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا، جو تہ کر کے رکھا جا سکتا،

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر گھر کی دیوار کی مرمت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ کسی طرف سے آ گئے، پوچھا کیا شغل ہے، عبداللہ بن عمر نے عرض کی کہ دیوار کی مرمت کر رہا ہوں، ارشاد ہوا کہ اتنی مہلت کہاں[2]؟

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو تو اکثر آپ اور سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا،

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ يبيت الليالي المتتابعة طاويا هو واهله لا يجدون عشاء[3]	آپ اور آپ کے اہل و عیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہجاتے تھے، کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا،

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، حضرت عائشہ نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن الزبیر نے پوچھا کہ آخر گذارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیجدیتے تھے تو پی لیتے[4] تھے، آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی[5]، میدہ جسکو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں کبھی نظر سے نہیں گذرا، سہل بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں اُنسے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلعم کے زمانہ میں چھلنیاں نہ تھیں، بولے نہیں، لوگوں نے کہا پھر آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے، بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے، جو رہ جاتا تھا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے[6]،

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی[7]،

---

[1] جامع ترمذی ابواب الزہد [2] ابن ماجہ کتاب اللباس [3] جامع ترمذی معیشۃ النبی [4] بخاری کتاب الرقاق [5] ایضاً [6] شمائل [7] ایضاً

فدک اور خیبر وغیرہ کے ذکر میں محدثین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپ اُن کی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے، یہ واقعہ بظاہر روایات مذکورۂ بالا کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں صحیح ہیں، بے شبہہ آپ بقدر کفاف آمدنی میں سے لے لیتے باقی فقراء اور اہل حاجت کو دیدیتے تھے، لیکن آپ اپنے لیے جو رکھ لیتے تھے، وہ بھی اہل حاجت کی نذر ہو جاتا تھا، احادیث میں آپ کی فاقہ کشی اور تنگدستی کے واقعات نہایت کثرت سے منقول ہیں چند روایتیں اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیجو جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں، آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا وہاں سے بھی یہی جواب آیا، مختصر یہ کہ آٹھ نو گھروں میں سے کہیں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی[1]

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو کپڑے سے کسکر باندھا ہے سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا بھوک کیوجہ سے[2]،

حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں، اور بھوک کی وجہ سے مار مار کروٹیں بدلتے ہیں[3]،

ایک دفعہ صحابہ نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھولکر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے، آپ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے[4]،

اکثر بھوک کیوجہ سے آواز اس قدر کمزور ہو جاتی تھی، کہ صحابہ آپ کی حالت سمجھ جاتے تھے، ایکدن **ابوطلحہ** گھر میں آئے، اور بیوی سے کہا کچھ کھانے کو ہے؟ میں نے ابھی رسول اللہ کو دیکھا، اُنکی آواز کمزور ہو گئی ہے[5]،

ایک دن بھوک میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلے، راہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ ملے، یہ دونوں صاحب بھی بھوک سے بیتاب تھے، آپ سب کو لیکر حضرت ابوایوب انصاری کے گھر آئے، اُنکا معمول تھا

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۰ مطبوعہ مصر و صحیح بخاری صفحہ ۵۳۰ [2] صحیح مسلم صفحہ ۱۹۳ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] صحیح مسلم صفحہ ۱۹۱-

کہ آنحضرت صلعم کے لیے دودھ مہیا رکھتے تھے، آج آپ کے آنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے بچوں کو کھلا دیا، آنحضرت صلعم اُنکے گھر پہنچے تو وہ نخلستان میں چلے گئے تھے، انکی بیوی کو خبر ہوئی تو باہر نکل آئیں اور عرض کی حضور کا آنا مبارک، آپ نے پوچھا ابوایوب کہاں ہیں، نخلستان پاس ہی تھا، وہ آواز سنکر دوڑے آئے اور مرحبا کہکر عرض کی یہ حضور کے آنے کا وقت نہیں، آپ نے حالت بیان کی وہ نخلستان میں جاکر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لائے، اور کہا میں گوشت طیار کراتا ہوں، ایک بکری ذبح کی، آدھے کا سالن، آدھے کے کباب تیار کرائے، کھانا سامنے لاکر رکھا تو آنحضرت نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھکر فرمایا کہ فاطمہؓ کو بھجوا دو، کئی دن سے اُسکو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے، پھر خود صحابہ کے ساتھ مل کر کھانا نوش فرمایا، متعدد قسم کے کھانے دیکھکر آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور فرمایا کہ خدا نے جو کہا ہے کہ قیامت میں نعیم سے سوال ہوگا وہ یہی چیزیں ہیں[۱]،

اکثر ایسا ہوتا کہ آنحضرت صلعم صبح کو ازواج مطہرات کے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے کہ آج کچھ کھانے کو ہے، عرض کرتیں نہیں، آپ فرماتے کہ اچھا میں نے روزہ رکھ لیا[۲]،

عفو و حلم | ارباب سیر نے تصریح کی ہے اور تمام واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلعم نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، صحیحین میں حضرت عایشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، بجز اس صورت کے کہ اس نے احکام الٰہی کی تفضیح کی ہو[۳]،

(جنگ اُحد کی شکست سے زیادہ رؤسائے طائف کے تحقیر آمیز برتاؤ کی یاد خاطر اقدس پر گراں تھی[۴]، تاہم دس برس کے بعد غزوہ طائف میں جب وہ ایک طرف منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برسا رہے تھے، تو دوسری طرف ایک سراپائے حلم و عفو انسان (خود آنحضرت صلعم) یہ دعا مانگ رہا تھا، کہ خدایا! اُنھیں سمجھ عطا کر اور اُن کو آستانۂ اسلام پر جھکا، چنانچہ ایسا ہی ہوا ۹ھ میں جب اُن کے وفد نے مدینہ کا رخ کیا تو آپ نے صحن مسجد میں انکو مہمان اُتارا اور عزت و حرمت کیساتھ اُنسے پیش آئے[۵]،

---

[۱] ترغیب و ترہیب جلد ۲ صفحہ ۵۰۷ (یہ واقعہ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۰ میں بھی جزئی اختلافات کے ساتھ موجود ہے) [۲] مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۹ [۳] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۴ و کتاب الادب [۴] صحیح بخاری بدء الخلق [۵] ابو داؤد ذکر طائف و مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۱۸۔

قریش نے آپ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسم اطہر پر نجاستیں ڈالیں، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ کبھی جادوگر، کبھی پاگل، کبھی شاعر کہا، لیکن آپ نے کبھی ان باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی، غریب سے غریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا ہے تو وہ غصہ سے کانپ اُٹھتا ہے، ایک صاحب جنھوں نے آنحضرت صلعم کو ذی المجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا، بیان کرتے ہیں کہ حضور فرما رہے تھے "لوگو لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے" پیچھے پیچھے ابوجہل تھا، وہ آپ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا، "لوگو اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کر دیں، یہ یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات و عزیٰ کو چھوڑ دو" راوی کہتا ہے کہ آپ اس حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے" (مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۶۳)

سب سے بڑھکر طیش اور غضب کا موقع افک کا واقعہ تھا، جب کہ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی، حضرت عائشہ صدیقہ آپ کی محبوب ترین ازواج اور حضرت ابوبکر جیسے یار غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں، شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا، جنھوں نے دم بھر میں اس خبر کو اسطرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اُٹھا، دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، محبوب کی تفضیح، یہ باتیں انسانی صبر و تحمل کے پیمانہ میں نہیں سما سکتیں، تاہم رحمتِ عالم نے ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا، تہمت کا تمام تر بانی، رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی تھا، اور آپ کو اس کا بخوبی علم تھا، بایں ہمہ آپ نے صرف اس قدر کیا کہ مجمع عام میں منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا، مسلمانو! جو شخص میرے ناموس کے متعلق مجکو ستاتا ہے اس سے میری داد کون لے سکتا ہے؟ حضرت سعد بن معاذ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور اٹھکر کہا میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں، آپ نام بتائیں، تو اُس کا سر اڑا دوں، سعد بن عبادہ نے جو عبد اللہ بن ابی کے حلیف تھے، مخالفت کی اور اسپر دونوں طرف کے حمایتی کھڑے ہو گئے، قریب تھا کہ تلواریں کھنچ جائیں، آپ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا، واقعہ کی تکذیب خود خدا نے کر دی اور تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی، تاہم عبد اللہ بن ابی اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اُس کو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا اور ثبوت کے لیے شرعی شہادت موجود نہ تھی، تہمت لگانے والوں میں جنکو سزا دیگئی، ایک صاحب مسطح بن اثاثہ تھے، اُن کی معاش کے کفیل حضرت ابوبکرؓ تھے، تہمت کے جرم میں

حضرت ابوبکر نے ان کا روزینہ بند کر دیا، اس پر یہ آیت اتری،

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (نور)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور ذی مقدور ہیں انکو قسم نہیں کھانا چاہئے، کہ قرابت داروں مسکینوں اور مجاہدوں سے سلوک نہ کریں گے، عفو اور درگذر سے کام لینا چاہئے، کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو بخشدے خدا غفور رحیم ہے،

حضرت ابوبکر نے اُن کا روزینہ بدستور جاری کر دیا،

تہمت لگانے والوں میں (جیسا کہ صحیح ترمذی کتاب التفسیر سورۂ نور میں تصریح ہے) حضرت حسان بھی تھے، حضرت عائشہ کو ان سے جو رنج ہو سکتا تھا وہ عفو کی حد سے متجاوز تھا، لیکن یہ آنحضرت صلعم کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جب عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ کے سامنے حضرت حسان کو بُرا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہ نے روک دیا، کہ یہ (حسان) آنحضرت صلعم کی طرف سے کفار کو جواب دیتے تھے[1]،

مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن اعصم نے آپ پر سحر کیا، تاہم آپ نے کچھ تعرض نہ فرمایا (حضرت عائشہ نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا، میں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرنا چاہتا[2]،)

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلعم نے اُن سے کچھ قرض لیا، میعاد ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے تقاضے کو آئے، آنحضرت صلعم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سُست کہکر کہا عبدالمطلب کے خاندان والو تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو" حضرت عمر غصہ سے بیتاب ہو گئے، اُنکی طرف مخاطب ہو کر کہا، او دشمن خدا! تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرت صلعم نے مسکرا کر فرمایا، عمر! انکو تم سے اور کچھ امید تھی، اُسکو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھسے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرضہ ادا کر دوں" پھر فرمایا کر حضرت عمر کو ارشاد فرمایا کہ قرضہ ادا کر کے بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دیدو[3]،

---

[1] صحیح بخاری قصۂ افک، [2] صحیح بخاری صفحہ ۹۴، [3] یہ روایت بیہقی ابن حبان طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اسکی سند صحیح ہے (شرح شفا از شہاب خفاجی)

(ایک دفعہ آپکے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہوجاتا اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اُس سے قرض منگوا لیجئے آنحضرت صلعم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اُس گستاخ نے کہا "میں سمجھا مطلب یہ ہی کہ میرا مال یوں ہی اڑا لیں، اور دام نہ دیں"، آنحضرت صلعم نے یہ ناگوار جملے سنکر صرف اسقدر فرمایا "وہ خوب جانتا ہی کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں[1]")

ایک دفعہ کھیت پر تشریف لے جارہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ رُک گئے، اور اُس سے مخاطب ہوکر فرمایا "صبر کرو" وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی (گستاخی کے ساتھ) بولی، ہٹو تم کیا جان سکتے ہو کہ مجھ پر کیا کیفیت ہے، آپ چلے آئے، لوگوں نے عورت سے کہا تو نے نہیں پہچانا، وہ رسولُ اللہ تھے، دوڑی ہوئی آئی اور کہا میں حضور کو پہچانتی نہ تھی، ارشاد فرمایا، صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے[2]"

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے، راہ میں ایک جلسہ تھا، آپ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، وہ بھی جلسہ میں موجود تھا، آپ کی سواری کی گرد اُڑی تو اُسنے چادر ناک پر رکھ لی اور آنحضرت صلعم سے کہا دیکھو گرد نہ اُڑاؤ (جب آنحضرت صلعم قریب پہونچے تو اُسنے کہا محمدؐ! اپنا گدھا ہٹاؤ، تمہارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کردیا، آنحضرت صلعم نے سلام کیا، پھر سواری سے اُترے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ بن ابی نے کہا، ہمارے گھر آکر ہمکو نہ ستاؤ، جو شخص خود تمہارے پاس جائے اُس کو تعلیم دو" عبداللہ بن رواحہ جو مشہور شاعر تھے، اُنھوں نے کہا آپ ضرور تشریف لائیں" بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا کہ تلواریں نکل آئیں، آنحضرت صلعم نے دونوں فریق کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا، جلسہ سے اُٹھکر آپ سعد بن عبادہ کے پاس آئے، اور اُن سے کہا کہ تم نے عبداللہ کی باتیں سنیں، سعد بن عبادہ نے عرض کی کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ شخص ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ نے اس کے لیے ریاست کا تاج تیار کرلیا تھا[3]،

---

[1] جامع ترمذی کتاب البیوع [2] بخاری باب الجنائز [3] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۴۶-

غزوۂ حنین میں آپ نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے لیے نہیں ہے، آپ نے سنا تو فرمایا، خدا موسیٰ پر رحم کرے، اُن کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا تھا،[1]

ایک دفعہ ایک بدو خدمتِ اقدس میں آیا، آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اس کو پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی آداب مسجد سے واقف نہ تھا وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اُس کو سزا دیں، آپ نے فرمایا کہ جانے دو، اور پانی کا ایک ڈول لا کر بہا دو، خدا نے تم لوگوں کو دشواری کے لیے نہیں، بلکہ آسانی کے لیے بھیجا ہے،[2]

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے اُن کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے مجھکو کسی کام کے لیے بھیجنا چاہا، میں نے کہا نہ جاؤں گا، آپ چپ رہ گئے، میں یہ کہکر باہر چلا گیا، دفعۃً آنحضرت صلعم نے پیچھے سے آکر میری گردن پکڑ لی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ ہنس رہے ہیں، پھر پیار سے فرمایا، انیس جس کام کے لیے کہا تھا اب تو جاؤ، میں نے عرض کی اچھا جاتا ہوں، حضرت انس نے اسی واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپ کی ملازمت کی کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، یا یہ کیوں نہیں کیا،[3]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے، جب اُٹھکر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے، ایک دن حسب معمول مسجد سے نکلے، ایک بدّو آیا، اور اُس نے آپ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سُرخ ہو گئی، آپ نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا، بولا کہ میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے، آپ نے فرمایا پہلے میری گردن کا بدلہ دو، تب غلہ دیا جائے گا، وہ بار بار کہتا تھا، خدا کی قسم میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا، آپ نے اُس کے اونٹوں پر جَو اور کھجوریں لدوا دیں،[4] کچھ تعرض نہ فرمایا،

(قریش (نعوذ باللہ) آنحضرت صلعم کو گالیاں دیتے تھے، بُرا بھلا کہتے تھے، ضد سے آپ کو محمد (تعریف کیا گیا)

[1] صحیح بخاری صفحہ ۶۲۱ غزوۂ حنین [2] صحیح بخاری صفحہ ۳۵، [3] صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الادب، [4] ابوداؤد کتاب الادب (یہی واقعہ حضرت انس سے بخاری و مسلم میں بھی مروی ہے سیر بسرا)

نہیں کہتے تھے، بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے، لیکن آپ اس کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کرکے صرف اسی قدر فرمایا کرتے کہ تمہیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے، وہ مذمّم کو گالیاں دیتے اور مذمّم پر لعنت بھیجتے ہیں، اور میں محمد ہوں[1]،

جس زمانہ میں آپ فتح مکہ کے لیے تیاریاں کر رہے تھے اس بات کی خاص احتیاط فرما رہے تھے کہ قریش کو ہمارے ارادوں کی خبر نہ ہو، حاطب بن ابی بلتعہ ایک صحابی تھے انھوں نے چاہا کہ قریش کو اسکی اطلاع کردیں، چنانچہ ایک خط لکھکر انھوں نے چپکے سے ایک عورت کی معرفت مکہ روانہ کیا، آپ کو اسکی خبر ہوگئی، حضرت علی اور حضرت زبیر اسیوقت بھیجے گئے، جو قاصدہ کو مع خط کے گرفتار کر لائے، حاطب کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کیا، اور معذرت چاہی، یہ وہ موقع تھا کہ ہر سیاست داں، مجرم کی سزا کا فتویٰ دیتا، لیکن آنحضرت صلعم نے اس لیے ان کو معاف فرمایا کہ وہ شرکائے بدر میں تھے، عورت جو اس جرم میں شریک تھی اُس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا[2]، حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا ہوجاتا،

فرات بن حیان ایک شخص تھا، ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا، اور آنحضرت صلعم کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ پکڑا گیا تو آنحضرت صلعم نے اُس کے قتل کا حکم دیا، لوگ اسکو پکڑ کر لے چلے جب انصار کے ایک محلہ میں پہنچا تو بولا کہ میں مسلمان ہوں، ایک انصاری نے آکر اطلاع دی کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، آپ نے فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ایمان کا حال ہم انھیں پر چھوڑتے ہیں ان میں سے ایک فرات بن حیان ہے[3]، مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بعد کو صدق دل سے مسلمان ہوگئے اور آنحضرت صلعم نے اسکو یمامہ میں ایک زمین عنایت فرمائی جس کی آمدنی ۴ ہزار تھی[4]،

(انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کمیاب اور نادر الوجود چیز دشمنوں پر ترحم اور اُن سے	دشمنوں سے عفو و درگذر اور حسن سلوک

[1] مشکوۃ باب اسماء النبی صلعم، [2] صحیح بخاری فتح مکہ، [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجاسوس الذمی، یہ حدیث سفیان ثوری کے واسطہ سے دو طریقوں سے مروی ہے ایک میں ابوہمام الدلال ہے اور یہی ابوداؤد کا طریق ہے، یہ طریق ضعیف ہے، دوسرا طریق بشر بن سری البصری کے ذریعہ سے ہے جو صحیح ہے، امام احمد نے بھی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے، [4] اصابہ ترجمہ فرات مذکور،

لیکن پھر مجھے حضور کے احسانات اور حلم وعفو یاد آئے، میری نسبت آپکو جو خبریں پہنچی تھیں، وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں، دفعۃً باب رحمت وا تھا، اور دوست و دشمن کی تمیز یکسر مفقود تھی۔[1]

ابوسفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے، غزوات نبوی کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، بدر سے لیکر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں ان میں سے اکثر میں ان کا ہاتھ تھا، لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کرکے لائے گئے، اور حضرت عباس انکو لیکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ اُنکے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عمر نے گذشتہ جرائم کی پاداش میں اُن کے قتل کا ارادہ کیا، لیکن آپ نے منع فرمایا، اور نہ صرف یہ بلکہ اُن کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا، فرمایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے گا، اُس کا قصور معاف[2] ہوگا، کیا دنیا کے کسی فاتح نے ایسے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانہ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا، جس میں مسیلمہ نے ادّعائے نبوت کیا تھا، ثمامہ بن اثال اس قبیلہ کے رؤسا میں تھا، اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کرکے مدینہ لے آئے، آنحضرت صلعم نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے اس کے بعد آپ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو، اس نے کہا "اے محمد! اگر تم مجھے قتل کروگے تو ایک خونی کو کروگے، اور اگر احسان کروگے تو ایک شکرگذار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو، تو جو مانگو، میں دونگا" یہ جواب سنکر آپ خاموش رہے، دوسرے دن بھی یہی تقریر ہوئی، تیسرے روز بھی جب اسنے یہی جواب دیا تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسی کھول دو، اور آزاد کردو، ثمامہ پر اس خلاف توقع لطف وعنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جاکر غسل کیا اور پھر مسجد میں واپس آکر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا، اور عرض کی یارسول اللہ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض نہ تھا، اور اب آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپ کے

---

[1] ابن اسحاق واصابہ ذکر ہبار [2] صحیح بخاری وصحیح مسلم فتح مکہ مع فتح الباری

مدینہ سے زیادہ میری آنکھوں میں بُرا نہ تھا، اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا، اور اب وہی پسندیدہ ہے،

قریش کی ستمگری وجفاکاری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ کو اور آپ کے خاندان کو اسطرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر نہیں پہنچ سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے تھے اور تڑپتے تھے، اور بے دردان کی آوازیں سنکر ہنستے اور خوش ہوتے تھے، لیکن معلوم ہی کہ رحمتِ عالم نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس، یہی ثمامہ بن اثال تھے، مسلمان ہوکر جب یہ مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر انکو طعنہ دیا، انھوں نے غصہ سے کہا کہ خدا کی قسم اب رسول اللہ صلعم کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا،، اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑگیا، آخر گھبرا کر قریش نے اُس آستانہ کی طرف رجوع کیا جس سے کوئی سائل کبھی محروم نہین گیا، حضور کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اٹھالو، چنانچہ پھر حسب دستور غلہ جانے لگا[۱]،

کفار او رمشرکین کے ساتھ برتاؤ

کفار کے ساتھ آپ کے حسن خلق کے بہت سے واقعات مذکور ہیں لیکن یورپین مورخین مدعی ہیں کہ یہ اسوقت تک کے واقعات ہیں جب تک اسلام ضعیف تھا اور مجاملت اور لطف وآشتی کے سوا، چارہ نہ تھا، اس لیے ہم اس عنوان کے نیچے صرف وہ واقعات نقل کریں گے جو اس زمانہ کے ہیں جبکہ مخالفین کی قوتیں پامال ہوچکی تھیں اور آنحضرت صلعم کو پورا اقتدار حاصل ہوچکا تھا،

(ابونصرہ غفاری کا بیان ہے کہ وہ جب کافر تھے مدینہ میں آنحضرت صلعم کے پاس آکر مہمان رہے، رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے، لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا، رات بھر تمام اہلبیت نے بھوکا رہا[۲]،

اسی طرح کا ایک اور واقعہ حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں، جب کہ ایک کافر آنحضرت صلعم کا مہمان ہوا آپنے

---

[۱] ثمامہ کا پورا واقعہ صحیح بخاری صفحہ ۶۲۷ وباب وفد بنی حنیفہ میں آخری ٹکڑا ابن ہشام میں مذکور ہے، [۲] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۹۷،

ایک بکری کا دودھ اس کے سامنے پیش کیا، وہ پی گیا، پھر دوسری بکری دوہی گئی، وہ دودھ بھی بے تامل پی گیا، پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ سات بکریاں دوہی گئیں اور وہ سب دودھ پیتا چلا گیا، آنحضرت صلعم نے کوئی تعرض ظاہر نہ فرمایا، شاید اسی حسن اخلاق کا اثر تھا کہ وہ صبح کو مسلمان تھا، اور صرف ایک بکری کے دودھ پر قانع ہو گیا۔[1]

حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ان کی ماں جو مشرکہ تھیں، اعانت خواہ مدینہ حضرت اسماءؓ کے پاس آئیں، انکو خیال ہوا کہ اہل شرک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، آنحضرت صلعم سے آکر دریافت کیا، آپ نے فرمایا اُن کے ساتھ نیکی کرو۔[2] حضرت ابوہریرہؓ کی ماں کافرہ تھیں، اور بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں، جہالت سے آنحضرت صلعم کو گالیاں دیتی تھیں، ابوہریرہؓ نے خدمتِ اقدس میں عرض کی آپ نے بجائے غیظ وغضب دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔[3]

آنحضرت صلعم کے گھر کا تمام کاروبار حضرت بلالؓ کے سپرد تھا، روپیہ پیسہ جو کچھ آتا تھا اُن کے پاس رہتا، ناداری کی حالت میں وہ بازار سے سودا سلف قرض لاتے اور جب کہیں سے کوئی رقم آجاتی تو اُس سے ادا کر دیا کرتے، ایک دفعہ بازار جا رہے تھے، ایک مشرک نے دیکھا، اس سے کہا تم قرض لیتے ہو تو مجھ سے لیا کرو، انھوں نے قبول کیا، ایکدن اذان دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ مشرک چند سوداگروں کے ساتھ آیا اور اس سے کہا کہ او حبشی! انھوں نے اس تہدید کے جواب میں لبیک کہا، بولا کچھ خبر ہے؟ وعدے کے صرف چار دن رہ گئے ہیں، تم نے اس مدت میں قرضہ ادا نہ کیا تو تم سے بکریاں چرواکے چھوڑوں گا۔" یہ عشا پڑھ کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئے، اور سارا حال بیان کر کے کہا کہ خزانہ میں کچھ نہیں ہے کل وہ مشرک آکر مجھکو فضیحت کریگا، اس لیے مجھکو اجازت ہو کہ میں کہیں نکل جاؤں پھر جب قرضہ ادا کرنے کا سامان ہو جائے گا تو واپس آجاؤں گا، غرض رات کو جاکر سو رہے اور سامان سفر یعنی تھیلا، جوتی، ڈھال سر کے نیچے رکھ لی، صبح کو اُٹھکر سفر کا سامان کر رہے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اور کہا آنحضرت صلعم نے یاد فرمایا ہے، یہ گئے تو دیکھا کہ چار اونٹ غلہ سے لدے ہوئے دروازہ پر کھڑے ہیں، آنحضرت صلعم نے فرمایا، مبارک ہو، یہ اونٹ رئیسِ فدک نے بھیجے ہیں، انھوں نے بازار میں جاکر سب چیزیں فروخت کیں اور مشرک کا قرضہ ادا کرکے مسجد نبوی

[1] جامع ترمذی باب ان المؤمن یاکل فی معاء واحد [2] صحیح بخاری باب صلة الوالد المشرک، [3] صحیح بخاری،

میں آئے اور آنحضرت صلعم سے عرض کی کہ سارا قرضہ ادا ہوگیا،[1]

یہ واقعہ فدک کی فتح کے بعد کا ہے، جو ہجرت کا ساتواں سال ہے، حضرت بلال آنحضرت صلعم کے مقرب خاص اور گھر کے منتظم تھے، ایک مشرک اُن کو حبشی کہکر پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھ سے بکریاں چرواکے چھوڑوں گا" حضرت بلال اسکی تنگ گیری کے ڈر سے بھاگ جانے کا ارادہ کرتے ہیں آنحضرت صلعم یہ تمام سنتے ہیں لیکن مشرک کی نسبت ایک لفظ نہیں فرماتے، نہ بلال کی حمایت اور دلدہی کی تدبیر کرتے، اتفاق سے غلہ آجاتا ہے اور مشرک کا قرض ادا کیا جاتا ہے اور اس کی بدزبانی اور سخت گیری سے درگذر کی جاتی ہے یہ حلم، یہ عفو، یہ تحمل رحمت عالم کے سوا اور کس سے ہوسکتا ہے،

سب سے مشکل معاملہ **منافقین** کا تھا، یہ کفار کا ایک گروہ تھا جسکا رئیس عبداللہ بن ابی تھا، آنحضرت صلعم جس زمانہ میں مدینہ تشریف لائے اس سے کچھ پہلے تمام شہر نے اس پر اتفاق کرلیا تھا کہ وہ مدینہ کا فرماں روا بنادیا جائے، جنگ بدر کے بعد اُس نے اسلام کا اعلان کیا، لیکن دل سے کافر تھا، اس کے پیرو بھی اسی قسم کا منافقانہ اسلام لائے اور منافقین کی ایک مستقل جماعت قایم ہوگئی، یہ لوگ در پردہ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیریں کرتے تھے، **قریش** اور دیگر مخالف قبائل سے سازش رکھتے، اونکو مسلمانوں کے مخفی رازوں کی خبر دیتے رہتے، با ایں ہمہ بظاہر اسلام کے مراسم ادا کرتے، جمعہ جماعت میں شریک ہوتے، اور لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے، آنحضرت صلعم ان کے حالات، اور ایک ایک کے نام ونشان سے واقف تھے، لیکن چونکہ شریعت اور قانون کے احکام دلوں کے اسرار سے نہیں، بلکہ ظاہری اعمال سے متعلق ہیں اس لیے آپ اُن پر کفر کے احکام جاری نہیں فرماتے تھے، یہاں تک تو شریعت اور قانون کا معاملہ تھا، لیکن فیاض دلی اور عفو وحلم کے اقتضاء سے آپ اُن سے ہمیشہ حسن اخلاق کا بھی برتاؤ کرتے تھے،

ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مارا انصاری نے کہا "یاللانصار" یعنی انصار کی دُہائی"، مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی، قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جائے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے

[1] ابوداؤد جلد دوم باب قبول ہدایا المشرکین،

فرمایا یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہیں، دونوں رُک گئے، عبداللہ بن اُبی نے سنا تو کہا "مدینہ چلکر ذلیل مسلمانوں کو نکال دوں گا" ساتھیوں سے کہا آسان بات یہ ہے کہ تم لوگ مہاجرین کی خبرگیری سے ہاتھ اُٹھالو، یہ خود تباہ ہو جائیں گے، چنانچہ قرآن مجید میں یہ واقعہ مذکور ہے،

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُّوا ، (منافقون)	یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو تاکہ وہ منتشر ہو جائیں،
يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ، (ایضاً)	کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ کو واپس چلیں گے تو معزز لوگ کمینوں کو مدینہ سے نکال دیں گے،

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے **عبداللہ بن ابی** کو بلا بھیجا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے؟ اُس نے صاف انکار کیا، حضرت عمرؓ موجود تھے، بولے یا رسول اللہ اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا، لوگ چرچا کریں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں[۱]

جنگ اُحد میں عبداللہ بن ابی عین لڑائی کے پیش آنے کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا، جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، تاہم آنحضرت صلعم نے درگذر فرمایا، (اور وہ جب مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ حضرت عباسؓ کو اس نے اپنا کرتہ دیا تھا، مسلمانوں کی ناراضی کے باوجود آپ نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا[۲])

یہود و نصاریٰ کیساتھ برتاؤ

خلق عظیم میں کافر و مسلم، دوست دشمن، عزیز و بیگانہ کی تمیز نہ تھی، ابر رحمت دشت و چمن پر یکساں برستا تھا، (یہود کو آنحضرت صلعم سے جس شدت کی عداوت تھی، اُسکی شہادت غزوۂ خیبر تک کے ایک ایک واقعہ سے ملتی ہے لیکن آپ کا طرز عمل مدت تک یہ رہا کہ جن امور کی نسبت مستقل حکم نازل نہ ہوتا، آپ ان میں انھیں کی تقلید فرماتے[۳]،)

ایک دفعہ ایک یہودی نے بر سر بازار کہا "قسم ہے اُس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی"، ایک

۱؎ صحیح بخاری تفسیر سورۂ منافقون ۲؎ بخاری میں یہ واقعہ متعدد روایتوں اور متعدد طریقوں سے منقول ہے ۳؎ صحیح بخاری

صحابی یہ کھڑے سن رہے تھے، اُن سے رہا نہ گیا، انھوں نے پوچھا، کیا محمد صلعم پر بھی؟ اُس نے کہا ہاں، انھوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اُس کے مار دیا، آنحضرت صلعم کے عدل اور اخلاق پر دشمنوں کو بھی اس درجہ اعتبار تھا کہ وہ یہودی سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور واقعہ عرض کیا، آپ نے ان صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی،

(ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ اُس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اسکو اسلام کی دعوت دی، اُسنے اپنے باپ کی طرف دیکھا، گویا باپ کی رضامندی دریافت کی، اُس نے کہا کہ آپ جو فرماتے ہیں اس کو بجا لاؤ" چنانچہ اُس نے کلمہ[1] پڑھا،

ایک دفعہ سر راہ ایک یہودی کا جنازہ گذرا تو آپ کھڑے ہو گئے[2]،

ایک دفعہ چند یہودی آپ کی خدمت میں آئے، اور شرارت سے سلام علیکم کے بجائے، السام علیکم (تم پر موت) کہا حضرت عائشہ نے غصہ میں آکر ان کو بھی سخت جواب دیا، لیکن آپ نے روکا اور فرمایا، "عائشہ! بدزبان نہ ہو نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے[3]،"

یہودیوں کے ساتھ داد و ستد کرتے تھے، اُنکے سخت و ناجائز تقاضوں اور درشت کلمات کو برداشت کرتے تھے یہودیوں اور مسلمانوں میں اگر معاملات میں اختلاف پیش آتا تو مسلمانوں کی بلاوجہ جنبہ داری نہ فرماتے، چنانچہ اس قسم کی متعدد مثالیں دوسرے عنوانات میں مذکور ہیں، ایک دفعہ ایک یہودی نے آکر شکایت کی کہ محمدؐ! دیکھو ایک مسلمان نے مجھکو تھپڑ مارا ہے، آپ نے اُس مسلمان کو اُسی وقت بلوا کر جرح فرمایا،

نصاریٰ کا وفد، جب نجران سے مدینہ حاضر ہوا، تو آپ نے اُسکی مہمانداری کی، مسجد نبوی میں انکو جگہ دی، بلکہ ان کو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت دیدی، اور جب عام مسلمانوں نے اُن کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپ نے منع فرمایا[4]،

یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے نکاح و معاشرت کی اجازت دی، اور ان کے لیے مخصوص امتیازی احکام

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز، [2] ایضاً، [3] صحیح مسلم کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ مصر، [4] زاد المعاد،

شریعت اسلامیہ میں جاری فرمائے،)

غریبوں کے ساتھ محبت و شفقت

(مسلمانوں میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، دولتمند بھی، اور فاقہ کش بھی، لیکن آنحضرت صلعم کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا، بلکہ غریبوں کے ساتھ آپ اس طرح پیش آتے تھے کہ دنیاوی دولت کی محرومی اُنکے دلوں کو صدمہ نہیں پہنچاتی تھی، ایک دفعہ تقاضائے بشریت سے آپ کا ایک فعل اس کے خلاف ہوا، تو بارگاہِ احدیت سے اسپر باز پرس ہوئی، مکہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے پاس چند اکابر قریش بیٹھے تھے اور آپ انکو اسلام کی دعوت دے رہے تھے، کہ اتفاق سے عبداللہ بن ام مکتوم جو آنکھوں سے معذور اور غریب تھے، ادھر آنکلے، اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھکر آپ سے باتیں کرنے لگے، روسائے قریش جو کہ سخت متکبر اور خود دار تھے، ان کو یہ برابری ناگوار گذری، آپ نے ابن ام مکتوم کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اس امید پر اُنھیں سے باتیں کرتے رہے کہ شاید یہ اشقیا اسلام کی سعادت کو قبول کرلیں اور اُن کے دِل حق کی لذت سے آشنا ہوں، لیکن خدا کو یہ امتیاز پسند نہ آیا اور یہ آیت اتری[1]،

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ	پیغمبر نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا کہ اُس کے پاس اندھا
لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى، اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى	آیا، اے پیغمبر! تجھے کیا خبر کہ تیری باتوں سے وہ پاک ہوجاتا، یا
اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَمَا	نصیحت حاصل کرتا، تو نصیحت اسکو نفع پہنچاتی، لیکن جو بے پروائی
عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى، وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى	برتتا ہے اسکی طرف تو تو متوجہ ہوتا ہے اور تیرا کیا نقصان ہے اگر وہ پاک
وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى، كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ،	صاف نہ ہو لیکن جو تیرے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈر بھی رہا ہے تو اس
فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ، (عبس)	سے بے اعتنائی کرتا ہے ہرگز نہیں یہ نصیحت عام ہے جو چاہے اسکو یاد رکھے

یہی غربا اور مفلس اسلام کے سب سے پہلے جاں نثار تھے، آنحضرت صلعم ان کو لیکر حرم میں نماز پڑھنے جاتے تھے تو روسائے قریش ان کی ظاہری بدحیثیتی کو دیکھکر استہزاءً کہتے تھے،

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا،	یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے،

[1] ترمذی، تفسیر سورۂ مذکور،

لیکن آپ اُن کے اس استغنا کو خوشی سے برداشت کرتے تھے،

حضرت **سعد بن ابی وقاص** کے مزاج میں کسی قدر تعلّی تھی اور وہ اپنے آپ کو غریبوں سے بالاتر سمجھتے تھے، آپ نے اُن کی طرف خطاب کرکے فرمایا "تم کو جو نصرت اور روزی میسر آتی ہے وہ انہیں غریبوں کی بدولت[1] آتی ہے"

اسامہ بن زید سے فرمایا "میں نے درِ جنّت پر کھڑے ہوکر دیکھا کہ زیادہ تر غریب و مفلس ہی لوگ اس میں داخل ہیں[2]"

عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مسجد نبوی میں بیٹھا تھا اور غریب مہاجر لوگ حلقہ باندھے ایک طرف بیٹھے تھے، اسی اثنا میں آپ تشریف لے آئے، اور انہیں کے ساتھ ملکر بیٹھ گئے، یہ دیکھکر میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُن کے پاس جاکر بیٹھ گیا، آپ نے فرمایا فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولت مندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے، عبداللہ عمرو کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ یہ سنکر اُن کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے اور مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی انہیں میں[3] ہوتا"

ایک دفعہ آپ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص سامنے سے گذرا، آپ نے اپنے پہلو کے ایک آدمی سے دریافت فرمایا کہ اسکی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ یہ امراء کے طبقہ میں سے ایک صاحب ہیں خدا کی قسم یہ اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو کیا جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول کیجائے، یہ سنکر آپ خاموش ہوگئے، کچھ دیر کے بعد ایک اور صاحب اُسی راہ سے گذرے، آپ نے پھر اُس سے استفسار فرمایا کہ اس کی نسبت کیا کہتے ہو؟ عرض کی یارسول اللہ یہ فقرائے مہاجرین میں سے ہے اور اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو واپس کردیا جائے، اور سفارش کرے تو رد کردی جائے، اور اگر کچھ کہنا چاہے تو سنا نہ جائے" ارشاد ہوا کہ تمام روئے زمین میں اگر اُس امیر جیسے آدمی ہوں تو اُس سے یہ ایک غریب[4] بہتر ہے،

آنحضرت صلعم اکثر دعا میں فرمایا کرتے تھے "خداوندا مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اُٹھا، اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر"، حضرت عائشہ نے دریافت کیا، یارسول اللہ صلعم یہ کیوں؟ فرمایا اس لیے کہ یہ دولت مندوں سے پہلے جنّت

[1] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء بروایت صحیح مسلم، [2] حوالہ مذکور بروایت بخاری ومسلم، [3] حوالہ مذکور بروایت دارمی [4] حوالہ مذکور بروایت صحیح بخاری وصحیح مسلم۔

میں جائیں گے، پھر فرمایا اے عائشہ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے نامُراد نہ پھیرو، گو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں ہو، اے عائشہ غریبوں سے محبت رکھو، اور ان کو اپنے سے نزدیک کرو تو خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کریگا[1]،

ایک دفعہ چند غریب مسلمانوں نے آکر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یارسول اللہ اُمرا ہم سے درجۂ اُخروی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں، نماز، روزہ جس طرح ہم کرتے ہیں، وہ بھی کرتے ہیں، لیکن صدقات وخیرات سے جو نیکیاں اُن کو ملتی ہیں اُن سے ہم محروم ہیں، آپ نے فرمایا کیا میں تم کو وہ بات نہ بتاؤں جس سے تم اگلوں کے برابر ہو جاؤ، اور پچھلوں سے بڑھ جاؤ، اور پھر کوئی تمہاری برابری نہ کرسکے، عرض کی ہاں یارسول اللہ بتائیے" ارشاد ہوا ہر نماز کے بعد ۳۳ ۳۳ دفعہ سبحان اللہ، اور الحمدللہ، اللہ اکبر، پڑھ لیا کرو، کچھ دن کے بعد یہ وفد پھر حاضر خدمت ہوا، اور عرض کی، یا رسول اللہ ہمارے دولت مند بھائیوں نے بھی یہ وظیفہ سن لیا اور پڑھنا شروع کردیا، فرمایا ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، یعنی یہ خدا کا دین ہے جس کو چاہے دیدے[2]،

مسلمانوں سے جو زکوٰۃ وصول ہوتی تھی اُسکی نسبت عام حکم تھا کہ

توخذ من امرائھم وترد علی فقرائھم، ہر قبیلہ کے یا ہر شہر کے امراء سے لیکر وہیں کے غربا میں تقسیم کردیجائے،

صحابہ اس کی شدت سے پابندی کرتے تھے اور ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ نہیں بھیجتے تھے[3]،

مساوات کے بیان میں یہ واقعہ بتفصیل مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی بات پر حضرت سلمانؓ و بلالؓ کو جنکا شمار فقرائے مہاجرین میں ہے ڈانٹا تھا، آپ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا کہ "تم نے ان لوگوں کو آزردہ تو نہیں کیا؟" یہ سنکر حضرت ابوبکر ان لوگوں کے پاس واپس آئے اور معافی مانگی، اور ان لوگوں نے معاف کیا[4]،

عوالی میں ایک غریب عورت رہتی تھی، وہ بیمار پڑی اُس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی، خیال تھا کہ وہ آج کیسوقت مرجائے گی، آپ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مرجائے تو میں جنازہ کی نماز خود پڑھاؤں تو اُس کے بعد دفن کی جائے، اتفاق سے اُسے کچھ رات گئے انتقال کیا، اس کا جنازہ جب تیار ہو کر لایا گیا تو آپ آرام فرماچکے تھے، صحابہ اسوقت

---

[1] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء بروایت ترمذی وبیہقی وابن ماجہ، [2] صحیح بخاری ومسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ [3] ابوداؤد زکوٰۃ

آپ کو تکلیف دینی مناسب نہ سمجھے اور رات ہی کو دفن کر دیا، صبح کو آپ نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا، آپ یہ سنکر کھڑے ہو گئے اور صحابہ کو ساتھ لیکر دوبارہ اسکی قبر پر جاکر نماز جنازہ ادا کی،[1]

حضرت جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن پہلے پہر ہم لوگ آنحضرت صلعم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پورا قبیلہ مسافر وار حاضر خدمت ہوا، اُن کی ظاہری حالت اس درجہ خراب تھی کہ کسی کے بدن پر کوئی کپڑا ثابت نہ تھا، برہنہ تن برہنہ پا، کھالیں بدن سے بندھی ہوئی، تلواریں گلوں میں پڑی ہوئی، ان کی یہ حالت دیکھکر آپ سخت متاثر ہوئے، چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، اضطراب میں آپ اندر گئے باہر آئے، پھر حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا، نماز کے بعد آپ نے خطبہ دیا، اور تمام مسلمانوں کو انکی امداد و اعانت کے لیے آمادہ کیا،[2]

دشمنانِ جان سے عفو و درگذر

جانی دشمنوں اور قاتلانہ حملہ آوروں سے عفو و درگذر کا واقعہ پیغمبروں کے صحیفۂ اخلاق کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے، جس شب کو آپ نے ہجرت فرمائی ہے، کفار قریش کے نزدیک یہ طے شدہ تھا کہ صبح کو محمدؐ کا سر قلم کر دیا جائے گا، اس لیے دشمنوں کا ایک دستہ رات بھر خانۂ نبوی کا محاصرہ کیے کھڑا رہا، اگرچہ اسوقت ان دشمنوں سے انتقام لینے کی آپ میں ظاہری قوت نہ تھی، لیکن ایک وقت آیا جب ان میں سے ایک ایک شخص کی گردن اسلام کی تلوار کے نیچے تھی، اور اسکی جان صرف آنحضرت صلعم کے رحم و کرم پر موقوف تھی، لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اس جرم میں کبھی مقتول نہیں ہوا،

ہجرت کے دن قریش نے آنحضرت صلعم کے سر کی قیمت مقرر کی تھی، اور اعلان کیا تھا کہ جو محمدؐ کا سر لائے گا یا زندہ گرفتار کرے گا اسکو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے، سراقہ بن جعشم پہلے شخص تھے جو اس نیت سے اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے آپ کے قریب پہنچے آخر دو تین دفعہ کرشمۂ اعجاز دیکھکر اپنی نیت بد سے توبہ کی، اور خواہش کی کہ مجکو سند امان لکھدیجائے، چنانچہ سند امان لکھکر ان کو دی گئی،[3] اس کے آٹھ برس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے اور اس جرم کے متعلق ایک حرف سوال بھی درمیان میں نہیں آیا۔[4]

[1] یہ واقعہ صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہے لیکن یہاں سنن نسائی کتاب الجنائز باب الصلوة فی اللیل سے لیا گیا ہے [2] صحیح مسلم صدقات [3] صحیح بخاری باب الہجرة
[4] سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کا حال، استیعاب و اصابہ وغیرہ میں دیکھو

عمیر بن وہب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سخت دشمن تھا، مقتولین بدر کے انتقام کے لیے جب سارا قریش بے تاب تھا، تو صفوان بن امیہ نے اس کو بیش قرار انعام کے وعدہ پر مدینہ بھیجا تھا کہ چپکے سے جا کر نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کا کام تمام کر دے، عمیر اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آیا، لیکن وہاں پہنچنے کے ساتھ اس کے تیور دیکھکر لوگوں نے پہچان لیا، حضرت عمر نے اس کے ساتھ سختی کرنی چاہی، لیکن آپ نے منع فرمایا، اور اپنے قریب بٹھا کر اس سے باتیں کیں اور اصلی راز ظاہر کر دیا، یہ سنکر سناٹے میں آگیا، لیکن آپ نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، یہ دیکھکر وہ اسلام لایا، اور مکہ میں جاکر اسلام کی دعوت پھیلائی[1]، یہ واقعہ سنہ ۳ھ کا ہے،

ایک دفعہ آپ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، راہ میں ایک میدان آیا، دھوپ تیز تھی، لوگوں نے درختوں کے نیچے بستر لگا دیئے، آنحضرت صلعم نے بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا، اور تلوار درخت کی شاخ سے لٹکا دی، کفار موقع کے منتظر رہتے تھے، لوگوں کو غافل دیکھکر، ناگاہ ایک طرف سے ایک بدو نے آکر شجری سے تلوار اتار لی، دفعۃً آپ بیدار ہوئے، تو دیکھا ایک شخص سرہانے کھڑا ہے، اور ننگی تلوار اُس کے ہاتھ میں ہے، آپ کو بیدار دیکھکر بولا، کیوں محمد! اب بتاؤ تم کو اسوقت مجھ سے کون بچا سکتا ہے"، آپ نے فرمایا "اللہ"، یہ پُر اثر آواز سنکر اُسنے تلوار نیام میں کر لی، اتنے میں صحابہ آگئے، آپ نے اُن سے واقعہ دہرایا، اور بدو سے کسی قسم کا تعرض نہیں[2] فرمایا،

ایک دفعہ ایک اور شخص نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا، صحابہ اسکو گرفتار کر کے آنحضرت صلعم کے سامنے لائے، وہ آپ کو دیکھکر ڈر گیا، آپ نے اسکو مخاطب کر کے فرمایا، "ڈرو نہیں، اگر تم مجھکو قتل کرنا چاہتے بھی تو نہیں کر سکتے تھے[3]")

فتح مکہ کے زمانہ میں ایک دفعہ اسی آدمیوں کا ایک دستہ منہ اندھیرے جبل تنعیم سے اُتر کر آیا، اور چھپکر آنحضرت صلعم کو قتل کرنا چاہا، اتفاق سے وہ لوگ گرفتار ہو گئے، لیکن آنحضرت صلعم نے انکو چھوڑ دیا اور کچھ تعرض نہیں کیا، (قرآن مجید کی یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی[4] ہے،

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم (فتح) اسی خدا نے اُنکے ہاتھ تمسے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک لیئے)

---

۱ تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر، ۲ صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۲، ۳ مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۷۱، ۴ جامع ترمذی تفسیر فتح،

خیبر میں ایک یہودیہ نے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو کھانے میں زہر دیا، آپ نے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا، آپ نے یہودیوں کو بلاکر دریافت کیا تو اُنھوں نے اقرار کیا، لیکن آپ نے کسی سے کچھ تعرض نہیں فرمایا، لیکن اسی زہر کے اثر سے جب ایک صحابی نے انتقال کیا تو آپ نے صرف اُس یہودیہ کو قصاص کی سزا دی (حالانکہ خود آنحضرت صلعم کو زہر کا اثر [illegible] تک محسوس ہوتا رہتا تھا[۱]،)

دشمنوں کے حق میں دعائے خیر

(دشمنوں کے حق میں بددعا کرنا، انسان کی فطری عادت ہے، لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، جو لوگ انکو گالیاں دیتے ہیں، وہ اُنکے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں، اور جو اُنکے تشنۂ خون ہوتے ہیں، وہ ان کو پیار کرتے ہیں، ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر، اور خود آنحضرت صلعم پر جو پیہم مظالم ہو رہے تھے اُس داستان کے دُہرانے کے لیے بھی سنگدلی درکار ہے، اسی زمانہ میں حضرت خباب بن ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ یارسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بددعا فرمائیے، یہ سنکر چہرۂ مبارک سُرخ ہوگیا[۲]، ایک دفعہ چند صاحبوں نے ملکر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا "میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بناکر بھیجا گیا ہوں[۳]"

وہ قریش جنھوں نے تین برس تک آپ کو محصور رکھا، اور جو آپ کے پاس غلہ کے ایک دانہ کے پہنچنے کے روادار نہ تھے، اُن کی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبوی کی استجابت نے ابر رحمت کا سایہ اُنکے سر سے اُٹھالیا، اور مکہ میں اسقدر سخت قحط پڑا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے، ابوسفیان نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ محمدؐ! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو، آپ نے بلا عذر فوراً دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے، اور خدا نے اس مصیبت سے اُن کو نجات[۴،۵] دی،

جنگ اُحد میں دشمنوں نے آپ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندانِ مبارک کو شہید کیا، جبینِ اقدس کو خون آلودہ کیا، لیکن ان حملوں کا وار آپ نے جس سپر پر روکا، وہ صرف یہ دعا تھی،

اللھم اھدِ قومی فانھم لا یعلمون، خدایا! ان کو معاف کر کہ یہ نادان ہیں،

---

۱ صحیح بخاری وفاة النبی صلعم، ۲ صحیح بخاری مبعث النبی صلعم ۳ مشکوٰة اخلاق النبی صلعم بحوالہ صحیح مسلم ۴ صحیح مسلم ۵ صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان جلد دوم

گوارا نہ تھی، فرمایا کہ کوئی "میرا غلام" "میری لونڈی" نہ کہے "میرا بچہ" "میری بچی" کہے، اور غلام بھی اپنے آقا کو خداوند نہ کہیں، خداوند خدا ہے، آقا کہیں، آنحضرت صلعم کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی "غلاموں کے معاملہ میں خدا سے ڈرا کرنا"،

حضرت **ابوذر** بہت قدیم الاسلام صحابی تھے، اور آنحضرت صلعم ان کی راست گوئی کی مدح فرماتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے ایک عجمی آزاد غلام کو بُرا بھلا کہا، غلام نے آنحضرت صلعم سے جاکر شکایت کی آپ نے ابوذر کو زجر فرمایا کہ "تم میں اب تک جاہلیت باقی ہے، یہ غلام تمہارے بھائی ہیں، خدا نے تم کو ان پر فضیلت عطا کی ہے، اگر وہ تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں تو اُن کو فروخت کر ڈالو، خدا کی مخلوق کو ستایا نہ کرو، جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ، انکو ایسا کام نہ دو جو وہ نہ کرسکیں، اور اگر ایسا کام دو تو خود بھی ان کی اعانت کرو[1]"،

ایک دفعہ ابومسعود انصاری اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی، "ابومسعود! تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے، خدا کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے، "ابومسعود نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلعم تھے، عرض کی یا رسول اللہ! میں نے لوجہ اللہ اس غلام کو آزاد کیا، فرمایا اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تم کو چھو لیتی"

ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپ خاموش رہے، اُسنے پھر عرض کی، آپ نے پھر خاموشی اختیار کی، اس نے تیسری بار عرض کی، آپ نے فرمایا "ہر روز ستر بار معاف کیا کرو"،

آنحضرت صلعم کے عہد میں ایک خاندان میں سات آدمی تھے، اور سات آدمیوں کے بیچ میں ایک ہی لونڈی تھی، ایک دفعہ ان میں سے ایک نے اُس لونڈی کو ایک تھپڑ مارا، آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کردو، ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم سات آدمیوں کے بیچ میں یہی ایک خادمہ ہے، آپ نے فرمایا، اچھا اسوقت تک خدمت گذاری کرے جب تک تم اس سے بے نیاز نہ ہو جاؤ، جب حاجت نہ رہے تو وہ آزاد ہے[2]"

[1] بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیۃ و ابوداؤد کتاب الادب، [2] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الادب باب حق المملوک میں مذکور ہیں۔

ایک صاحب کے پاس دو غلام تھے جنکے وہ بہت شاکی تھے، وہ ان کو مارتے تھے، بُرا بھلا کہتے تھے، لیکن وہ دونوں مارے آتے، اُنھوں نے آکر آنحضرت صلعم سے شکایت کی اور اسکا علاج پوچھا، آپ نے فرمایا، تمہاری سزا اگر اُن کے قصور کے برابر ہوگی تو خیر، ورنہ سزا کی جو مقدار زاید ہوگی اُس کے برابر تمھیں بھی خدا سزا دیگا، یہ سنکر وہ بیقرار ہوگئے، اور گریہ وزاری شروع کی، آنحضرت صلعم نے فرمایا یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا، وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ الخ یہ سنکر انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بہتر یہ ہے کہ میں اُنکو اپنے سے جدا کردوں، آپ گواہ رہیں کہ اب وہ آزاد ہیں[1]

غلاموں کا لوگ بیاہ کردیتے تھے اور پھر جب چاہتے تھے جبراً ان میں تفریق کردیتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا عقد کردیا، اور پھر دونوں میں علیحدگی کرنی چاہی، غلام نے خدمت نبوی میں آکر شکایت کی آپ نے منبر پر خطبہ دیا، کہ لوگ کیوں غلاموں کا نکاح کرکے پھر تفریق کرانا چاہتے ہیں، نکاح وطلاق کا حق صرف شوہر کو ہے[2]،

اسی رحم وشفقت کا اثر تھا کہ اکثر کافروں کے غلام بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور آپ اُنھیں آزاد فرما دیتے تھے[3]، مال غنیمت جب تقسیم ہوتا تو آپ اس میں سے غلاموں کو بھی حصہ دیتے تھے[4]، جو غلام نئے آزاد ہوتے تھے چونکہ ان کے پاس کوئی مالی سرمایہ نہیں ہوتا تھا اس لیے جو آمدنی وصول ہوتی تھی اس میں سب سے پہلے آپ انھیں کو عنایت فرماتے تھے،)

مستورات کے ساتھ برتاؤ | دنیا میں یہ صنف ضعیف (عورتیں) چونکہ ہمیشہ ذلیل رہی ہے، اس لیے کسی نامور شخص کے حالات میں یہ پہلو کبھی پیشِ نظر نہیں رہا کہ اس مظلوم گروہ کے ساتھ اس کا طریق معاشرت کیا تھا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جسنے عورتوں کی حق رسی کی اور عزت ومنزلت کے دربار میں انکو مردوں کے برابر جگہ دی، اسلیے تاریخ اسلام کے واقعات زندگی میں ہمکو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مستورات کے ساتھ اُنکا کا طرزِ عمل کیا تھا،

صحیح بخاری میں آنحضرت صلعم کے ایلاء (ازواج سے چیدروزہ علحدگی کی جو روایت مذکور ہے، اُس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۸۰ [2] سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق، [3] ابوداؤد کتاب الجہاد و مسند ابن حنبل جلد اول ۲۴۸ [4] ابوداؤد باب قسمۃ الفئ

نقل کیا ہے کہ مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ناقابل التفات سمجھتے تھے، مدینہ میں نسبتہً عورتوں کی قدر تھی، لیکن وہ اس قدر جسکی وہ مستحق تھیں، آنحضرت صلعم نے جس طرح اپنے ارشاد و احکام سے ان کی حقوق قائم کئے، آپ کے برتاؤ نے اور زیادہ اس کو قوی اور نمایاں کر دیا، ازواج مطہرات کے واقعات مستقلاً مذکور ہیں، یہاں ہم عام واقعات لکھتے ہیں،

آنحضرت صلعم کے دربار میں چونکہ ہر وقت مردوں کا ہجوم رہتا تھا، عورتوں کو وعظ و پند سننے اور مسائل کے دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، مستورات نے آکر درخواست کی کہ مردوں سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اس لیے ہمارے لیے ایک خاص دن مقرر کر دیا جائے، آنحضرت صلعم نے اُن کی درخواست قبول[1] فرمائی، اور ان کے دربار کا ایک خاص دن مقرر ہو گیا،

جن لوگوں نے آغاز اسلام میں حبش کو ہجرت کی تھی، ان میں اسماء بنت عمیس بھی تھیں، خیبر کی فتح کے زمانہ میں مہاجرین حبش مدینہ میں آئے، تو وہ بھی آئیں، ایک دن وہ حضرت حفصہ سے ملنے گئیں، اتفاق یہ کہ اُسوقت حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، انکو دیکھکر پوچھا یہ کون ہیں، حضرت حفصہ نے نام بتایا، حضرت عمرؓ نے کہا ہاں وہ حبش والی، وہ سمندر والی" اسماء بنت عمیس نے کہا ہاں وہی، حضرت عمرؓ نے کہا "ہمنے تم لوگوں سے پہلے ہجرت کی، اور اس لیے رسول اللہ صلعم پر ہمارا زیادہ حق ہے"، اسماء کو سخت غصہ آیا، بولیں، ہرگز نہیں، تم لوگ رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہتے تھے، وہ بھوکوں کو کھلاتے تھے، ہمارا یہ حال ہے کہ گھر سے دور، بیگانے حبشیوں میں رہتے تھے، لوگ ہمکو ستاتے تھے، اور ہر وقت جان کا ڈر لگا رہتا تھا،

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رسول اللہ صلعم آگئے، اسماء نے کہا یا رسول اللہ عمرؓ نے یہ یہ کہا، آپ نے فرمایا تمنے کیا جواب دیا انھوں نے ماجرا سنایا، آپ نے فرمایا عمرؓ کا حق مجھ پر تم سے زیادہ نہیں ہے، عمرؓ اور اُن کے ساتھیوں نے صرف ایک ہجرت کی، اور تم لوگوں نے دو ہجرتیں کیں"

اس واقعہ کا چرچا پھیلا تو مہاجرین حبش جوق جوق اسماءؓ کے پاس آتے، اور آنحضرت صلعم کے الفاظ اُن سے بار بار دُہرواکر سنتے، حضرت اسماء کا بیان ہے کہ مہاجرین حبش کے لیے دنیا میں کوئی چیز آنحضرت صلعم کے اُن الفاظ سے

[1] صحیح بخاری کتاب العلم ھل یجعل للنساء یوم علی حدہ

زیادہ تر مسرت انگیز نہ تھی[1]،

حضرت انس بن مالک جو خادم خاص تھے، انکی خالہ کا نام ام حرام تھا، (جو رضاعت کے رشتہ سے آپ کی بھی خالہ تھیں) معمول تھا جب آپ قبا تشریف لے جاتے تو اُن کے پاس ضرور جاتے، وہ اکثر کھانا لاکر پیش کرتیں اور آپ نوش فرماتے، آپ سو جاتے تو بالوں میں سے جوئیں نکالتیں[2]،

حضرت انس کی والدہ، ام سلیم سے آپ کو نہایت محبت تھی، آپ اکثر اُن کے گھر تشریف لے جاتے، وہ بچھونا بچھا دیتیں، آپ آرام فرماتے، جب سو کر اُٹھتے تو وہ آپ کا پسینہ ایک شیشی میں جمع کر لیتیں، مرتے وقت وصیت کی کہ کفن میں حنوط ملا جائے تو عرق مبارک کے ساتھ ملا جائے[3]،

ایک دفعہ حضرت انس کی دادی ملیکہ نے آپ کی دعوت کی، کھانا خود تیار کیا تھا، آنحضرت صلعم نے کھانا نوش فرما کر فرمایا آؤ میں تم کو نماز پڑھاؤں، گھر میں صرف ایک چٹائی تھی اور وہ بھی پرانی ہو کر سیاہ ہو گئی تھی، حضرت انسؓ نے پہلے اسکو پانی سے دھویا، اور پھر نماز کے لیے بچھایا، آنحضرت صلعم نے امامت کی، حضرت انس اور انکی دادی اور یتیم (غلام) صف باندھکر کھڑے ہوئے، آپ نے دو رکعت نماز ادا کی، اور واپس آئے[4]،

حضرت ابوبکر کی صاحبزادی (اسماء) جو حضرت عائشہ کی علاتی بہن تھیں، حضرت زبیرؓ سے بیاہی تھیں، مدینہ میں آئیں تو اُسوقت حضرت زبیر کی یہ حالت تھی کہ ایک گھوڑے کے سوا، اور کچھ نہ تھا، حضرت اسماء خود ہی گھوڑے کے لیے جنگل سے گھاس لاتیں اور کھانا پکاتیں، حضرت زبیر کو جو زمین آنحضرت صلعم نے عطا فرمائی تھی اور جو مدینہ سے دو میل پر تھی، وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں سر پر لاد کر لاتیں، ایک دن وہ گٹھلیاں لیے ہوئے آرہی تھیں کہ آنحضرت صلعم نے دیکھا، آپ اُسوقت اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کو بٹھا دیا، کہ وہ سوار ہو لیں، حضرت اسماء شرمائیں، آنحضرت صلعم نے یہ دیکھکر کہ وہ حجاب کرتی ہیں کچھ نہیں فرمایا، اور ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، حضرت اسماء کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے ایک خادم بھیجا، جو گھوڑے کی خدمت کرتا تھا، مجھکو اس قدر غنیمت معلوم ہوا کہ گویا میں غلامی سے آزاد ہو گئی[5]،

---

۱ صحیح بخاری غزوہ خیبر، ۲ بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۳۹۱، ۳ بخاری کتاب الاستیذان ۴ بخاری باب الصلوۃ علی الحصیر ۵ بخاری صفحہ ۷۸۶، کتاب النکاح

(ایک بار قرابت کی بہت سی بی بیاں بیٹھی ہوئی آنحضرت صلعم سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں، حضرت عمرؓ آئے تو سب اُٹھکر چل دیں، آنحضرت صلعم ہنس پڑے، حضرت عمرؓ نے کہا خدا آپ کو خندان رکھے، کیوں ہنسے، فرمایا مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ تمہاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں، حضرت عمرؓ نے اُن کی طرف مخاطب ہوکر کہا اے اپنی جان کی دشمنو مجھ سے ڈرتی ہو، اور آنحضرت صلعم سے نہیں ڈرتیں" سب نے کہا تم رسول اللہ صلعم کی نسبت سخت مزاج ہو[1]

ایک دفعہ حضرت عائشہ کے گھر میں آپ منھ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے، عید کا دن تھا، چھوکریاں گا بجا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ آئے تو اُن کو ڈانٹا، آنحضرت صلعم نے فرمایا ان کو گانے دو یہ ان کی عید کا دن ہے[2]،

عورتیں عموماً نہایت دلیری کے ساتھ آپ سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں اور صحابہ کو اُنکی اس جرأت پر حیرت ہوتی تھی لیکن آپ کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے،)

چونکہ عورتیں عموماً نازک طبع اور ضعیف القلب ہوتی ہیں ان کی خاطر داری کا نہایت خیال رکھتے تھے،

انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خوان تھے، یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے، ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہرات ساتھ تھیں، انجشہ حُدی پڑھتے جاتے تھے، اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپ نے فرمایا "انجشہ دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں،

حیوانات پر رحم | حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے، ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے، موقوف کرا دیئے اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام دستور تھا اُسکو روک دیا[3] (زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیتے تھے اور اس کو پکا کر کھاتے تھے، اسکو منع کر دیا جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا، اور فرمایا کہ دم ان کا مورچھل اور ایال ان کا لحاف ہے، جانوروں کو دیر تک سواری میں باندھکر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشستگاہ اور کرسی نہ بناؤ" اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا بھی ناجائز بتایا، ایک بیرحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھکر اُس کو نشانہ بناتے تھے اور مشق تیراندازی کرتے تھے اس سنگدلی کی بھی قطعاً ممانعت کر دی،)

[1] صحیح بخاری مناقب عمر بن خطاب، [2] مسلم کتاب العیدین [3] صحیح مسلم باب اللباس والزینہ

ایک دفعہ ایک گدھا راہ میں نظر پڑا جسکا چہرہ داغا گیا تھا، فرمایا کہ جس نے اس کا چہرہ داغا ہے، اس پر خدا کی لعنت ہے،
علامت یا بعض اور دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا، ایسی حالت میں آپ اُن اعضا کو داغتے
جو زیادہ نازک نہیں ہوتے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے ریوڑ میں گیا دیکھا تو رسول اللہ صلعم
بکریوں کے کان داغ رہے ہیں[1]،

(ایک بار آپ کسی سفر میں جا رہے تھے، لوگوں نے ایک مقام پر منزل کیا، وہاں ایک پرندہ نے انڈا دیا تھا،
ایک شخص نے وہ انڈا اُٹھا لیا، چڑیا بیقرار ہوکر پر مار رہی تھی، آنحضرت صلعم نے دریافت کیا کہ اس کا انڈا چھینکر کس نے
اُس کو اذیت پہنچائی، ان صاحب نے کہا "یا رسول اللہ مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے"، آپ نے فرمایا "وہیں رکھ دو[2]"

ایک صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اُن کے ہاتھ میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرندہ کے بچے تھے آپ نے
دریافت فرمایا تو عرض کی کہ ایک جھاڑی سے آواز آرہی تھی، جاکر دیکھا تو یہ بچے تھے، میں نے انکو نکال لیا، پرندہ نے یعنی
ان بچوں کی ماں نے یہ دیکھا تو وہ میرے سر پر منڈلانے لگی، آپ نے فرمایا، جاؤ، ان بچوں کو وہیں[3] پھر رکھ آؤ"

ایک بار راستہ میں ایک اونٹ نظر سے گذرا جس کے پیٹ اور پیٹھ شدت گرسنگی سے ایک ہوگئے تھے، فرمایا کہ ان
بے زبانوں کے متعلق خدا سے ڈرو[4]"، ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں آپ ضرورت سے تشریف لے گئے ایک
گرسنہ اونٹ نظر پڑا، آپ کو دیکھکر بلبلایا، آپ نے شفقت سے اُسپر ہاتھ پھیرا، پھر لوگوں سے اسکے مالک کا نام پوچھا معلوم
ہوا کہ ایک انصاری کا ہے، اُن سے آپ نے فرمایا کہ اس جانور کے معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے[5])

رحمت و محبت عام | (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بنکر آئی تھی، حضرت مسیح نے کہا تھا
کہ میں امن کا شاہزادہ ہوں، لیکن شہزادۂ امن کی اخلاقی حکومت کا ایک کارنامہ بھی اس کے ثبوت میں محفوظ نہیں،
لیکن اس کے شاہنشاہ کو خداوند ذوالجلال ہی نے خطاب کیا،

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، محمد ہم نے تجھکو تمام دنیا کے لیے رحمت بناکر بھیجا ہے،

---

[1] حدیثیں ترمذی و ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں [2] ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ البہائم [3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد و باب رحمۃ الولد [4] ابوداؤد کتاب الجہاد [5] ابوداؤد باب کورہ،

تم آنحضرت صلعم کے حلم وعفو، مسامحت و درگذر کے سیکڑوں واقعات پڑھ چکے، نظر آیا ہوگا کہ اس خزانۂ رحمت میں دوست دشمن کافر مسلم، بوڑھے بچے، عورت مرد، آقا و غلام، انسان و حیوان، ہر ایک صنف ہستی برابر کی حصہ دار تھی،

ایک صاحب نے آپ سے کسی پر بددعا کرنے کی درخواست کی تو غضبناک ہو کر فرمایا "میں دنیا میں لعنت کے لئے نہیں آیا ہوں[1]، رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں" آپ نے دنیا کو پیام[2] دیا،

لاتحاسدوا ولا تباغضوا وکونوا عباد اللہ اخوانا، — ایک دوسرے پر بغض و حسد نہ کرو، اے خدا کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ،

ایک اور حدیث میں حکم فرمایا،

احب للناس ماتحب لنفسک تکن مسلما[3] — لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلم ہوگے،

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا،

لایومن احدکم حتی یحب للناس مایحب لنفسہ وحتی یحب المرء لایحبہ الا للہ عزوجل، (مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۲۷۲) — تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب لوگوں کے لیے وہی محبوب رکھے جو اپنے لیے رکھتا ہے اور جب تک وہ دوسرے کو محض خدا کے لیے پیار نہ کرے،

ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی "خدایا مجھکو اور محمد کو مغفرت عطا کر" آپ نے فرمایا "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"[4]

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی مسجد نبوی میں[5] آیا، اور آپ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر اپنے اونٹ پر سوار ہوا، اور بولا "خداوندا مجھپر اور محمدؐ پر رحمت بھیج، اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر" آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا "بتاؤ یہ زیادہ راہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ" یعنی آپ نے اس قسم کی دعا کو ناپسند فرمایا،

رقیق القلبی | آنحضرت صلعم نہایت نرم دل اور رقیق القلب تھے، (مالک بن حویرث ایک وفد کے رکن بن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے، ان کو ۲۰ دن تک مجلس نبوی میں شرکت کا موقع ملا تھا وہ فرماتے تھے،

کان رسول اللہ صلعم رحیما رفیقا، — آنحضرت صلعم رحیم المزاج اور رقیق القلب[6] تھے،)

---

[1] زرقانی ص ۲۸۹ ج ۴ [2] صحیح بخاری باب الہجرۃ صفحہ ۸۹۰، [3] جامع ترمذی ابواب الزہد بسند غریب، [4] صحیح بخاری کتاب الادب، [5] ابوداؤد کتاب الادب، شاید یہ دونوں واقعے ایک ہوں، [6] بخاری صفحہ ۸۸ باب رحمۃ الناس،

حضرت زینبؓ کا بچہ مرنے لگا تو انہوں نے آنحضرت صلعم کو بلا بھیجا اور قسم دلائی کہ ضرور تشریف لائیے، فوراً آپ تشریف لے گئے، حضرت سعد بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت بھی ساتھ تھے، بچہ کو لوگ ہاتھ میں لیکر سامنے لائے، وہ دم توڑ رہا تھا، بے اختیار آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعد کو تعجب ہوا کہ یا رسول اللہ یہ کیا، فرمایا خدا اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر بھی رحم کرتے ہیں[1]"

غزوۂ اُحد کے بعد جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو گھر گھر شہیدوں کا ماتم برپا تھا، مستورات اپنے اپنے شہیدوں پر نوحہ کر رہی تھیں، یہ دیکھکر آپ کا دل بھر آیا، اور فرمایا "حمزہؓ (عم رسول اللہ) کا کوئی نوحہ خواں نہیں[2]"

ایک بار ایک صحابی جاہلیت کا اپنے ایک قصہ بیان کر رہے تھے، کہ میری ایک چھوٹی لڑکی تھی، عرب میں لڑکیوں کے مار ڈالنے کا کہیں کہیں دستور تھا، میں نے بھی اپنی لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا، وہ ابا ابا کہکر پکار رہی تھی، اور میں اُس پر مٹی کے ڈھیلے ڈال رہا تھا، اس بیدردی کو سنکر آنحضرت صلعم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، آپ نے فرمایا کہ اس قصہ کو پھر دہراؤ، ان صحابی نے اس دردناک ماجرے کو دوبارہ بیان کیا، آپ بے اختیار روئے، یہاں تک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہو گئے[3]،

حضرت عباسؓ بدر میں گرفتار ہو کر آئے، تو لوگوں نے انکے ہاتھ پاؤں بہت جکڑ کر باندھ دیئے تھے، وہ درد سے کراہتے تھے، اُن کے کراہنے کی آواز گوش مبارک میں بار بار پہنچ رہی تھی، لیکن اس خیال سے انکے ہاتھ نہیں کھولتے تھے، کہ لوگ کہیں گے کہ یہ اپنے عزیزوں کے ساتھ غیر مساویانہ رحمدلی ہے، تاہم نیند نہیں آتی تھی اور آپ بیچین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہے تھے، لوگوں نے بیقراری کا سبب سمجھکر گرہیں ڈھیلی کر دیں، حضرت عباسؓ کی کرب اور بیچینی رفع ہوئی تو آپ نے استراحت فرمایا"

مصعب بن عمیر ایک صحابی تھے، جو اسلام سے پہلے نہایت ناز و نعمت میں پلے تھے انکے والدین بیش قیمت سے بیش قیمت لباس ان کو پہناتے تھے، خدا نے انکو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے، یہ دیکھکر کہ لڑکے

---

[1] صحیح بخاری صفحہ ۸۴۴ باب المرضیٰ، [2] سیرۃ جلد اول، احد، [3] مسند دارمی صفحہ اول

نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا ہے، والدین کی محبت دفعۃً عداوت سے بدل گئی، ایک دفعہ وہ آنحضرت صلعم کی خدمت مبارک میں اس حال میں آئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا اُس پر پیوند سے ایک کپڑا سالم نہ تھا، یہ پر اثر منظر دیکھ کر آپ آبدیدہ ہو گئے[1]،

عیادت و تعزیت و غمخواری وغیرہ

بیماروں کی عیادت میں دوست، دشمن، مومن، کافر کسی کی تخصیص نہ تھی، (سنن نسائی باب التکبیر علی الجنازۃ میں ہے کان النبی صلعم احسن شیئٍ عیادۃ للمریض، آنحضرت صلعم بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے، بخاری والو داؤد وغیرہ) میں روایت ہے کہ ایک یہودی غلام مرض الموت میں بیمار ہوا تو آپ عیادت کو تشریف[2] لے گئے،

عبداللہ بن ثابت جب بیمار ہوئے اور آپ عیادت کو گئے تو ان پر غشی طاری تھی، آواز دی وہ خبر نہ ہوئے، فرمایا افسوس ابو الربیع! تم پر ہمارا زور اب نہیں چلتا، یہ سنکر عورتیں بے اختیار چیخ اٹھیں اور رونے لگیں، لوگوں نے روکا، آپ نے ارشاد فرمایا اس وقت رونے دو، مرنے کے بعد البتہ رونا نہیں چاہیے، عبداللہ بن ثابت کی لڑکی نے کہا، مجکو ان کی شہادت کی امید تھی، کیونکہ جہاد کے سب سامان تیار کر لیے تھے، آپ نے فرمایا ان کو نیت کا ثواب مل چکا[3]،

حضرت جابر بیمار ہوئے تو اگرچہ ان کا گھر فاصلہ پر تھا، پیادہ پا ان کی عیادت کو جایا کرتے[4]، ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو آپ حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر پیدل ان کی عیادت کو گئے، اُن پر غشی طاری تھی، پانی منگوا کر وضو کیا اور بچے ہوئے پانی کو اُن کے مُنھ پر چھڑکا، جابر ہوش میں آگئے، اور عرض کی یا رسول اللہ اپنا ترکہ کس کو دوں، اس پر یہ آیت اُتری،
يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ[5]،

ایک صاحب بیمار ہوئے آپ چند دفعہ ان کی عیادت کو گئے، جب انھوں نے انتقال کیا تو لوگوں نے اس خیال سے کہ اندھیری رات ہے آپ کو تکلیف ہوگی، خبر نہ کی اور دفن کر دیا، صبح کو معلوم ہوا تو آپ نے شکایت کی، اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی[6]،

---

[1] ترغیب و ترہیب جلد دوم صفحہ ۴۴ بحوالہ ترمذی و مسند ابو یعلیٰ [2] صحیح بخاری باب عیادۃ المشرک، [3] ابو داؤد باب الجنائز [4] ابو داؤد باب الجنائز
[5] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۵ ۶، تفسیر آیت مذکور [6] بخاری کتاب الجنائز

عبداللہ بن عمرو نے غزوۂ احد میں شہادت پائی تھی، اور کافروں نے اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے تھے، اُن کی لاش آنحضرت صلعم کے سامنے لاکر رکھی گئی اور اُس پر چادر ڈال دی گئی، اُن کے صاحبزادے (جابر) آئے، اور جوش محبت میں چاہا کہ کپڑا اُٹھا کر دیکھیں، حاضرین نے روکا، اُنھوں نے دوبارہ ہات بڑھایا، لوگوں نے پھر روک دیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے درد دیدری کے خیال سے حکم دیا کہ چادر اُٹھا دیجائے، چادر کا اٹھانا تھا کہ عبداللہ کی بہن بے اختیار چلا اُٹھیں، آنحضرت صلعم نے فرمایا، رونے کی بات نہیں فرشتے ان کو اپنے پروں کے سایہ میں لے گئے[1]،

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو تشریف لے گئے، اُن کو دیکھکر آپ پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے آپ کو روتا دیکھکر سب رو پڑے[2]،

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا[3]، مرگیا تو لوگوں نے آپ کو خبر نہ کی، ایک دن آپ نے اس کا حال دریافت فرمایا لوگوں نے کہا وہ انتقال کر گیا، ارشاد ہوا تم نے مجکو خبر نہ کی، لوگوں نے اُسکی تحقیر کی (یعنی وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ کو اُس کے مرنے کی خبر کیجاتی) آپ نے لوگوں سے اُسکی قبر دریافت کی اور جاکر جنازہ کی نماز پڑھی[4]،

جنازہ جاتا تو آپ کھڑے ہوجاتے، بخاری میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جنازہ جاتا ہو تو یا اُس کے ساتھ جاؤ، ورنہ کم از کم کھڑے ہوجاؤ اور اُس وقت تک کھڑے رہو کہ سامنے سے نکل جائے[5]،

اگرچہ آپ نہایت رقیق القلب اور متاثر الطبع تھے، خصوصاً اعزہ کی وفات کا آپ کو سخت صدمہ ہوتا تھا، تاہم نوحہ اور ماتم کو نہایت ناپسند فرماتے تھے، حضرت جعفر (حضرت علیؓ کے بھائی تھے) سے آپکو نہایت محبت تھی، جب ان کی شہادت کی خبر آئی تو آپ مجلس ماتم میں بیٹھے، اسی حالت میں کسی نے آکر کہا کہ جعفر کی عورتیں رو رہی ہیں، آپ نے فرمایا کہ جاکر منع کردو، وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا، لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپ نے دوبارہ منع کرا بھیجا، پھر بھی وہ باز نہ آئیں، سہ بارہ منع کرنے پر بھی جب وہ نہ مانیں تو فرمایا کہ جاکر اُنکے منھ میں خاک ڈال دو[6]،

---

[1] بخاری جنائز صفحہ ۲، [2] صحیح بخاری جنائز صفحہ ۴، ۱، [3] (بخاری باب الصلوٰۃ علی القبر میں ابوہریرہ کی روایت میں راوی نے شک کیا ہے کہ یہ مرد تھا یا عورت لیکن دوسری روایتوں میں اسکا عورت ہونا بتحقیق ذکر ہے ام محجن اسکا نام تھا)، [4] بخاری صفحہ ۱۷۸، کتاب الجنائز [5] بخاری صفحہ ۱۷۵ جلد اول کتاب الجنائز، [6] بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ

لطف طبع کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے، ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا "او، دو کان والے"[1] اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ حضرت انسؓ نہایت اطاعت شعار تھے، اور ہر وقت آنحضرت صلعم کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے، حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابو عمیر تھا، وہ کمسن تھے، اور ایک ممولا پال رکھا تھا، اتفاق سے وہ مرگیا، ابو عمیر کو بہت رنج ہوا، آپ نے ان کو غمزدہ دیکھا تو فرمایا یا ابا عُمیر ما فعل النغیر[2]، یعنی ابو عمیر! تمہارے ممولے نے یہ کیا کیا،

ایک شخص نے خدمت اقدس میں عرض کی کہ مجھکو کوئی سواری عنایت ہو، ارشاد فرمایا کہ "میں تم کو اونٹنی کا بچہ دونگا" انھوں نے کہا "یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا" آپ نے فرمایا کہ "کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو"

ایک بڑھیا خدمت اقدس میں آئی کہ حضور میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھکو جنت نصیب ہو، آپ نے فرمایا بڑھیاں جنت میں نہ جائیں گی، اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی، آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس سے کہدو کہ بڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی[3]

ایک بدوی صحابی تھے، جنکا نام زاہر تھا، وہ دیہات کی چیزیں آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے، ایک دفعہ وہ شہر میں آئے، گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ اُدھر سے گذرے، زاہر کے پیچھے سے جاکر ان کو گود میں دبا لیا، انھوں نے کہا کون ہے چھوڑ دو، مڑ کر دیکھا تو سرورِ عالم تھے، اپنی پیٹھ اور بھی آنحضرت صلعم کے سینہ سے لپٹا دی، آپ نے فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟ وہ بولے کہ یا رسول اللہ مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدیگا نقصان اُٹھائے گا، آپ نے فرمایا لیکن خدا کے نزدیک تمہارے دام زیادہ ہیں[4]،

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے، فرمایا شہد پلاؤ وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے، آپ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی، سہ بارہ آئے پھر وہی جواب ملا، چوتھی دفعہ آئے تو ارشاد فرمایا کہ خدا سچا ہے (قرآن میں ہے کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جاکر پھر شہد پلاؤ، اب کی پلایا تو شفا ہوگئی[5]، معدہ میں مادہ فاسد کثرت سے موجود تھا، جب پورا استفراغ ہوگیا تو گرانی جاتی رہی،

---

[1] شمائل ترمذی [2] صحیح بخاری [3] شمائل ترمذی [4] ایضاً [5] بخاری صفحہ ۸۴۹ باب الدواء بالعسل،

اولاد سے محبت اولاد سے نہایت محبت تھی، معمول تھا جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے، اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریاب خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں، ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے اس اثنا میں حضرت فاطمہؓ نے صاحبزادوں (حسنین علیہما السلام) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازہ پر پردے لٹکائے، آنحضرت صلعم واپس تشریف لائے تو خلاف معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے، وہ سمجھ گئیں، فوراً پردہ کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھوں سے کنگن اُتار لیے، صاحبزادے روتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیے کہ اسکے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو،

حضرت فاطمہؓ جب آپ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے، اُنکی پیشانی چومتے اور اپنی نشست سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے،

ابو قتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبوی میں حاضر تھے کہ دفعۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امامہ (آنحضرت صلعم کی نواسی تھیں) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی، جب رکوع میں جاتے تو اُنکو اُتار دیتے پھر جب کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے، اسی طرح پوری نماز ادا کی،[١]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جس قدر آپ کرتے تھے، آپکے صاحبزادے حضرت ابراہیم **عوالی** میں پرورش پاتے تھے جو مدینہ سے تین چار میل ہے، ان کے دیکھنے کے لیے مدینہ سے پیادہ جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا تھا، گھر میں جاتے، بچہ کو انا کے ہاتھ سے لے لیتے، اور منہ چومتے، پھر مدینہ کو واپس آتے،[٢]

ایک دفعہ اقرع بن حابس عرب کے ایک رئیس خدمت اقدس میں آئے، آپ حضرت امام حسین علیہ السلام کا منہ چوم رہے تھے، عرض کی کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا، ارشاد فرمایا کہ جو اوروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (یعنی خدا اس پر رحم نہیں کرتا)

---

[١] نسائی صفحہ ١٢٢ باب ادخال الصبیان فی المساجد، صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ [٢] صحیح مسلم جلد ٢ صفحہ ٢٩١۔

حسنین علیہما السلام سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ یہ میرے گلدستے ہیں، حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لیجاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا، وہ صاحبزادوں کو لاتیں، آپ اُن کو سونگھتے اور سینہ سے لپٹاتے،

(ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حسنین علیہما السلام سرخ کرتے پہنے ہوئے آئے، کمسنی کیوجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے، آپ ضبط نہ کر سکے، منبر سے اُتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا، پھر فرمایا خدا نے سچ کہا ہے اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ، فرمایا کرتے تھے حسین میرا ہے، اور میں حسین کا ہوں، خدا اُس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے،

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ دوش مبارک پر سوار تھے، کسی نے کہا کیا سواری ہاتھ آئی ہے، آپ نے فرمایا اور سوار بھی کیسا ہے[۱]؟

ایک دفعہ امام حسنؓ یا حسینؓ (راوی کو تعین یاد نہیں رہا) آپ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے، آپ نے فرمایا اوپر چڑھ آؤ، اُنھوں نے آپ کے سینہ پر قدم رکھ دیئے، آپ نے منھ چوم کر فرمایا اے خدا میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ[۲]،

ایک دفعہ آپ کہیں دعوت میں جارہے تھے امام حسین علیہ السلام راہ میں کھیل رہے تھے، آپ نے آگے بڑھکر ہاتھ پھیلا دیئے، وہ ہنستے ہوئے پاس آآکر نکل جاتے تھے، بالآخر آپ نے اُنکو پکڑ لیا، ایک ہاتھ انکی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھکر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا کہ حسین میرا ہے اور میں اُسکا ہوں[۳]،

اکثر امام حسن علیہ السلام کو گود میں لیتے اور اُن کے منھ میں منھ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا میں اس کو چاہتا ہوں اور اُسکو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے [illegible]

آپ کے داماد (حضرت زینب کے شوہر) جب بدر میں قید ہوکر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا، حضرت

---

۱ یہ تمام روایتیں ترمذی میں مذکور ہیں، اخیر حدیث کے ایک راوی کی نسبت ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کو ضعیف الحافظہ کہا ہے ۲ ادب المفرد بخاری صفحہ ۱۵ ۳ ادب المفرد بخاری صفحہ ۳۷،

زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیجدیا، یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینبؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہؓ نے انکو دیا تھا، آنحضرت صلعم نے ہار دیکھا تو بیتاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، پھر صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو یہ ہار زینب کو بھیجدوں، سب نے بسر وچشم منظور کیا،

حضرت زینبؓ کی کمسن صاحبزادی کا نام امامہ تھا، اُن سے آپ کو بہت محبت تھی، آپ نماز پڑھنے میں بھی اُنکو ساتھ رکھتے جب آپ نماز پڑھتے تو وہ دوش مبارک پر سوار ہو جاتیں، رکوع کے وقت آپ ان کو کاندھے سے اُتار دیتے پھر کھڑے ہوتے تو وہ پھر سوار ہو جاتیں، روایتوں کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہی کہ آنحضرت صلعم خود انکو کاندھوں پر بٹھا لیتے اور اُتار دیتے تھے، لیکن ابن القیم نے لکھا ہی کہ یہ عمل کثیر ہے، وہ خود سوار ہو جاتی ہوں گی اور منع نہ فرماتے ہونگے،

(آپ کی ایک نواسی حالتِ نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بلا بھیجا، آپ تشریف لے گئے تو لڑکی اسی حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی، آپ نے اُسکی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا یہ رحم ہے جسکو خدا نے اپنے بندوں کے دل میں ڈالدیا ہے،

حضرت ابراہیم کی وفات میں بھی آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا، آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمزدہ ہو رہا ہے لیکن منھ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہی، لیکن یہ محبت صرف اپنے ہی آل واولاد تک کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ عموماً بچوں سے آپ کو اُنس تھا،)

ازواج مطہرات

حضرت خدیجہؓ

سلسلۂ نسب یہ ہے، خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصیؔ، قصی پر پہنچکر انکا خاندان رسول اللہ صلعم کے خاندان سے ملجاتا ہے، آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، انکی والدہ فاطمہ بنت زائدہ تھیں، انکے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے، مکہ میں آکر سکونت اختیار کی اور بنو عبدالدار کے حلیف[1] بنے، عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا، انکے بطن سے حضرت خدیجہ پیدا ہوئیں، انکی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی، ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جسکا نام ہند[2] تھا، ابوہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی کے عقد نکاح میں آئیں ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی کہ اُس کا نام بھی ہند تھا، اسی بنا پر حضرت خدیجہ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ہند نے اول اسلام قبول کیا، آنحضرت صلعم کا مفصل حلیہ انہی کی روایت سے منقول ہے، نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علی کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے اور شہید ہوئے[3]،

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلعم کے عقد نکاح میں آئیں جس کے مفصل حالات گذر چکے آنحضرت صلعم سے چھ اولادیں ہوئیں، دو صاحبزادے کہ دونوں بچپن میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں، حضرت فاطمہ زہراؓ حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت ام کلثوم، ان سب کے حالات آگے آئیں گے،

حضرت خدیجہ کی ایک بہن ہالہ تھیں وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں،

حضرت خدیجہ سے آنحضرت صلعم کو بے انتہا محبت تھی، وہ جب عقد نکاح میں آئیں تو انکی عمر چالیس[4] برس کی تھی اور آنحضرت صلعم پچیس سالہ تھے، نکاح کے بعد وہ پچیس برس تک زندہ رہیں، ان کی زندگی تک آنحضرت صلعم نے دوسری شادی نہیں کی، حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد آپ کا معمول تھا کہ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت خدیجہؓ

---

١ طبقات ابن سعد ذکر خدیجہ کتاب النساء ٢ طبقات ابن سعد ٣ اصابہ ذکر ہند

کی ہمسایہ عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجھکو جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا، جسکی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلعم ہمیشہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اسپر آپ کو رنجیدہ کیا، لیکن آپ نے فرمایا کہ خدا نے مجکو اُن کی محبت دی ہے[1]،

ایک دفعہ اُن کے انتقال کے بعد انکی بہن ہالہؓ آنحضرت صلعم سے ملنے آئیں اور استیذان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی، آپ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت خدیجہؓ یاد آگئیں، اور آپ جھجک اُٹھے اور فرمایا کہ "ہالہ" ہونگی، حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں، ان کو نہایت رشک ہوا، بولیں کہ آپ کیا ایک بڑھیا کی یاد کیا کرتے ہیں جو مر چکیں، اور خدا نے اُن سے اچھی آپ کو بیویاں دیں، صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے، لیکن استیعاب میں ہے کہ اس کے جواب میں آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انھوں نے تصدیق کی جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انھوں نے میری مدد کی،

حضرت سودہؓ بنت زمعہ

ازواج مطہرات میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت صلعم کے عقد نکاح میں آئیں، وہ ابتدائے نبوت میں مشرف باسلام ہو چکی تھیں، اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، انکی شادی پہلے سکران بن عمرو سے ہوئی تھی، حضرت سودہؓ انھیں کے ساتھ اسلام لائیں اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرت ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ کو واپس آئیں، سکرانؓ نے کچھ دن کے بعد وفات پائی، اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا جس کا نام عبدالرحمن تھا، اُنھوں نے جنگ جلولاء میں شہادت حاصل کی،

حضرت خدیجہؓ کے انتقال سے آنحضرت صلعم نہایت پریشان و غمگین تھے، یہ حالت دیکھکر خولہ بنت حکیمؓ نے عرض کی کہ آپکو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے، آپ نے فرمایا ہاں، گھر بار، بال بچوں کا انتظام سب خدیجہؓ کے متعلق تھا، آپ کے ایماء سے وہ حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا، اَنعِم صَباحاً، پھر نکاح کا پیغام سنایا، انھوں

[1] صحیح مسلم فضائل خدیجہؓ

نے کہا ہاں محمد شریف کفو ہیں، لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو، غرض سب مراتب طے ہوگئے تو آنحضرت خود تشریف لے گئے اور سودہ کے والد نے نکاح پڑھایا[1]، چار سو درہم مہر قرار پایا، نکاح کے بعد عبداللہ بن زمعہ (حضرت سودہ کے بھائی) جو اُسوقت کافر تھے آئے، اور اُنکو یہ حال معلوم ہوا تو سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہوگیا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت شعاری پر ہمیشہ اُنکو افسوس آتا تھا،

حضرت عائشہ اور سودہ کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا، اس لیے مورخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہ کو تقدم ہے، عبداللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہ کے بعد نکاح میں آئیں،

شکل وشباہت

حضرت سودہ بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو اُنھوں نے آنحضرت صلعم سے اسی بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ اُن کو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہوگی،

آیت حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طریق پر ازواج مطہرات قضائے حاجت کے لیے صحرا کو جایا کرتی تھیں، حضرت عمر کو یہ ناگوار ہوتا تھا اس بنا پر آنحضرت صلعم کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے، لیکن ابھی انکی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہ رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے نکلیں، چونکہ انکا قد نمایاں تھا حضرت عمر نے کہا، سودہ! تمکو ہمنے پہچان لیا، اسی واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی[2]،

---

[1] طبقات میں ہے کہ رمضان سنہ ھ میں اُنکا نکاح ہوا زرقانی نے شوال بھی لکھا ہے، یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ خود حضرت خدیجہ کے وفات کے سنہ میں اختلاف ہے،

[2] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۶، آیت حجاب کے شان نزول میں سخت اختلاف ہے، ایک روایت تو یہی ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمر نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ آپ کے یہاں نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، کاش آپ انکو پردے کا حکم دے، ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم صحابہ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، حضرت عائشہ بھی شریک طعام تھیں، ایک آدمی کا ہاتھ حضرت عائشہ کے ہاتھ سے چھو گیا، رسول اللہ صلعم کو ناگوار گذرا، اسپر آیت حجاب اُتری، عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت زینب کے دعوت ولیمہ میں آیت حجاب نازل ہوئی، چنانچہ صحاح میں یہ واقعہ بتفصیل موجود ہے، حافظ ابن حجر نے ان روایتوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے متعدد اسباب تھے، جنمیں آخری سبب حضرت زینب کا واقعہ تھا اور وہی آیت کا شان نزول ہے کیونکہ خود آیت میں واقعہ کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں، (فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۲۱۹)

اخلاق و عادات آنحضرت صلعم کے اخلاق و عادات میں سخاوت و فیاضی ایک نمایاں وصف تھا، اس بنا پر صحابہ میں جس کو آپ سے جس قدر تقرب حاصل تھا اُسی قدر اسپر اس وصفِ خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا، ازواج مطہرات کو آپ کی اخلاق و عادات و فیض صحبت سے متمتع ہونیکا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا، اس لیے یہ وصف اُن میں عموماً نظر آتا ہے، حضرت سودہ اس وصف میں بہ استثنائے حضرت عائشہ سب سے ممتاز تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے انکی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے، بولا درہم، بولیں کھجور کی طرح تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں، یہ کہکر اُسی وقت سکو تقسیم کر دیا،

اطاعت اور فرماں برداری بھی ان کا خاص وصف ہے، اور اس وصف میں وہ تمام ازواج مطہرات سے ممتاز ہیں،

روایت حدیث ان کے ذریعہ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بخاری میں صرف ایک ہے، صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس، اور یحییٰ بن عبد الرحمن بن اسعد بن زرارۃ نے اُن سے روایت کی ہے،

وفات حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، واقدی کے نزدیک انھوں نے امیر معاویہ کے زمانہ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی، حافظ ابن حجر اُن کا سال وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں امام بخاری نے تاریخ میں بسند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں انتقال کیا، ذہبی نے تاریخ کبیر میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمر کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی، حضرت عمر نے ۲۳ھ میں وفات پائی ہے، اس لیے انکا زمانۂ وفات ۲۲ھ ہوگا، خمیس میں ہے کہ یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے[1]،

حضرت عائشہؓ[2]

عائشہ نام تھا، اگرچہ اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تاہم اپنے بھانجے عبد اللہ بن زبیر کے تعلق سے ام عبد اللہ کنیت کرتی تھیں، ماں کا نام زینب، اور ام رومان کنیت تھی، بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں، سلسلہ نبوی میں آنحضرت صلعم کے ساتھ نکاح ہوا، اُسوقت چھ سال کی تھیں، آنحضرت صلعم سے پہلے جبیر بن مطعم کے

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۶۲ میں یہ تفصیل مذکور ہے طبقات ابن سعد میں صرف پہلی روایت نقل کی ہے

[2] حضرت عائشہ کے حالات اور خصوصاً ان کے علمی اجتہادات کے لیے الگ مستقل تصنیف درکار ہے یہاں صرف ضروری سوانح زندگی لکھدیے گئے ہیں

صاحبزادے سے منسوب تھیں، حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آنحضرت صلعم سے نکاح کی تحریک کی، آپ نے رضامندی ظاہر کی، خولہ نے ام رومان سے کہا، انھوں نے حضرت ابوبکر سے مذکور کیا، بولے کہ جبیر بن مطعم سے وعدہ کر چکا ہوں اور میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی لیکن مطعم نے خود اس بنا پر انکار کر دیا کہ اگر حضرت عائشہ اُنکے گھر میں گئیں تو گھر میں اسلام کا قدم آجائیگا، بہرحال حضرت ابوبکر نے خولہ کے ذریعہ سے آنحضرت صلعم سے عقد کر دیا، چار سو درہم مہر قرار پایا، لیکن مسلم میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ازواج مطہرات کا مہر پانچسو درہم ہوتا تھا

نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت صلعم کا قیام ۳ سال تک رہا، سنہ ۱۳ میں آپ نے ہجرت کی تو حضرت ابوبکر ساتھ تھے، اہل و عیال کو مکہ میں چھوڑ آئے تھے جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکر نے عبداللہ بن اریقط کو بھیجا کہ ام رومان، اسماء اور عائشہ کو لے آئیں، آنحضرت صلعم نے بھی زید بن حارثہ اور ابو رافع کو حضرت فاطمہ، ام کلثوم اور حضرت سودہ وغیرہ کے لانے کے لیے روانہ فرمایا مدینہ میں آکر حضرت عائشہ سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، اشتداد مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے، صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا، اُسوقت حضرت عائشہ کی عمر ۹ سال کی تھی، سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں کہ ام رومان نے حضرت عائشہ کو آواز دی اُنکو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انھوں نے منہ دھویا، بال درست کئے، گھر میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہوئیں تو سب نے مبارکباد دی، چاشت کے وقت آنحضرت صلعم تشریف لائے، اور رسم عروسی ادا ہوئی، شوال میں نکاح ہوا تھا، اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی۔ زمانہ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا، اس بنا پر اہل عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لیے مکروہ خیال کرتے تھے، اس خیال کے مٹانے کے لیے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا،

وفات حضرت عائشہ نے آنحضرت صلعم کے ساتھ ۹ برس تک زندگی بسر کی، نو سال کی عمر میں وہ آپ کے پاس آئیں، اور جب آنحضرت صلعم نے انتقال فرمایا تو انکی عمر ۱۸ سال کی تھی، آنحضرت صلعم کے بعد حضرت عائشہ قریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں، ۵۸ھ میں وفات پائی اُسوقت انکی عمر ۶۶ سال کی تھی، وصیت کے مطابق جنۃ البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں، قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیر اور عبداللہ بن زبیر نے قبر میں اتارا، اسوقت حضرت ابوہریرہؓ

مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اس لیے انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حضرت عائشہؓ سے بہت محبت تھی، اسی محبت سے آپ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لی، اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بسر کیے، اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا ان کے متعلق احادیث و سیر میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں

علمی زندگی | حضرت عائشہؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتوے دیتی تھیں، اکابر صحابہ پر انھوں نے دقیق اعتراضات کیے ہیں، جنکو علامہ سیوطی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے، اُن سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں، جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، امام بخاری نے منفرداً اُن سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں ۶۸ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی اُن سے منقول ہے، ترمذی میں ہے کہ صحابہ کے سامنے جب کوئی مشکل سوال پیش آجاتا تھا تو اس کو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں، اُن کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہمنے اُن سے زیادہ کسی کو خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب و انساب میں ان کو کمال تھا، شعراء کے بڑے بڑے قصیدے اُن کو زبانی یاد تھے، حاکم نے مستدرک میں اور ابن سعد نے طبقات میں تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ اُن کے فضل و کمال کے دلائل و شواہد ملتے ہیں)

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں، ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا، بعثت سے پانچ برس پہلے جس وقت قریش خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں، اُن کی پہلی شادی خنیس بن حذافہ سے ہوئی، اور انہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی، خنیس نے غزوۂ بدر میں زخم کھائے، اور واپس آکر انھیں زخموں کی وجہ سے شہادت[1] پائی، خنیس نے اپنی یادگار

[1] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۷۰، عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن اصابہ میں ہے کہ غزوہ احد میں شہید ہوئے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے رقیہ کے انتقال کے بعد حضرت عثمان سے انکے نکاح کی خواہش کی تھی اور یہ مسلم ہے کہ حضرت رقیہ کا انتقال غزوۂ بدر کے بعد ہوا اور اسی وجہ سے حضرت عثمان شریک غزوۂ بدر نہ ہو سکے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خنیس نے غزوۂ بدر کے بعد وفات پائی دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمان مغموم بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عمر اُدھر سے گزرے، اور پوچھا کہ حفصہ سے نکاح کرنے ہو، اسکی عدت گزر گئی اگر خنیس نے احد میں شہادت پائی ہوتی تو ان کی عدت کا زمانہ ۳ھ ہوتا حالانکہ انکا نکاح ۳ھ میں ہوا (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۵۲ ۱۵۳)

میں حضرت حفصہ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، حضرت حفصہ کے بیوہ ہو جانے کے بعد حضرت عمر کو اُنکے نکاح کی فکر ہوئی، سو اتفاق سے اُسی زمانہ میں حضرت رقیہ کا انتقال ہو چکا تھا، اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمر نے اُنکے نکاح کی خواہش حضرت عثمان سے کی، اُنھوں نے کہا میں اس معاملہ میں غور کروں گا، حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے ذکر کیا اُنھوں نے خاموشی اختیار کی، حضرت عمر کو اُنکی بے التفاتی سے رنج ہوا، اس کے بعد خود جناب رسالت پناہ نے حضرت حفصہ سے نکاح کی خواہش کی، نکاح ہو گیا تو حضرت ابوبکر حضرت عمر سے ملے اور کہا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہ کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تمکو ناگوار گذرا، لیکن میں نے اسی بنا پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہ نے اُنکا ذکر کیا تھا، اور میں آپ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا اگر رسول اللہ نے اُنسے نکاح نہ کر لیا ہوتا تو میں اس کے لیے آمادہ تھا،[۱]

حضرت حفصہ آخر حضرت عمر کی بیٹی تھیں، اس لیے مزاج میں ذرا تیزی تھی، **صحیح بخاری** میں واقعۂ ایلاء کے متعلق خود حضرت عمر کا بیان ہے "کہ ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے، میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا، اتفاق سے میری بی بی نے مجکو مشورہ دیا، میں نے کہا تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے، بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے، حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ کو برابر کا جواب دیتی ہے، میں اٹھا اور حفصہ کے پاس آیا، میں نے کہا بیٹی! تم رسول اللہ کو جواب دیتی ہو یہانتک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں، بولیں ہاں ہم ایسا کرتے ہیں، میں نے کہا خبردار، میں تمھیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم اس کے گھمنڈ میں نہ آنا جس کے حسن نے رسول اللہ کو فریفتہ کر لیا ہے، (یعنی عائشہ)[۲]

ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہ رو رہی تھیں، آنحضرت صلعم تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی اُنھوں نے کہا مجکو حضرت حفصہ نے کہا ہے کہ تم یہودی کی بیٹی ہو" آپ نے فرمایا "تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا پیغمبر ہے، اور پیغمبر کے نکاح میں ہو، حفصہ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے"[۳]

ایک بار حضرت عائشہ اور حفصہ نے صفیہ سے کہا کہ ہم رسول اللہ کے نزدیک تم سے زیادہ معزز ہیں، ہم آپ کی بیوی بھی ہیں اور چچازاد بہن بھی" حضرت صفیہ کو ناگوار گذرا، اُنھوں نے آنحضرت صلعم سے اسکی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ "تم نے

---

[۱] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۷۷۱، [۲] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۶۸، [۳] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۳۰، [۴] ترمذی صفحہ ۷۰۴ کتاب المناقب۔

یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہو سکتی ہو، میرے شوہر محمدؐ، میرے باپ ہارون، اور میرے چچا موسیٰ ہیں"

حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ، حضرت ابوبکر اور عمرؓ کی بیٹی تھیں، جو تقریب نبوی میں دوش بدوش تھے، اس بنا پر حضرت عائشہ اور حفصہ بھی دیگر ازواج کے معاملہ میں باہم ایک تھیں، لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک و رقابت کا اظہار ہو جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ دونوں آنحضرت صلعم کے ساتھ سفر میں تھیں، رسول اللہ راتوں کو حضرت عائشہ کے اونٹ پر چلتے تھے، اور اُن سے باتیں کرتے تھے، ایک دن حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر، اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہوں تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں، حضرت عائشہ راضی ہوگئیں، آنحضرت صلعم حضرت عائشہ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہ سوار تھیں، جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہ نے آپ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جس میں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیاں لٹکا کر کہنے لگیں، خداوندا کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے[1]

وفات حضرت حفصہ نے سنہ ۴۵ھ میں جو امیر معاویہ کی خلافت کا زمانہ تھا، وفات پائی، وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبداللہ بن عمرؓ سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمرؓ نے ان کو کی تھی، کچھ جائداد بھی وقف کی، اور کچھ مال صدقہ میں دیا، مروان بن حکم نے جو اسوقت مدینہ کا گورنر تھا، نماز جنازہ پڑھائی، اور بنی حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا، یہاں سے قبر تک حضرت ابوہریرہؓ جنازے کو لے گئے، ان کے بھائی، عبداللہ، عاصم، سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمر کے لڑکوں نے قبر میں اُتارا[2]،

[1] اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ ازواج مطہرات میں اس قسم کی روایتیں صرف حضرت حفصہ و عائشہ کے متعلق مذکور ہیں، اس لیے اسکے اسباب کی تلاش کرنی چاہیے حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے ساتھ منافقین کو جو عداوت تھی وہ قابل لحاظ ہے

[2] حضرت حفصہ کے بھی سنہ وفات میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ جمادی الاول سنہ ۴۱ھ میں وفات پائی، اُسوقت ان کا سن ۵۹ سال کا تھا لیکن اگر سنہ وفات سنہ ۴۵ھ قرار دیا جائے تو انکی عمر ۶۳ سال کی ہوگی، ایک روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عثمان کی خلافت میں سنہ ۲۷ھ میں انتقال کیا یہ روایت اس بنا پر پیدا ہوگئی کہ ذہبی نے ابن مالک سے روایت کی کہ جس سال افریقہ فتح ہوا حفصہ نے اسی سال وفات پائی، اور افریقہ حضرت عثمان کی خلافت میں سنہ ۲۷ھ میں فتح ہوا لیکن یہ سخت غلطی ہے، افریقہ دو مرتبہ فتح ہوا ہے اس دوسری فتح کا فخر معاویہ بن حدیج کو حاصل ہے اور یہ فتح سنہ ۴۵ھ میں ہوئی ذہبی بن مالک نے حفصہ کا سال وفات اسی فتح کے سنہ کو قرار دیا ہے۔

زینب ام المساکینؓ

زینب نام تھا، چونکہ فقرا و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلایا کرتی تھیں اس لیے ام المساکین کی کنیت کے ساتھ مشہور ہوگئیں، آنحضرت صلعم سے پہلے عبد اللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں عبد اللہ بن جحش نے جنگ اُحد ۳ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت صلعم نے اُسی سال اُن سے نکاح کرلیا، نکاح کے بعد آنحضرت صلعم کے پاس صرف دو تین مہینے رہنے پائی تھیں کہ ان کا انتقال ہوگیا، آنحضرت صلعم کی زندگی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں، جنھوں نے وفات پائی، آنحضرت صلعم نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں وفات کے وقت انکی عمر ۳۰ سال کی تھی

حضرت ام سلمہؓ

ہند نام، ام سلمہ کنیت تھی، باپ کا نام سہیل، اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبد اللہ بن عبد الاسد کے نکاح میں آئیں۔ (جو زیادہ تر ابو سلمہ کے نام سے مشہور ہیں، اور) جو انکے چچازاد، اور رسول اللہ صلعم کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور اُن ہی کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، چنانچہ سلمہ ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا ہوئے، حبشہ سے مکہ میں آئیں، اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی، ہجرت میں انکو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہل سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کرکے مدینہ میں آئیں،

ان کے پہلے شوہر ابو سلمہ بڑے شہسوار تھے، مشہور غزوات بدر و اُحد میں شریک ہوئے، غزوۂ احد میں چند زخم کھائے جسکے صدمہ سے جانبر نہ ہوسکے، اور جمادی الثانی ۴ھ میں وفات پائی اُن کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی آنحضرت صلعم نے ۹ تکبیریں کہیں، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یا رسول اللہ آپ کو سہو تو نہیں ہوا، فرمایا یہ ہزار تکبیر کے مستحق تھے،

ابو سلمہ کی وفات کے وقت ام سلمہ حاملہ تھیں وضع حمل کے بعد جب عدت گذر گئی تو آنحضرت صلعم نے اُن سے نکاح کرنا چاہا تو انھوں نے چند عذر پیش کیے،

۱ میں سخت غیور عورت ہوں

۲۔ صاحب عیال ہوں،

۳ مہر اس سے زیادہ ہے،

آنحضرت صلعم نے ان سب زحمتوں کو گوارا کیا،

وفات | اہل سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواج مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی، لیکن ان کے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے، واقدی نے ۵۹ھ بتایا ہے، ابراہیم حربی کے نزدیک ۶۲ھ ہے، اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے، **امام بخاری** نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی، بعض روایتوں میں ہے کہ ۶۱ھ میں جب امام حسینؓ کی شہادت کی خبر آئی اُسوقت اُنکا انتقال ہوا ہے، ابن حبان نے اس روایت کی تصحیح کی ہے،

اس اختلاف روایت کی حالت میں سنہ وفات کی تعیین مشکل ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعۂ حرہ تک زندہ تھیں مسلم میں ہے کہ حارث بن عبد اللہ بن ابی ربیعہ اور عبد اللہ بن صفوان ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اُس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائے گا، یہ سوال اُسوقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکر شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا، اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا، واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا ہے اسلیے اس سے پہلے انکی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں۔

ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وصیت کی بنا پر سعید بن زید نے نماز جنازہ پڑھائی، لیکن اس روایت کے صحت میں کلام ہے، سعید بن زید نے باختلاف روایت ۵۰ھ یا ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں انتقال کیا ہے، اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اسوقت ام سلمہ زندہ تھیں، واقدی نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہ نے انکا جنازہ پڑھایا، اگر انکی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابو ہریرہؓ خلاف وصیت کیونکر جنازہ پڑھ سکتے تھے بہرحال ازواج مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہ نے وفات پائی، اور وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی،

فضل وکمال | ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ کے بعد فضل وکمال میں انھیں کا درجہ ہے ابن سعد نے طبقات میں اسکی تصریح کی ہے، روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہ کے سوا اور تمام بی بیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے، صلح حدیبیہ میں جب صحابہ کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا تو حضرت ام سلمہ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی، اور یہ انکی دانشمندی اور عقل و دہانت کی سب سے بہتر مثال ہے، یہ واقعہ صحیح بخاری میں بتفصیل موجود ہے

حضرت زینبؓ

ازواج مطہرات میں جو لی بیان حضرت عائشہ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینبؓ بھی تھیں، خود حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اب سامیتی، یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور انکو اس کا حق بھی تھا، نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت صلعم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جمال میں بھی ممتاز تھیں، آنحضرت صلعم کو بھی اُن سے نہایت محبت تھی، زہد و تورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اتہام لگایا گیا اور اُس اتہام میں خود حضرت زینب کی بہن حمنہ شریک تھیں تو آنحضرت صلعم نے اُن سے حضرت عائشہ کی اخلاقی حالت دریافت کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہدیا،

مَا عَلِمْتُ اِلَّا خَیْرًا، مجکو حضرت عائشہ کی بھلائی کے سوا کسی خیر کا علم نہیں،

حضرت عائشہؓ کو اُن کے اس صدق و اقرار حق کا خود اعتراف کرنا پڑا،

عبادت میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت صلعم نے انکو عقد میں لانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی،

ایک دفعہ آپ مہاجرین پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے، حضرت زینبؓ اس معاملہ میں کچھ بول اُٹھیں، حضرت عمرؓ نے ڈانٹا، آپ نے فرمایا ان سے درگذر کرو، یہ اواہ ہیں، (یعنی خاشع و متضرع ہیں)

نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں، اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اُنکا سالانہ نفقہ بھیجا، انھوں نے اُس پر ایک کپڑا ڈال دیا اور برزہ بنت رافع کو حکم دیا کہ میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کر دو، برزہ نے کہا آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے؟ انہوں نے کہا کپڑے کے نیچے جو کچھ ہو وہ تمہارا ہے، دیکھا تو پچاسی درہم نکلے، جب تمام مال تقسیم ہو چکا تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیہ سے فائدہ نہ اُٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اُسی سال اُنکا انتقال ہو گیا،

وفات | آنحضرت صلعم نے ازواج مطہرات سے فرمایا تھا،

اَسْرَعُکُنَّ لِحَاقًا بِیْ اَطْوَلُکُنَّ یَدًا، تم میں مجھ سے جلد وہ ملیگی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا،

یہ استعارۃً فیاضی کی طرف اشارہ تھا، لیکن ازواج مطہرات اُسکو حقیقت سمجھیں، چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں، حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشینگوئی کا مصداق ثابت ہوئیں، اور ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال کیا، کفن کا خود سامان کر لیا تھا اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو اُن میں سے ایک کو صدقہ کر دینا، چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی، حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد ازواج مطہرات سے دریافت کیا کہ کون قبر میں داخل ہوگا انھوں نے کہا وہ شخص جو ان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا، (چنانچہ اسامہ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اُتارا)

سنہ ۲۰ھ میں انتقال کیا، اور ۵۳ برس کی عمر پائی، **واقدی** نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم سے جس وقت نکاح ہوا اُس وقت ۳۵ سال کی تھیں،

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہ حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں جو قبیلہ بنی مصطلق کا سردار تھا، مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی، جو غزوۂ مریسیع میں قتل ہوا، اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، انہی لونڈیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جب مال غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن قیس بن شماس انصاری کے حصہ میں آئیں۔

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام کچھ رقم ادا کرکے آزاد ہو سکتے ہیں، اس طریقہ کو فقہاء کی اصطلاح میں کتابت کہتے ہیں اسی اصول کے موافق حضرت جویریہ مکاتبہ ہو گئیں، انکو شرط کے موافق ۹ اوقیہ سونا ادا کرنا تھا لیکن یہ رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی، وہ رسول اللہ کے پاس آئیں اور کہا یا رسول اللہ میں مسلمان کلمہ گو عورت اور جویریہ حارث کی بیٹی ہوں، جو اپنی قوم کا سردار ہے، مجھ پر جو مصیبتیں آئی ہیں وہ آپ سے مخفی نہیں، میں ثابت بن قیس کے حصے میں آئی اور نو اوقیہ سونے پر اُس سے عہد کتابت کیا، یہ رقم میرے امکان میں نہ تھی، لیکن میں نے آپ کے بھروسہ پر اس کو منظور کر لیا، اور اب آپ سے اس کا سوال کرنے کے لیے آئی ہوں، آپ نے فرمایا، تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں؟ انھوں نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا، میں یہ رقم ادا کر دیتا ہوں، اور تم سے نکاح کر لیتا ہوں، وہ راضی ہو گئیں، آپ نے ثابت بن قیس کو بلایا،

وہ بھی راضی ہوگئے، آپ نے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کرکے نکاح کرلیا، یہ خبر جا پھیلا تو لوگوں نے قبیلۂ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلاموں[1] کو اس بنا پر آزاد کردیا کہ آنحضرت صلعم نے ان لوگوں سے رشتۂ مصاہرت قائم کرلیا، آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ "جویریہ کی برکت سے سیکڑوں گھرانے آزاد کردیے گئے"

بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلعم سے خود حضرت جویریہ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور آپ نے تمام قیدیوں کو انہیں ہبہ کردیا تھا

حضرت جویریہ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئیں، اسوقت انکا سن ۶۵ برس کا تھا،

حضرت ام حبیبہؓ

رملہ نام، اور ام حبیبہ کنیت تھی آنحضرت صلعم کی بعثت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں اور عبید اللہ بن جحش سے عقد ہوگیا، آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے تو دونوں مشرف باسلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کی، ایک روایت ہے کہ انکی بیٹی حبیبہ جنکی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں، حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں، حبشہ میں جاکر عبید اللہ بن جحش نے عیسائیت قبول کرلی لیکن ام حبیبہ اسلام پر قائم رہیں، اختلاف مذہب کی بنا پر عبید اللہ بن جحش نے اُن سے علیحدگی اختیار کی، اور اب وہ وقت آگیا کہ انکو اسلام، اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین ہونے کا شرف بھی حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت صلعم نے عمرو بن امیۃ الضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا، جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہ کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعہ سے پیغام دیا، کہ آنحضرت صلعم نے مجکو تمہارے نکاح کے لیے لکھا ہے، انھوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر کیا، اور اس مژدہ کے صلہ میں ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں، جب شام ہوئی تو نجاشی نے جعفر بن ابی طالب اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کرکے خود نکاح پڑھایا[1]، اور آنحضرت صلعم کی طرف سے چار سو دینار مہر[2] ادا کیا،

---

[1] سال نکاح میں اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ ۶ھ میں نکاح ہوا لیکن بعض روایتوں میں ۷ھ بھی سال کیا گیا ہے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن الضمری کو بغرض نکاح بھیجا ہو اور ۷ھ میں نکاح پڑھا گیا ہو، اس میں بھی اختلاف ہے کہ نکاح کہاں ہوا اور کس نے پڑھایا لیکن صحیح یہ ہے کہ حبشہ میں نکاح ہوا اور نجاشی نے نکاح پڑھایا

[2] صحیح روایت یہی ہے لیکن اور بھی مختلف تعداد بیان کی گئی ہے بعض روایتوں میں دو سو دینار ہے بعضوں کے نزدیک چار ہزار دینار ہے ابوداؤد میں دینار کے بجائے چار ہزار درہم ہے زہری کی روایت میں چالیس اوقیہ کی تعداد کا ذکر ہے اس لیے اگر چاندی ہوگی تو اس کے سولہ سو درہم ہوتے ہیں۔

تمام لوگوں کے سامنے خالد بن سعید کو یہ رقم دی گئی، تو لوگوں نے بعد نکاح اُٹھنا چاہا، لیکن نجاشی نے کہا دعوت ولیمہ تمام پیغمبروں کی سنت ہے"، ابھی بیٹھنا چاہیے، چنانچہ کھانا آیا، لوگ دعوت کھا کے رخصت ہوئے، جب مہر کی رقم ام حبیبہ کو ملی، تو اُنھوں نے پچاس دینار ابرھہ کو دیے لیکن اس نے اس رقم کو اس کنگن کے ساتھ جو پہلے دیے گئے تھے یہ کہکر واپس کر دیا کہ بادشاہ نے مجھکو منع کر دیا ہے، دوسرے روز ان کی خدمت میں عود، زعفران، عنبر وغیرہ لے کر آئی، جسکو وہ اپنے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں لائیں، جب نکاح کے تمام رسومات ادا ہوگئے تو نجاشی نے ان کو شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ آنحضرت صلعم کی خدمت میں روانہ کیا،

ام حبیبہ نے ۴۴ھ میں وفات[1] پائی اور مدینہ میں دفن ہوئیں

حضرت میمونہ

میمونہ نام، باپ کا نام حارث، اور ماں کا نام ہند تھا، پہلے مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی کے نکاح میں تھیں، مسعود نے طلاق دیدی، تو ابو رہم بن عبدالعزیٰ نے نکاح کر لیا، ابو رہم کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلعم کے نکاح میں آئیں، نکاح کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا،

دوسری روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے مدینہ سے اپنے غلام ابو رافع کو اوس بن خولی کے ساتھ وکیل بنا کر بھیجا، اور انھوں نے ایجاب و قبول کیا لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عباس نے اس نکاح کی تحریک کی، اور اُنھیں نے نکاح پڑھایا،

وفات | یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مقام سرف میں ان کا نکاح ہوا تھا، اور سرف ہی میں انھوں نے انتقال بھی کیا، حضرت عبداللہ بن عباس نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا، صحاح میں ہے کہ جب ان کا جنازہ اُٹھایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا، یہ رسول اللہ صلعم کی بی بی ہیں جنازہ کو زیادہ حرکت مت دو، با ادب آہستہ لے چلو،

---

[1] بعضوں نے سال وفات ۴۲ھ لکھا ہے ابن ابی خیثمہ کے نزدیک ان کا سال وفات ۵۹ھ ہے بعض لوگوں نے ۵۰ھ اور بعضوں نے ۵۵ھ بیان کیا ہے، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دمشق میں مدفون ہوئیں

سالِ وفات کے متعلق اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اُنھوں نے سنہ ۵۰ھ میں وفات پائی،

حضرت صفیہؓ

صفیہ، اصلی نام نہ تھا، زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہو جاتا تھا، اُس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ وہ جنگ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت صلعم کے نکاح میں آئی تھیں، اس لیے صفیہ کے نام سے مشہور ہو گئیں، ورنہ اصلی نام زینب تھا، باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا، حضرت صفیہ کو باپ اور ماں دونوں کے جانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہ بنو النضیر کا سردار، اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھی، حضرت صفیہ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی، مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا، حضرت صفیہ کے باپ اور بھائی بھی کام آئے اور خود بھی گرفتار ہوئیں، جب خیبر کے تمام قیدی جمع کئے گئے تو دحیہ کلبی نے آنحضرت صلعم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آنحضرت صلعم نے انتخاب کرنے کی اجازت دی، اُنھوں نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا، لیکن ایک صحابی نے آپ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ آپ نے رئیسۂ بنو نضیر و قریظہ کو دحیہ کو دیدیا وہ تو صرف آپ کے قابل ہے، آپ نے حکم دیا کہ دحیہ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں وہ صفیہ کو لیکر آئے تو آپ نے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی اور صفیہ کو آزاد کر کے نکاح کر لیا، خیبر سے روانہ ہوئے تو مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی، اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا اس کو جمع کر کے دعوت ولیمہ فرمائی، وہاں سے روانہ ہوئے تو آپ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواج مطہرات میں داخل ہو گئیں۔

حضرت صفیہ کے ساتھ آنحضرت صلعم کو نہایت محبت تھی اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپ سفر میں تھے ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں، حضرت صفیہ کا اونٹ سوء اتفاق سے بیمار ہو گیا، حضرت زینب کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہ کو دیدو، انھوں نے کہا کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں، اس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک اُن کے پاس نہ گئے

ایک بار آپ حضرت صفیہ کے پاس تشریف لے گئے دیکھا کہ رو رہی ہیں، آپ نے رونے کی وجہ پوچھی انہوں نے کہا کہ عائشہ اور زینب کہتی ہیں کہ ہم تمام ازواج میں افضل ہیں، ہم آپ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپ کی چچازاد بہن بھی ہیں"، آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہ کہدیا کہ ہارون میرے باپ، موسیٰ میرے چچا، اور محمد میرے شوہر ہیں، اسلئے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہوسکتی ہو"؟

حضرت صفیہ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں،

اولاد

آنحضرت صلعم کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ کے چھ اولادیں تھیں، قاسم، ابراہیم، زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ، ان تمام لڑکیوں نے اسلام کا زمانہ پایا، اور ہجرت سے شرف اندوز ہوئیں، لیکن ابن اسحاق نے دو صاحبزادوں کا نام اور لیا ہے، طاہر، طیب، اس بنا پر اولاد ذکور کی تعداد لڑکیوں کے برابر ہو جاتی ہے،

اس بارہ میں تمام اقوال کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے بارہ اولاد تھی، جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، لڑکیوں کی تعداد میں کسی قسم کا اختلاف نہیں، البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، مجموعی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے جن میں قاسم اور ابراہیم پر تمام راویوں کا اتفاق ہے حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہ سے اور بقیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے[1] تھی،

حضرت قاسم

آپ کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسم پیدا ہوئے (اور غالباً نبوت سے گیارہ بارہ برس پہلے پیدا ہوئے ہوں گے) مجاہد کے نزدیک یہ صرف سات دن زندہ رہے، ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک زندہ رہے، ابن فارس نے لکھا ہے کہ سن تمیز کو پہنچ گئے تھے،

آنحضرت صلعم کی اولاد میں جس طرح یہ سب سے پہلے پیدا ہوئے تھے، اسی طرح سب سے پہلے انتقال بھی کیا، عام روایت یہ ہے کہ قبل بعثت وفات پائی،

(آنحضرت صلعم کی کنیت ابوالقاسم انہیں کے انتساب سے ہے، آپ اس کنیت کو بہت پسند فرماتے تھے، صحابہؓ بھی جب آپ کا محبت سے نام لیتے، ابوالقاسم ہی کہتے، ایک دن آپ بازار سے گذر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے یا ابا القاسم کہکر آواز دی، آپ نے مڑ کر دیکھا تو اُس نے کہا یا رسول اللہ میں اسی نام کے ایک اور شخص کو پکار رہا ہوں، رفع اشتباہ کے لیے پھر آپ نے منع فرما دیا کہ کوئی یہ کنیت رکھے،

---

[1] زرقانی صفحہ ۲۲۱

حضرت زینب

اہل سیر کا اتفاق ہے کہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں، زبیر بن بکار کا قول ہے کہ حضرت قاسم کے بعد پیدا ہوئیں، لیکن ابن کلبی کے نزدیک آنحضرت صلعم کی سب سے پہلی اولاد حضرت زینب ہی ہیں، بعثت سے دس برس پہلے جب آنحضرت صلعم کی عمر ۳۰ سال کی تھی پیدا ہوئیں،

آنحضرت صلعم نے جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو اہل و عیال مکہ میں رہ گئے تھے، حضرت زینب کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع لقیط سے ہوئی، غزوۂ بدر میں ابوالعاص گرفتار ہو گئے، جب یہ رہا کئے گئے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ مکہ جا کر حضرت زینب کو بھیج دیں گے، ابوالعاص نے مکہ جا کر اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ ان کو مدینہ کی طرف روانہ کیا، چونکہ کفار کے تعرض کا خوف تھا کنانہ نے ہتیار ساتھ لے لیے تھے، مقام ذی طویٰ میں پہنچے تو قریش کے چند آدمیون نے تعاقب کیا، ہبار بن اسود نے حضرت زینب کو نیزے سے زمین پر گرا دیا، وہ حاملہ تھیں حمل ساقط ہو گیا، کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ "اب اگر کوئی قریب آیا تو اِن تیروں کا نشانہ ہو گا"، لوگ ہٹ گئے تو ابوسفیان سرداران قریش کے ساتھ آیا، اور کہا "تیر روک لو ہمکو کچھ گفتگو کرنی ہے"، انھوں نے تیر ترکش میں ڈال دیے، ابوسفیان نے کہا "محمدؐ کے ہاتھ سے جو مصیبتیں پہنچی ہیں تمکو معلوم ہیں، اب اگر تم علانیہ انکی لڑکی کو ہمارے قبضہ سے نکال کر لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے، ہم کو زینب کے روکنے کی ضرورت نہیں، جب شور و ہنگامہ کم ہو جائے، اُسوقت چھپے چوری لے جانا"، کنانہ نے یہ رائے تسلیم کی اور چند روز کے بعد ان کو رات کے وقت لیکر روانہ ہوئے، زید بن حارثہ کو آنحضرت صلعم نے پہلے سے بھیجدیا تھا، وہ بطنِ یاجج میں تھے، کنانہ نے زینب کو اُنکے حوالے کیا، وہ انکو لیکر روانہ ہو گئے،

حضرت زینب مدینہ میں آئیں اور اپنے شوہر ابوالعاص کو حالت شرک میں چھوڑا، ابوالعاص دوبارہ ایک سریہ میں گرفتار ہوئے[۱]، اُسوقت بھی حضرت زینب نے انکو پناہ دی، مکہ جا کر انھوں نے لوگوں کی امانتیں حوالے کیں، اور اسلام

---

[۱] اصابہ میں ہے کہ ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ جمادی الاول ۶ھ میں روانہ ہوئے آنحضرت صلعم نے زید بن حارثہ کو ۱۷۰ سواروں کے ساتھ بھیجا مقام عیص میں قافلہ ملا، کچھ لوگ گرفتار کیے گئے اور مال و اسباب لوٹ میں آیا انہیں میں ابوالعاص بھی تھے، ابوالعاص آئے تو حضرت زینب نے ان کو پناہ دی اور ان کی سفارش سے آنحضرت نے انکا مال بھی واپس کرا دیا

لائے اسلام لانیکے بعد ہجرت کر کے مدینہ میں آئے، حضرت زینبؓ نے انکو حالت شرک میں چھوڑا تھا، اسلیے دونوں میں باہم تفریق ہوگئی تھی وہ مدینہ آئے تو حضرت زینب دوبارہ اُنکے نکاح میں آئیں ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ کوئی جدید نکاح نہیں ہوا لیکن دوسری روایت میں جدید نکاح کی تصریح ہے، حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کو اگرچہ اسناد کے لحاظ سے دوسری روایت پر ترجیح ہے لیکن فقہا نے دوسری روایت پر عمل کیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کی یہ تاویل کی ہے کہ نکاح جدید کے مہر اور شرائط وغیرہ میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوا ہوگا، اسلیے حضرت عبداللہ بن عباس نے اسکو نکاح اوّل سے تعبیر کیا، ورنہ بعد تفریق نکاح ثانی ضروری ہے

ابوالعاص نے حضرت زینب کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا، اور آنحضرت صلعم نے ان کے شریفانہ تعلقات کی تعریف کی، نکاح جدید کے بعد حضرت زینب بہت کم زندہ رہیں، سنہ ۷ھ یا سنہ ۶ھ میں (باختلاف روایت) ابوالعاص اسلام لائے تھے اور اس لیے سنہ ۸ھ میں حضرت زینب نے انتقال کیا، ام ایمن، حضرت سودہ بنت زمعہ، اور ام سلمہ نے غسل دیا، آنحضرت صلعم نے نماز جنازہ پڑھائی، ابوالعاص اور آنحضرت صلعم نے قبر میں اتارا،

حضرت زینبؓ نے دو اولاد چھوڑی امامہ، اور علی، علی کی نسبت ایک روایت ہے کہ بچپن میں وفات پائی، لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکہ میں شہادت پائی،

امامہ سے آنحضرت صلعم کو نہایت محبت تھی، آپ ان کو اوقات نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے، صحاح میں ہے کہ آپ ان کو کاندھے پر رکھکر نماز پڑھتے تھے، جب رکوع میں جاتے تو دست مبارک سے اتار دیتے، جب سجدہ سے سر اُٹھاتے تو پھر سوار کرا لیتے، آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے کچھ چیزیں ہدیے میں بھیجیں، جن میں ایک زریں ہار بھی تھا، امامہ ایک گوشہ میں کھیل رہی تھیں، آپ نے فرمایا، میں اسکو اپنی محبوب ترین اہل کو دونگا، ازواج نے سمجھا کہ یہ شرف حضرت عائشہ کو حاصل ہوگا، لیکن آپ نے امامہ کو بلاکر وہ ہار خود اُن کے گلے میں ڈال دیا، ابوالعاص نے حضرت زبیر بن عوام کو امامہ کے نکاح کی وصیت کی تھی، حضرت فاطمہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے حضرت علی سے انکا نکاح کر دیا، حضرت علی نے شہادت پائی تو مغیرہ کو وصیت کر گئے کہ امامہ سے نکاح کرلیں، مغیرہ نے نکاح کیا اور اُن سے ایک بچہ پیدا ہوا جسکا نام یحیی تھا، لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ امامہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، امامہ نے مغیرہ کے ہاں وفات پائی،

حضرت رقیہؓ

جرجانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے بعد ۳۳ سنہ قبل نبوت میں پیدا ہوئیں، پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی، ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی، آنحضرت صلعم کی دوسری صاحبزادی ام کلثوم کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی تھی جب آنحضرت صلعم کی بعثت ہوئی اور آپ نے دعوت اسلام کا اظہار کیا، ابولہب نے بیٹوں کو جمع کرکے کہا، "اگر تم محمدؐ کی بیٹیوں سے علحدگی اختیار نہیں کرتے تو تمہارے ساتھ میرا سونا بیٹھنا حرام ہے"، دونوں فرزندوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی، آنحضرت صلعم نے حضرت رقیہ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی،

دولابی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ انکا نکاح زمانہ جاہلیت میں ہوا، لیکن خود ایک روایت حضرت عثمانؓ سے مروی ہے، جس میں زمانہ اسلام کی تصریح ہے نکاح کے بعد حضرت عثمانؓ نے حبش کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہ بھی ساتھ گئیں، مدت تک آنحضرت صلعم کو ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوا ایک عورت نے آکر خبر دی کہ میں نے اُن دونوں کو دیکھا ہے" آنحضرت صلعم نے دعا دی، اور فرمایا کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بی بی کو لیکر ہجرت کی ہے

حبش میں حضرت رقیہ کے ایک بچہ پیدا ہوا، جسکا نام عبداللہ تھا، لیکن صرف ۶ سال زندہ رہا،

حضرت عثمانؓ حبش سے مکہ کو واپس آئے اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہ مدینہ میں آکر بیمار ہوئیں یہ غزوۂ بدر کا زمانہ تھا، حضرت عثمانؓ ان کی تیمارداری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہوسکے عین اُسی دن جس روز زید بن حارثہ نے مدینہ میں آکر فتح کا مژدہ سنایا، وفات پائی، غزوۂ بدر کی وجہ سے آنحضرت صلعم انکے جنازہ میں شریک نہ ہوسکے۔

حضرت ام کلثومؓ

اصل نام آمنہ تھا

کنیت ہی کے ساتھ مشہور ہیں، ۳ھ میں جو غزوۂ بدر کا سال تھا جب حضرت رقیہ کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ام کلثوم کے ساتھ نکاح کر لیا بخاری میں ہے کہ جب حضرت حفصہ بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا حضرت عثمانؓ نے ٹال دیا لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضرت کو یہ خبر معلوم

ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں تمکو عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتا دیتا ہوں، اور عثمانؓ کے لیے تم سے بہتر شخص ڈھونڈھتا ہوں تم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کردو، اور میں اپنی لڑکی کی شادی عثمانؓ سے کردیتا ہوں" بہرحال نکاح ہوا، اور نکاح کے بعد حضرت ام کلثومؓ ۶ برس تک حضرت عثمانؓ کے ساتھ رہیں، شعبان ۹ھ میں انتقال کیا، آنحضرتؐ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے قبر میں اتارا،

حضرت فاطمۃ الزہراءؓ

فاطمہ نام، زہراء لقب تھا، سن ولادت میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ ۱ھ بعثت میں پیدا ہوئیں، ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ابراہیم کے علاوہ آپ کی تمام اولاد قبل نبوت پیدا ہوئی، آنحضرت صلعم کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی، اس بنا پر بعضوں نے دونوں روایتوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ ۱ھ بعثت کے آغاز میں حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئی ہوں گی اور چونکہ دونوں کی مدت میں بہت کم فاصلہ ہے، اس لئے یہ اختلاف روایت ہوگیا ہوگا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ بعثت سے پانچ برس پہلے جب خانۂ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی، پیدا ہوئیں، بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت سے تقریباً ایک سال پیشتر پیدا ہوئیں،

حضرت فاطمہؓ (اگر انکا سال ولادت ۱ھ بعثت صحیح تسلیم کرلیا جائے) جب پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی ہوئیں تو ۲ھ میں آنحضرت صلعم نے حضرت علیؓ کے ساتھ نکاح کردیا، اسوقت حضرت علیؓ کا سن ۲۱ برس پانچ مہینے کا[1] تھا، حضرت فاطمہؓ سے عقد کی درخواست سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور اُن کے بعد حضرت عمرؓ نے کی تھی، لیکن آنحضرت صلعم نے کچھ جواب نہیں دیا، جب حضرت علیؓ نے خواہش کی تو آپ نے فرمایا تمہارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟ بولے، ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں، آپ نے فرمایا گھوڑا تو لڑائی کے لیے ضروری ہے، زرہ کو فروخت کر ڈالو، حضرت عثمانؓ نے ۴۸۰ درہم پر خریدی، اور حضرت علیؓ نے قیمت لاکر آنحضرت صلعم کے سامنے ڈال دی، آنحضرت صلعم نے بلالؓ کو حکم دیا کہ بازار سے

---

[1] حضرت علیؓ کے متعلق ایک روایت ہے کہ آٹھ برس کی عمر میں اسلام لائے اس کی بنا پر بعض اسی روایت کی بنا پر ہے لیکن قول راجح یہ ہے کہ وہ دس سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے اس روایت کے رو سے اسوقت ان کا سن ۲۴ سال ڈیڑھ مہینہ کا تھا

جو تشریف لائیں، عقد ہوا اور آنحضرت صلعم نے جہیز میں ایک پلنگ اور ایک بستر دیا، اصابہ میں لکھا ہے کہ آپ نے ایک چادر دو چکیاں، اور ایک مشک بھی دی، اور یہ عجب اتفاق ہے کہ یہی دو چیزیں عمر بھر انکی رفیق رہیں

نکاح کے بعد رسم عروسی کا وقت آیا تو آنحضرت صلعم نے حضرت علی سے کہا کہ ایک مکان لے لیں، چنانچہ حارثہ بن النعمان کا مکان ملا اور حضرت علی نے حضرت فاطمہ کے ساتھ اس میں قیام کیا،

آنحضرت صلعم ہمیشہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش فرماتے تھے، چنانچہ جب حضرت علی اور حضرت فاطمہ میں کبھی کبھی خانگی معاملات کے متعلق رنجش ہو جاتی تھی، تو آنحضرت دونوں میں صلح کرا دیتے تھے ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا، آپ گھر میں تشریف لے گئے اور صفائی کرا دی، گھر سے مسرور نکلے، لوگوں نے پوچھا آپ گھر میں گئے تھے تو اور حالت تھی، اب آپ اس قدر خوش کیوں ہیں؟ فرمایا میں نے ان دو شخصوں میں مصالحت کرائی ہے، جو مجھکو محبوب تر ہیں،

ایک مرتبہ حضرت علی نے ان پر کچھ سختی کی، وہ آنحضرت صلعم کے پاس شکایت لیکر چلیں، پیچھے پیچھے، حضرت علی بھی آئے حضرت فاطمہ نے شکایت کی، آپ نے فرمایا "بیٹی تمکو خود سمجھنا چاہئیے کہ کون شوہر اپنی بی بی کے پاس خاموش چلا آتا ہے" حضرت علی پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے حضرت فاطمہ سے کہا اب میں تمہارے خلاف مزاج کوئی بات نہ کروں گا"

(ایک دفعہ حضرت علی نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا، آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے، آپ نے مسجد میں خطبہ دیا اور اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی، فرمایا "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے، جس نے اُسکو دکھ پہنچایگا، مجھے بھی اذیت ہوگی، چنانچہ حضرت علی اس ارادہ سے باز آگئے، اور حضرت فاطمہ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہ کیا[۱])

حضرت فاطمہ کے پانچ اولادیں ہوئیں، حسن، حسین، محسن، ام کلثوم، زینب، محسن نے بچپن ہی میں انتقال کیا، حضرت زینب امام حسن، امام حسین علیہ السلام اور ام کلثوم اہم واقعات کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں مشہور ہیں،

حضرت فاطمہ نے رمضان سنہ ۱۱ھ میں آنحضرت صلعم کے انتقال کے ۶ ماہ[۲] بعد وفات پائی، اسوقت ان کا سن ۲۹

۱؎ صحیح بخاری ذکر اصہار النبی صلعم ۲؎ اسمیں بھی اختلاف ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد صرف ۴۰ دن زندہ رہیں بعضوں نے چار مہینہ بتایا ہے بعضوں کے نزدیک دو مہینے کے بعد انتقال ہوا کسی نے ایک مہینہ کسی نے ۳ مہینہ بعد اور بعضوں نے ۳ مہینہ ۵ دن بعد لکھا ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہ کے ذریعہ سے ۶ مہینے والی روایت مذکور ہے

سال کا تھا، سن کی تعیین میں سخت اختلاف ہے، بعضوں نے ۲۴ سال، بعضوں نے ۲۵ سال، اور بعضوں نے ۳ سال بتایا ہے لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اگر سنہ ۱۲ کو سال ولادت قرار دیا جائے، تو اس وقت انکا یہ سن نہیں ہوسکتا تھا، البتہ اگر ۲۴ سال کی عمر تسلیم کیجائے تو اس سن کو سال ولادت قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے کہ وہ پانچ برس قبل نبوت میں پیدا ہوئیں تو اس وقت انکا سن ۲۹ سال کا ہوسکتا ہے،

حضرت ابراہیم

آنحضرت صلعم کی سب سے آخری اولاد ہیں، ذی الحجہ ۸ھ میں بمقام عالیہ جہاں حضرت ماریہ قبطیہ رہتی تھیں پیدا ہوئے، اس بنا پر لوگ عالیہ کو مشربہ ابراہیم بھی کہنے لگے تھے، ابورافع کی بی بی سلمٰی نے جو آنحضرت صلعم یا آپ کی پھوپھی صفیہ کی لونڈی تھیں، دایہ گری کی خدمت انجام دی ابورافع نے جب آنحضرت صلعم کو انکی ولادت کا مژدہ سنایا تو آپ نے اس کے صلے میں ایک غلام عطا فرمایا، ساتویں دن عقیقہ ہوا، آپ نے بال کے برابر چاندی خیرات کی، اور حضرت ابراہیم کے نام پر نام رکھا، دودھ پلانے کے لئے تمام انصار نے خواہش کی، لیکن آپ نے ام بردہ خولہ بنت منذر بن زید الانصاری کے حوالہ کیا اور اُس کے معاوضے میں کھجور کے چند درخت دیئے، **بخاری** میں حضرت انس سے روایت ہے کہ آپ نے یہ خدمت ام سیف کے متعلق کی قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں، یہ تاویل کچھ مستبعد نہیں لیکن ان کے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے، اور وہ ابو سیف کی کنیت کے ساتھ مشہور نہیں،

ام سیف عوالی مدینہ میں رہتی تھیں، آنحضرت صلعم فرط محبت سے وہاں جاتے، حضرت ابراہیم کو گود میں لیتے، اور چومتے ام سیف کے شوہر لوہار تھے، اس لیے گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا، لیکن آنحضرت صلعم باوجود لطافت طبع گوارا فرماتے،

ابراہیم نے ام سیف ہی کے یہاں انتقال کیا، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی، تو عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ تشریف لائے نزع کی حالت تھی، گود میں اُٹھالیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا یا رسول اللہ آپ کی یہ حالت ہے آپ نے فرمایا یہ رحمت ہے

عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند میں گہن لگتا ہے، اتفاق سے جس روز حضرت ابراہیم نے

وفات پائی، سورج میں گہن لگ گیا تھا، عام طور پر مشہور ہو گیا کہ یہ ان کی موت کا اثر ہے، آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو فرمایا چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگتا"

چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا، آنحضرت صلعم نے خود نماز جنازہ پڑھائی، عثمان بن مظعون کی قبر کے متصل دفن ہوئے، قبر میں فضل بن عباس اور اسامہ نے اتارا، آنحضرت صلعم قبر کے کنارے کھڑے تھے، قبر پر پانی چھڑکا گیا، اور اس پر ایک امتیازی علامت قائم کی گئی،

ابو داؤد اور بیہقی کی روایت کے موافق دو مہینہ دس دن کی عمر پائی، ذیحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے، اس روایت کی بنا پر ۱۰ھ میں انتقال ہوا، واقدی کے نزدیک ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں وفات کی، اس لحاظ سے تقریباً اٹھارہ مہینے زندہ رہے، بعض روایتوں میں ہے کہ سولہ مہینے آٹھ دن کی عمر پائی، بعض لوگوں نے مدت حیات ایک برس، دس ماہ، ۸ دن لکھی ہے، لیکن صحاح میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ابراہیم ۱۸ مہینے تک زندہ رہے،

ازواج مطہرات کے ساتھ معاشرت

ازواج مطہرات کی تعداد ۹ تک پہنچی تھی، ان میں عام اصول فطرت کے موافق ہر مزاج اور ہر طبیعت کی عورتیں تھیں تاہم رشک اور منافست بھی تھی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کہ ہمیشہ فقر و فاقہ سے بسر کرتے تھے، ان کی خورش و پوشش کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا، ان تمام حالات کے ساتھ بھی آپ کی جبین خلق پر کبھی شکن نہیں پڑتی تھی،

حضرت خدیجہ کے ساتھ آپ کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقد نکاح میں آئیں تو آنحضرت صلعم کا ریعان شباب اور ان کا بڑھاپا تھا، تاہم آپ نے اُن کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی، وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آجاتا، تو آپ جوشِ محبت سے بے تاب ہوجاتے تھے، (تفصیل اوپر گزر چکی ہے)

حضرت خدیجہ کے بعد حضرت عائشہ ازواج مطہرات میں سب سے محبوب تر تھیں لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں، حسن صورت میں حضرت صفیہ ان سے بڑھ کر تھیں، اور دو تین بھی تھیں جو ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج سے کم نہ تھیں، لیکن حضرت عائشہ کی قابلیت، ذہانت، قوت اجتہاد، دقتِ نظر، وسعت معلومات، ایسے اوصاف تھے جو ان کی ترجیح کا اصلی سبب تھے،

ایک دفعہ چند ازواج مطہرات نے حضرت فاطمہ زہرا کو سفیر بنا کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں بھیجا، جناب سیدہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، دستور کے موافق پہلے اِذن طلب کیا، اجازت ملی تو سامنے آئیں، اور عرض کی کہ ازواج مطہرات نے مجھ کو وکیل بنا کر بھیجا ہے کہ آپ ابوبکر کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں" آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا جان پدر! کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں، جناب سیدہ کے لیے اتنا کافی تھا، واپس جاکر ازواج مطہرات سے کہا، میں اس معاملہ میں دخل نہ دوں گی،

اب اس خدمت (سفارت) کے لیے حضرت زینب انتخاب کی گئیں، کیونکہ ازواج میں سے حضرت زینب کو

خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہ کی ہمسری کا دعویٰ تھا، اس لیے وہی اس خدمت کے لیے زیادہ موزوں تھیں، انھوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا، اور بڑے زور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں حضرت عائشہ چپ سن رہی تھیں، اور رسول اللہ صلعم کے چہرہ کی طرف دیکھتی جاتی تھیں، حضرت زینب جب تقریر کر چکیں، تو مرضی پاکر کھڑی ہوئیں اور اس زور و شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینب لاجواب ہوکر رہ گئیں، آنحضرت صلعم نے فرمایا "کیوں نہ ہو ابوبکر کی بیٹی ہے"[1]

آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ شادی کرنے کے لیے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بنا پر ہوسکتا ہے، مال، نسب، حسن، دینداری، سو تم دیندار عورت[2] تلاش کرو، آنحضرت صلعم کو ہر کام میں سب سے مقدم جو چیز پیش نظر ہوتی تھی وہ دین ہوتا تھا، اس لیے ازواج میں بھی وہی زیادہ منظور نظر ہوتی تھیں جن سے دین کی خدمت زیادہ ادا ہوسکتی تھی ازواج مطہرات کو باریابی کا زیادہ موقع ملتا تھا، وہ خلوت و جلوت کی شریک صحبت تھیں اس لیے مذہبی احکام و مسائل کے علم و اطلاع کا بھی ان کو سب سے زیادہ موقع مل سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت تھی کہ مسائل کے سمجھنے، اور نکات شریعت کی تہ تک پہنچنے کی بھی قابلیت ہو جس میں یہ قابلیت جس قدر زیادہ ہوتی اسی قدر زیادہ تمتع اُٹھا سکتا تھا، حضرت عائشہ مجتہدانہ دل و دماغ رکھتی تھیں، اس لیے قرب صحبت سے اس قدر فائدہ اُٹھا سکیں کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں وہ اکابر صحابہ سے مخالفت کرتی تھیں اور انصاف بالائے طاعت است اکثر مسئلوں میں اُن کی فہم و دقت نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، چنانچہ اس کی کسی قدر تفصیل حضرت عائشہ کے حالات میں گزر چکی ہے

معمول تھا کہ ہر روز آپ تمام ازواج مطہرات کے گھروں میں (جو پاس پاس تھے) تشریف لیجاتے، ایک ایک کے پاس تھوڑی دیر ٹھہرتے، جب اُن کا گھر آجاتا جنکی باری ہوتی تو شب کو وہیں قیام فرماتے یہ ابوداؤد کی روایت ہے، زرقانی میں حضرت ام سلمہ کے حال میں لکھا ہے کہ عصر کا وقت ہوتا تھا اور ابتدا حضرت ام سلمہ سے

---

[1] یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بخاری اور دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے الفاظ روایت سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ دونوں فریق نے صرف تکلفی اور ایک دوسرے کی کسر شان کی تھی، جیسا کہ عام طور پر سوکنیں باہم خانگی جھگڑوں میں کرلی ہیں لیکن یہ کم نظری ہے حضرت عائشہ نے اسی ترجیح کی وجہ ثبوت دلیلیں بیان کی ہوں گی جنکا جواب سکوت کے سوا اور کچھ نہ ہوسکتا ہوگا [2] کتاب النکاح بخاری شریف

ہوتی تھی، بعض روایتوں میں ہے کہ جس کی باری ہوتی تھی اُنہی کے گھر پر تمام ازواج مطہرات آجاتی تھیں اور دیر تک صحبت رہتی تھی، کچھ رات گئے سب رخصت ہو جاتی تھیں، اس سے ظاہر ہوگا کہ گو ازواج میں کبھی کبھی منافست کا اظہار ہوتا تھا، لیکن دل صاف تھے، اور باہم ملکر لطف صحبت اُٹھاتی تھیں، آنحضرت صلعم کے شرف صحبت سے جس طرح ان آئینوں کو جلا دی تھی اس کا اندازہ **افک** کے واقعہ سے ہو سکتا ہے جسمیں جناب عائشہ کو منافقین نے متہم کیا تھا، اس سے بڑھکر حریفوں کے لیے انتقام کا کیا موقع ملسکتا تھا، لیکن باوجود اس کے کہ غیر متعلق لوگ تہمت لگانے میں آلودہ ہو گئے تاہم ازواج مطہرات کا دامن صاف رہا، حضرت عائشہ کی بڑی حریف حضرت زینب تھیں، لیکن جب رسول اللہ صلعم نے ان سے استفسار فرمایا تو انہوں نے کانوں پر ہات رکھا کہ حاشا محض تہمت ہے، حضرت عائشہ جب واقعۂ افک کا ذکر کرتی تھیں تو ہمیشہ حضرت زینب کی پاک باطنی کی شکرگزاری ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ بخاری کی متعدد روایتوں میں تفصیلاً مذکور ہے

آنحضرت صلعم جس طرح ازواج مطہرات کی خاطرداری فرماتے اور ان کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا،

ایک دفعہ ازواج مطہرات سفر میں ساتھ تھیں، ساربان، اونٹ کو تیز ہانکنے لگے، آپ نے فرمایا دیکھنا یہ آبگینے (شیشے) ہیں

حضرت صفیہ کھانا نہایت عمدہ پکاتی تھیں، ایک دن انہوں نے کھانا پکا کر آنحضرت صلعم کے پاس بھیجا، آپ اسوقت حضرت عائشہ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، حضرت عائشہ نے خادم کے ہات سے پیالہ چھین کر زمین پر دے مارا، آنحضرت صلعم نے پیالے کے ٹکڑے چُن چُن کر یکجا کئے، اور ان کو جوڑا، پھر دوسرا پیالہ منگوا کر واپس کیا،

ایک دفعہ حضرت عائشہ آنحضرت صلعم سے برہم ہو کر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آ گئے حضرت عائشہ کو پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا کہ تو رسول اللہ سے چلا کر بولتی ہے، آنحضرت صلعم بیچ میں آ گئے، اور حضرت عائشہ کے آڑے

لہ بخاری میں یہ روایت کتاب النکاح کے ذیل میں ہے لیکن ازواج کے نام نہیں نسائی میں نام کی تصریح ہے لیکن روایت میں کسی قدر اختلاف ہے۔

آگئے، حضرت ابوبکر غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے، آنحضرت صلعم نے حضرت عائشہ سے کہا کیوں! میں نے کس طرح تمکو بچا لیا۔ چند روز کے بعد حضرت ابوبکر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئے تو وہ حالت بدل چکی تھی، بولے مجکو بھی صلح میں شریک کیجیے، جیسا کہ اُس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی، آپ نے فرمایا ہاں اور ہاں[1]

ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ "تو مجھ سے جب ناراض ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں" بولیں کیونکر؟ ارشاد ہوا کہ جب تو خوش رہتی ہے (اور کسی بات پر قسم کھانی ہوتی ہے) تو یوں قسم کھاتی ہے محمدؐ کے خدا کی قسم" اور جب ناراض ہو جاتی ہے تو کہتی ہے "ابراہیم کے خدا کی قسم" حضرت عائشہ نے کہا "ہاں یا رسول اللہ میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں[2]"

حضرت عائشہ شادی کے وقت بہت کمسن تھیں اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ آنحضرت صلعم اتفاقاً آجاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں، آپ اُن کو بلا کر حضرت عائشہ کے پاس بھیجدیا کرتے تھے[3]

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں جسکو حراب کہتے ہیں اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں حبشی اس سے کھیلتے ہیں، ایک دفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا دکھا رہے تھے، حضرت عائشہ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، آنحضرت صلعم آگے کھڑے ہو گئے حضرت عائشہ دوش مبارک پر رخسارے رکھکر تماشا دیکھنے لگیں اور دیر تک دیکھتی رہیں یہانتک کہ آپ نے فرمایا کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں، بولیں نہیں آپ چپ ہو رہے یہاں تک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں

ایک دفعہ حضرت عائشہ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں، آنحضرت صلعم باہر سے تشریف لائے، گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے پر بھی تھے، آپ نے فرمایا یہ کیا ہے، بولیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے بھی پر تھے، آپ نے تبسم فرمایا[4] عوام میں مشہور ہے کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے، حضرت سلیمان نے اِس بنا پر کہ گھوڑوں کی سیر میں اُن کی نماز قضا ہو گئی تھی پر کٹوا دیئے، اُس وقت سے پر جاتے رہے لیکن نشان اب بھی باقی ہے حضرت عائشہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح [2] صحیح مسلم [3] صحیح مسلم [4] ابوداؤد کتاب الادب

ایک دفعہ آپ نے حضرت عائشہ سے کہا کہ آؤ تیز قدمی میں مقابلہ کریں حضرت عائشہ اُس وقت تک دُبلی پتلی تھیں، آگے نکل گئیں، جسم زیادہ ہوا اور بُرا اندام ہوگئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی، اب کی وہ پیچھے رہ گئیں، آپ نے فرمایا یہ اُس دن کا جواب ہے

ازواج مطہرات اور اہل وعیال کی سادہ زندگی

انسان ذات خود فاقہ کشی کرسکتا ہے، سخت سے سخت تکلیفیں اُٹھا سکتا ہے، زخارف دنیوی کو کلیۃً چھوڑ سکتا ہے لیکن وہ اپنے اعزہ واقربا، یا مخصوص عزیزترین اولاد کو اس قسم کی سادہ اور متقشفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے زاہدانہ زندگی بسر کی ہے، اُنھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اہل وعیال کے جھگڑوں سے الگ رکھا ہے، دنیا کی مذہبی تاریخ میں صرف آنحضرت صلعم کی زندگی اس کلیہ کی ایک مستثنیٰ مثال ہے، آپ کے نو بیبیاں تھیں جن میں بعض ناز ونعمت میں پلی تھیں اور اکثر معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے ان کا فطرتی میلان غذاہائے لطیف ولباس ہائے فاخرہ کی طرف ہوسکتا تھا، متعدد صغیر السن بچے تھے جنکو کھانے پینے کی ہر خوشگوار اور خوشنما چیز اپنی طرف مائل کرسکتی تھی، آنحضرت صلعم کو خیال کیا اور کے واقعات سے معلوم ہوا ہوگا اعزہ اولاد اور ازواج مطہرات کے ساتھ سخت محبت تھی، آپ نے رہبانیت کا بھی قلع قمع کردیا تھا، اور فتوحات کی کثرت مدینہ میں مال وزر کے خزانے لٹا رہی تھی، لیکن باایں ہمہ آنحضرت صلعم نے اپنی ذات کی طرح انکو بھی زخارف دنیوی کا خوگر نہیں بنایا، بلکہ ہر موقع پر روک ٹوک کی، اس بنا پر آپ کے تمام خاندان کی زندگی آپ کے اُسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بنگئی

حضرت فاطمہ آپ کی محبوب ترین اولاد تھیں لیکن انھوں نے آپ کی محبت سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اُٹھایا، ان کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ اس قدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھر کر لانے سے سینے پر گھٹے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چکٹ ہوجاتے تھے چولھے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہوجاتے تھے، لیکن باایں ہمہ جب انھوں نے آنحضرت صلعم سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لیے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ نے صاف انکار کردیا کہ یہ فقراء ومساکین کا حق ہے۔

ایک دفعہ آپ حضرت **فاطمہ** کے پاس آئے، دیکھا کہ اُنھوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر

ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں، اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے[۱]

صرف یہی نہیں کہ خود عام طریقۂ اظہار محبت کے خلاف انکو آرائش یا زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے بلکہ اس قسم کی جو چیزیں انکو دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں انکو بھی ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت علی نے ان کو سونے کا ایک ہار دیا، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا، کیوں فاطمہ! کیا لوگوں سے کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے چنانچہ حضرت فاطمہ نے اس کو فوراً بیچکر اسکی قیمت سے ایک غلام خرید لیا۔[۲]

ایک دفعہ آپ کسی غزوہ سے تشریف لائے حضرت فاطمہ نے بطور خیر مقدم کے گھر کے دروازوں پر پردہ لگایا، اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو چاندی کے کنگن پہنائے، آپ حسب معمول حضرت فاطمہ کے یہاں آئے تو اس دنیوی ساز و سامان کو دیکھکر واپس گئے، حضرت فاطمہ کو آپ کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے، بچے آپ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے، آپ نے فرمایا یہ میرے اہلبیت ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ان زخارف دنیا سے آلودہ ہوں، اس کے بدلے فاطمہ کے لیے ایک عصب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لادو۔[۳]

ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کو جو محبت تھی اس کا اظہار کبھی دنیا دارانہ طریقہ سے نہیں ہوتا تھا، چنانچہ ازواج مطہرات نے جب اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے اُن سے ایلاء کر لیا

تمام ازواج میں آپ کو حضرت عائشہ سب سے زیادہ محبوب تھیں لیکن یہ محبت رنگین لباسوں اور سنہرے زیوروں کی صورت میں کبھی نہیں ظاہر ہوئی، تمام بی بیوں کا جو لباس تھا وہی حضرت عائشہ کا بھی تھا، چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں۔

ما کان لاحدانا الا ثوب واحد (بخاری جزو اصفحہ ۴۵) ہم تمام بی بیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا

اگر کبھی اُس کے خلاف اُن کے بدن پر دنیوی آرائش کے سر و سامان نظر آتے تو آنحضرت صلعم انکو منع فرماتے، ایک مرتبہ اُنھوں نے سونے کے کنگن پہنے (مسکتہ) آپ نے فرمایا اگر ورس کے کنگن زعفران سے رنگ کر پہنیں تو بہتر ہوتا،

(تمام اہل و عیال و خانوادۂ نبوت کو ممانعت تھی کہ وہ پُر تکلف و ریشمی لباس اور سونے کے زیور استعمال کریں، آپ اُن سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کو اس کی تمنا ہے کہ یہ چیزیں حکومت میں ملیں تو دنیا میں ان کے پہننے سے پرہیز کرو۴)

[۱] ابوداؤد،
[۲] نسائی کتاب الزینہ
[۳] ایضاً
[۴] ایضاً

انتظام خانگی اگرچہ ازواجِ مطہرات کی تعداد ایک زمانہ میں ۹ تک پہنچ گئی تھی اور اس وجہ سے خانہ داری کے بہت سے جھگڑے تھے، تاہم آپ کو خود بنفس نفیس، اُن چیزوں سے سروکار نہ تھا، اپنی ذات کی نسبت تو التزام تھا کہ جو کچھ آتا، دن کے دن صرف ہو جاتا، یہاں تک کہ اگر دے دلا کر کچھ باقی رہ جاتا تو آپ اُس وقت تک گھر میں نہ جاتے، جب تک وہ بھی کارِ خیر میں صرف نہ ہو جاتا، لیکن ازواجِ مطہرات، اور مہمانوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا انتظام حضرت بلالؓ کے متعلق تھا، ابوداؤد میں عبداللہ ہوزنی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلال سے پوچھا کہ رسول اللہ صلعم کے خانگی انتظام کا کیا حال تھا؟ انھوں نے کہا آنحضرت صلعم کا تمام کاروبار میرے سپرد تھا، اور آغاز سے اخیر زمانہ وفات تک میرے ہاتھ میں رہا، معمول تھا کہ جب کوئی نادار مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو مجھکو ارشاد ہوتا، میں جا کر کہیں سے قرض لاتا، اور اُس کے کھانے کپڑے کا انتظام کر دیتا[1]

اہل و عیال کے مصارف کا انتظام ازواجِ مطہرات کے لیے یہ انتظام تھا کہ بنو نضیر کے نخلستانوں سے انکا حصہ مقرر کر دیا گیا تھا، وہ فروخت کر دیا جاتا جو سال بھر کے مصارف کے لیے کافی ہوتا[2]، خیبر فتح ہوا تو تمام ازواج کے لیے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا، وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض ازواج نے جن میں حضرت عائشہ بھی تھیں، پیداوار کے بدلے زمین[3] لے لی۔

تم المجلد الثانی من سیرۃ النبویۃ
علیٰ صاحبہا الصلوۃ والتحیۃ

کتبہ اسحاق حسن نہروی تلمیذ حضرت اعجاز رقم لکھنوی

---

[1] جلد دوم باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین، [2] بخاری صفحہ ۸۰۶ [3] بخاری کتاب المزارعہ جلد اول صفحہ ۳۱۳